کلیاتِ بلونت سنگھ

جلد دوم

تحقیق، تدوین، ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

کلیات بلونت سنگھ

(افسانے)

حصہ دوم

تحقیق، تدوین، ترتیب

جمیل اختر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔1، آر.کے. پورم، نئی دہلی۔066 110

فہرست

☆	کچھ اس کلیات کے بارے میں	جمیل اختر	ix
1-	چکوری		1
2-	پامسٹ		13
3-	پاسبان		29
4-	ہندوستاں ہمارا		41
5-	پتھر کے دیوتا		57
6-	بھیک منگے		71
7-	کسک		85
8-	ڈاکو		101
9-	موت		117
10-	اجنبی		133

-11	جھرجھری	145
-12	آزاد فاقہ	161
-13	سکوت	173
-14	روشنی	189
-15	بھیک	203
-16	منی کی موت	217
-17	بابو مانک لال جی	227
-18	سہارا	241
-19	سورما سنگھ	257
-20	عذاب	271
-21	سنہرا ولش	285
-22	تلچھٹ	301
-23	مداوا	315
-24	ہمارا مکان	333
-25	لمس	349
-26	کٹھن ڈگریا	361
-27	رقیب	377
-28	ہیپروٹ	391

کچھ اس کلیات کے بارے میں

بلونت سنگھ اپنے عہد کے اہم افسانہ نگار ہیں۔ جون 1921 میں چک بہلول ضلع گوجرانوالہ (پاکستان) میں ولادت ہوئی۔ بلونت سنگھ نے اسکول کے زمانے سے ہی لکھنا شروع کردیا تھا۔ ان کا پہلا افسانہ ''سزا'' ''ساقی'' اگست 1938 میں شائع ہوا۔ 1938 سے 1944 تک آٹھ افسانے ساقی میں شائع ہوئے۔ اگست 1938 کے بعد دوسرا افسانہ 'دیش بھگت' ساقی نومبر 1940، 'جگا' ساقی جنوری 1941، 'نینا' ساقی جولائی 1941، پردیس، ماتاہری، حوا کی پوتی کا افسانہ محبت 1943 تک شائع ہوئے۔ پہلی بار جولائی 1944 میں ان کا ایک افسانہ ''شہناز'' ادبی دنیا لاہور میں شائع ہوا۔ یہیں سے انہوں نے افسانوی دنیا میں اڑان بھرنا شروع کی۔ اس کی اپنی وجہ بھی ہے۔ 1942 میں بی اے کی ڈگری الہ آباد یونی ورسٹی سے حاصل کرنے کے بعد بلونت سنگھ کچھ دنوں کے لیے لاہور منتقل ہوگئے، جہاں انہیں مولانا صلاح الدین احمد (اڈیٹر ادبی دنیا) راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کی صحبتیں ملیں۔ ان کی ملاقاتوں نے بلونت سنگھ کے اندر ایک نئی روح پھونک دی۔ بلونت سنگھ جو ابھی تک آہستہ خرام تھے برق رفتاری سے دوڑنے لگے۔ اب تقریباً ہر دوسرے تیسرے ماہ ان کا ایک افسانہ ادبی دنیا میں شائع ہونے لگا اور پھر بلونت سنگھ تواتر سے لکھنے لگے اور مختلف ادبی رسائل میں چھپنے لگے۔ ''ساقی'' میں ان

کے کل دس افسانے اور دو ڈرامے، ''قلوپطرہ کی موت'' اور ''مرغی'' شائع ہوئے۔ 'ادبی دنیا' میں سات افسانے اور ایک ڈراما ''سنگ زن'' شائع ہوئے۔ ''ساقی'' اور ''ادبی دنیا'' کے بعد ان کی کہانیاں ہمایوں لاہور، آج کل دلی، نقوش لاہور اور فسانہ میں شائع ہوئیں— کچھ کہانیاں مسیحی دنیا، سہیل، نئی دنیا، تیج و یکلی میں بھی شائع ہوئیں۔ لیکن ان کا ابھی تک کوئی صحیح سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ایک کہانی ''ڈنڈ'' تیج ویکلی میں شائع ہوئی ہے جو ہندی میں ہے۔ ہندی میں ان کی کہانیاں آج کل دلی، جاگرتی، ہنس، مایا، منوہر کہانیاں اور اردو ساہتیہ الٰہ آباد میں شائع ہوئیں۔

لیکن رسائل کی مکمل فائل کسی ایک لائبریری میں نہیں ملنے کی وجہ سے تمام کہانیوں کی دریافت یا تلاش ممکن نہیں ہوسکی۔ دوسرے، وسائل کی کمی بھی کہانیوں کی تلاش میں مانع رہی۔ سرکاری اداروں میں اشتہار پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے اور تحقیق کے لیے وسائل محدود کر دیے جاتے ہیں جس سے معیاری تحقیق کا عمل پورا نہیں ہوپاتا اور آدھا ادھورا جو بھی محدود وسائل میں دستیاب ہو پاتا ہے اسے غنیمت جان کر اتنے ہی پر اکتفا کرنا پڑتا ہے۔

اس پروجیکٹ میں بھی دشواریاں رہیں۔ شروع میں جب میں نے اس پر کام کرنے کا ارادہ کیا تھا تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ پہاڑ کاٹ کر دودھ کی نہر نکالنی ہوگی لیکن ہوا کچھ ایسا ہی۔ بلونت سنگھ کی تخلیقات کی تلاش کا سفر کانٹوں بھرا رہا۔ دہلی کے تمام اہم کتب خانے بلونت سنگھ کی کتابوں سے محروم ہیں۔ دلی یونی ورسٹی، جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دلّی پبلک لائبریری، ساہتیہ اکیڈمی، دلی اردو اکادمی اور لوگوں کے ذاتی کتب خانے، کہیں بھی بلونت سنگھ کی تمام کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ایک دو کتابیں ہی ہیں۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری، پٹنہ کی خدا کی بخش لائبریری جو تحقیق کا بڑا گڑھ سمجھی جاتی ہیں وہاں سے بھی چند کتابیں ہی دستیاب ہوسکیں۔ الٰہ آباد یونی ورسٹی کی لائبریری بھی اپنے محبوب فکشن نگار کے سرمایے سے محروم ہے۔ وہاں سے تلاش کے بعد بھی کچھ دستیاب نہ ہوسکا۔ ان کے چھ افسانوی مجموعوں میں سے تین خدا بخش لائبریری پٹنہ سے، ایک آزاد لائبریری علی گڑھ سے، ایک ساہتیہ اکیڈمی دلّی سے اور ایک

بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ (الہ آباد) سے دستیاب ہوا۔ اس طرح بہ ہزار دقت یہ منزل طے ہوئی۔ میں نے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اتنی دشواریاں اس راہ میں پیش آئیں گی اور اس پر بھی جب تحقیق کے لیے ہندوستان کی اہم لائبریریوں کا دورہ کرنے کے لیے کوئی وسیلہ بھی نہ ہو۔ گھر بیٹھے تحقیق کے جاں کاہ مراحل کو انجام دینا ناممکن ہے۔ اس میں تکمل جہاں کبھی نہیں ملتا۔

اس پر بھی بات صرف افسانوی مجموعوں کی تلاش تک ہی محدود ہو تو کسی حد تک بات بن بھی جاتی۔ لیکن معاملہ اگر اس سے بھی آگے کا ہو تو مشکل کی دیواریں حائل ہو جاتی ہیں۔ اپنے ذاتی وسائل کا استعمال ضروری ہوجاتا ہے۔ میں نے کلیات کی تدوین میں یہ امر ملحوظ رکھا ہے کہ افسانوی مجموعوں کو ہی کسی بھی فکشن نگار کی کل پونجی تصور نہیں کیا جائے بلکہ رسائل کی دنیائے بے پایاں میں غوطہ زن ہو کر گوہر آب دار تلاش کیا جائے اور فکشن نگار کی موجود پونجی میں اضافہ کر کے کلیات کے معنی و مفہوم کو مکمل کیا جائے۔ اس عمل میں نہ صرف دشواریاں ہزار ہیں بلکہ "انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا"

تحقیق و تلاش کا کیڑا جب تک انگ انگ کو نہ ڈسے اور جذبۂ صادق خون کی رگوں میں موجزن نہ ہو اس دشوار گذار عمل کا تصور محال ہے اور میں جب اس طرح کے کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرتا ہوں تو پھر اس سے پورے طور پر عہدہ برآ ہونا چاہتا ہوں۔ لیکن ایک حقیر انسان کی بساط میں یہ کہاں۔ یہ تو محض سمندر سے چند مشکیزہ پانی نکالنے کے مترادف ہے۔ میں نے محدود وسائل کے باوجود اپنی بساط بھر پوری دیانت داری کے ساتھ تحقیقی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ یہاں تک کہ علی گڑھ اور الہ آباد کا سفر بھی اس پروجیکٹ کے سلسلے میں ذاتی مصارف سے کیا۔ تقریباً ایک ہفتے تک الہ آباد میں رہا۔ بلونت سنگھ کی بیوی منجو سنگھ سے ملا۔ منجو سنگھ الہ آباد کے ایک کالج میں ہندی کی لکچرر ہیں۔ بے حد ملنسار، خلیق، متین اور سنجیدہ خاتون ہیں۔ اگرچہ وہ اردو نہیں جانتیں پھر بھی انہوں نے جہاں تک ممکن ہوسکا ہے بلونت سنگھ کی تمام

چیزیں بہت سنبھال کر رکھی ہیں۔ ادبی مزاج نہیں ہونے کی وجہ سے وہ بلونت سنگھ کی جمع پونجی کو اردو اور ہندی والوں سے نہ کیش کرا سکیں اور نہ ہی اپنے شوہر کی ادبی تشہیر کا کوئی سامان کرسکیں۔ بلونت سنگھ کے بیٹے اور بیٹی میں بھی باپ کی وراثت کو سنبھالنے کا ہنر نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ سبھی بے حد خلیق ہیں، شگفتہ مزاج ہیں مہمان نواز ہیں۔ منجو سنگھ بے حد معاون ثابت ہوئیں انہوں نے جو کچھ بھی ان کے پاس تھا سبھی میرے سامنے لاکر رکھ دیا۔ اس میں سے جو چیز میرے کام کی تھی میں نے الگ کر لی اس طرح ان سے بہت سی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ رسائل میں چھپے ہوئے چند افسانوں کی کٹنگ۔ اس کے علاوہ اردو اور ہندی کتابوں کی مکمل فہرست ان سے حاصل ہوئی۔ الٰہ آباد کے کچھ احباب نے بھی بھرپور تعاون کیا اور نئی معلومات فراہم ہوئیں۔ اس طرح الٰہ آباد کا سفر بہت کامیاب رہا اور پروجیکٹ کے لیے بے حد مفید ثابت ہوا۔ علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری میں کئی ماہ تک رسائل کے ذخیرے سے تلاش و جستجو کا عمل جاری رہا جس کے نتیجے میں بہت سی نئی چیزیں دستیاب ہوئیں۔ اس کے باوجود بھی بہت سی چیزیں وسائل کی کمی کی وجہ سے معلومات ہونے کے باوجود مجھ سے دور رہیں یا دستیاب ہونے سے رہ گئیں۔ جو چیزیں معلومات ہونے کے باوجود دستیاب نہیں ہوسکیں ہیں اس کی فہرست آگے آئے گی۔ اور نئے دستیاب شدہ افسانوں، ڈراموں اور مضامین کی فہرست بھی دی جائے گی تاکہ تحقیقی کامیابی کی داستان بھی بیان ہوسکے۔

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اتنی ہی دشواریوں اور مشکلات کے بعد رسائل کے کرم خوردہ، دیمک زدہ اور گرد آلود فائلوں سے تھپکیاں دے دے کر کوئی کہانی نکلتی ہے۔ آج کے سائنٹفک دور میں مواصلاتی انقلاب کے باوجود اردو میں تحقیق کے ٹولس وضع نہیں کیے جاسکے ہیں۔ جس کی وجہ سے تحقیق کی راہ میں صدہا دشواریاں جو پہلے تھیں وہ آج بھی موجود ہیں۔

اس لیے اردو کا محقق، تحقیق کے تمام تقاضوں سے کما حقہ عہد برآ نہیں ہوسکتا۔ اردو میں معیاری تحقیق کا فقدان ہوتا جارہا ہے اسے محقق کی مجبوری بھی کہہ سکتے ہیں جس کا بخوبی اندازہ ادھر تحقیق کے سلسلے میں مجھے بھی ہو رہا ہے۔ بعض اوقات بڑی بے بسی محسوس ہوتی ہے۔ تحقیق کے لیے جو سہولت فراہم ہونی چاہیے وہ نہیں مل پاتی اور تحقیق کا سفر نامکمل رہ جاتا ہے۔ مکمل جہاں تو مجھے بھی نہیں مل پایا اس کی وجہ وسائل کی کمی تھی جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ چلیے یہ عمل آدھا ادھورا ہی سہی پورا تو ہوا اور بلونت سنگھ کی تخلیقات کے ذخیرے میں اس تحقیقی کاوش کے نتیجے میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوا بلکہ انکساری سے کہا جائے تو ایک حقیر سا اضافہ ہوا۔

بلونت سنگھ کے کلیات کو مرتب کرنے کا خیال میرے دل میں کئی وجہوں سے پیدا ہوا جس میں سب سے بڑی وجہ اس عظیم افسانہ نگار کو ناقدوں کے ذریعے نظر انداز کیا جانا تھا۔ اردو اور ہندی میں ملا کر تین درجن سے زیادہ کتابوں کا مصنف اور بقول اوپندر ناتھ اشک تقریباً ''تین سو کہانیوں کا خالق'' ہونے کے باوجود ان کے انتقال کے بعد اخبارات میں اس کے موت کی خبر نمایاں طور پر شائع نہیں ہوئی اور جب ارتھی اٹھی تو اردو، ہندی کے ادیبوں میں سے کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ کیسی دردناکی تھی۔ نہ ہی کسی رسالے نے اس کے شایانِ شان کوئی نمبر ہی شائع کیا۔ سوائے چند ایک کے۔ مضامین لکھنے والے لوگوں کی بھی بے حد کمی رہی زیادہ تر مضامین رسائل نے ایک دوسرے سے نقل کیے۔ شاید کسی ناقد نے لکھنے کی حامی نہیں بھری۔ یہ نا انصافی اور دردناکی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور یہیں سے یہ خیال پختہ تر ہوا کہ پرانی پیڑھی نے جو کیا سو کیا۔ میں نئی پیڑھی سے ان کو متعارف کراؤں تاکہ اس ناانصافی کی تلافی ہوسکے۔ یہ سوچ کر قدم آگے بڑھایا۔ ہزارہا دشواریوں کے باوجود میں اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوسکا ہوں۔ نئی نسل اب اس کلیات کا مطالعہ کرے گی اور تنقید کی نئی عینک لگا کر پڑھے گی تاکہ بلونت سنگھ کو انصاف مل سکے

اور ادب میں ان کے مقام و مرتبے کے تعین قدر میں آسانی ہو اس سے شاید بلونت سنگھ کی روح اطمینان کی سانس لے سکے گی اور ادب تخلیق کرنے پر جو شرمندگی اسے ہو رہی تھی وہ شاید ختم ہوجائے۔

دوسرے میرے ذریعے کی گئی تحقیق کے نتیجے میں بلونت سنگھ کے موجود سرمائے میں جو کچھ بھی اضافہ ہوا ہے اس سے بھی تنقید کے نئے باب وا ہوں گے۔ ان کے افسانوں کے حوالے سے جو تنقید اب تک ہوچکی ہے شاید اس سوچ میں بھی کوئی تبدیلی واقع ہو۔ اس لیے کہ اب تک جو تنقید ہوئی تھی وہ آدھے افسانوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی تھی۔ اب پونجی دوگنی ہو گئی ہے۔

اردو میں بلونت سنگھ کے افسانوی مجموعے صرف چھ ہیں:

1- جگا— مکتبہ اردو لاہور، پہلی اشاعت اپریل 1944
2- تار و پود— مکتبہ جدید لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ لیکن گمان غالب ہے کہ یہ کتاب 1945 کے اواخر یا 1946 کے اوائل میں شائع ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانے جولائی 1945 تک کے ہیں۔
3- ہندوستان ہمارا— سنگم پبلی شنگ ہاؤس، الٰہ آباد سے جون 1947 میں پہلی بار شائع ہوا۔
4- سنہرا دیس— اس میں بھی سن اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 1945 اور 1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں اور اندازہ یہی ہے کہ یہ کتاب 1950 کے دہے میں شائع ہوئی ہوگی۔
5- پہلا پتھر— مکتبہ جدید لاہور، دسمبر 1953
6- بلونت سنگھ کے افسانے— مکتبہ اردو لاہور، سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں چند افسانے نئے اور بقیہ پرانے ہیں۔

ان مجموعوں کے علاوہ تین اور مجموعوں کا نام ملتا ہے۔ ''شیرازہ''، ''اجلے پھول'' اور

''پنجاب کی کہانیاں'' لیکن ان مجموعوں کا کہیں سراغ نہیں مل سکا۔
اب ذرا ان چھ مجموعوں میں شامل کہانیوں پر بھی تفصیلی نظر ڈالیے:

1- جگا

(1) جگا (2) پردیسن (3) نینا (4) سزا (5) ماتا ہری (6) دیش بھگت
(7) حوا کی پوتی کا افسانہ محبت (8) قلوپطرہ کی موت (ڈراما)
(9) مرغی (ڈراما) (10) پیامبر (ڈراما)

2- تار و پود

(1) سمجھوتہ (2) گرہستی (3) دیمک (4) کسبی (5) مہمان (6) شہناز
(7) خود دار (8) کمپوزیشن ٹیچر (9) جنگل میں منگل (10) اس کی بیوی
(11) بیمار (12) خلا (13) پنجاب کا البیلا (14) تین باتیں۔

3- ہندوستان ہمارا

(1) ہندوستان ہمارا (2) پتھر کے دیوتا (3) بھیک منگے (4) کسک
(5) ڈاکو (6) موت (7) اجنبی (8) جھرجھری (9) آزاد فاقہ
(10) سکوت (11) روشنی (12) بھیک۔

4- سنہرا دیش

(1) چکوری (2) منّی کی موت (3) بابو مانک لال جی (4) رنگ (5) سہارا
(6) سورما سنگھ (7) عذاب (8) سنہرا دیش (9) تلچھٹ (10) مداوا
(11) ہمارا مکان (12) لمس (13) کٹھن ڈگریا (14) رقیب (15) پیپرویٹ۔

5- پہلا پتھر

(1) بازگشت (2) نہال چند (3) کلی کی فریاد (4) تین چور (5) بابو مہنگا سنگھ

(6) آشیانہ (7) کالے کوس (8) لمحے (9) وجئے 38 (10) تعمیر
(11) ایک معمولی لڑکی (ناولٹ) (12) اعتراف (13) پہلا پتھر۔

6- بلونت سنگھ کے افسانے

(1) جگا (2) کٹھن ڈگریا (3) کرنیل سنگھ (4) خوشبودار موڑ (5) گھر کا راستہ
(6) پنجاب کا البیلا (7) شکریہ (8) گن ہل پر رم جھم۔

ان افسانوں میں جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا کو چھوڑ کر باقی سب افسانے نئے ہیں۔

اب ذرا ان کے ہندی افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ہندی میں ان کے افسانوی مجموعے دس ہیں:

1- پنجاب کی کہانیاں (منتخب افسانے) اونکار شردھر پرکاش، الٰہ آباد، 1954
(1) دلڈ (2) جگا (3) چور (4) گرنتھی (5) البیلے (6) کچھ چھن (7) تین باتیں
(8) کالی تیتری (9) پہلا پتھر (10) وجئے 38

2- چلمن، راج کمل پرکاش، نئی دہلی 1970
(1) پرتی دھونی (2) شوبنہ (3) مہمان (4) منّی کی موت (5) سوا بھیمان
(6) بابو مانک لال جی (7) اس کی پتنی (8) وجئے 38 (9) کسک
(10) بہو (11) چلمن

3- پہلا پتھر۔ لوک بھارتی پرکاش، الٰہ آباد، 1971
(1) پہلا پتھر (2) چکوری (3) میں ضرور روؤں گی (4) ہیپر ویٹ (5) کچھ چھن
(6) تین باتیں (7) دیشیا (8) تعویذ (9) نہال چند (10) اپر سچت
(11) بابا مہنگا سنگھ (12) سورما سنگھ۔

4- میری پریہ کہانیاں، راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی۔ 1971
(1) اندھیرا اجالا (2) تین باتیں (3) رنگ (4) سوا بھیمان (5) دیمک

(6) کلی کی فریاد (7) تین دیویاں (8) بنواس (9) زندگی کا خوبصورت موڑ
(10) تیسرا سگریٹ (11) کالی تیتری

5- دیوتا کا جنم۔ لوک بھارتی پرکاشن، الٰہ آباد 1977
(1) دیوتا کا جنم (2) گمراہ (3) گلیاں (4) باندھ (5) گھات (6) دوسرا ہنی مون
(7) زلف کی داستان (8) بھکاری (9) پورا جوان (10) رکھوالا
(11) چاند اور کمند (12) پیلا پھاٹک (13) تری کون (14) جنازہ (15) شرط۔

6- پرتی ندھی کہانیاں۔ راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1977
(1) گرہستی (2) پہلا پتھر (3) کچھ چھن (4) تین باتیں (5) مورا سنگھ
(6) شہناز (7) دیمک (8) کالی تیتری (9) شرط (10) سزا (11) جگا۔

7- بن باس تتھا انیہ کہانیاں۔ پرتبھا پرکاشن، الٰہ آباد، 1978
(1) بن باس (2) ڈاکو باگر سنگھ (3) دو بہنیں (4) قبرستان کی حسینہ
(5) گوری چلی سسرال (6) پٹھان (7) رشتہ (8) ٹکسال والا (9) جھرنا
(10) بدائی (11) راہی (12) کیا کریں دونوں (13) لاٹری زندہ باد
(14) تتلیاں

8- ایلی ایلی۔ راج کمل پرکاشن، دہلی 1982
(1) ایک بات (2) گھر کا راستہ (3) تین پتر (4) چیتنا (5) ست رنگا کبوتر
(6) کنیادان (7) گن مل پر رم جھم (8) حسن والے (9) شکریہ (10) تنتر
(11) پیلاں (12) گرہستی (13) چندر لوک (14) ترپتی (15) گرینڈ ہوٹل

9- میری تینتیس کہانیاں: آتما رام اینڈ سنز، دہلی 6، 1988
(1) شکریہ (2) جگا (3) ایک ہی ناؤ پر (4) دنڈ (5) دوسری بھول (6) مہمان
(7) رقیب (8) اس کی چٹھی (9) شام کے دھندلکے میں (10) پیپرویٹ
(11) شہناز (12) سنہرا دیس (13) نہال چند (14) شرط (15) چندر لوک

(6) آشیانہ (7) کالے کوس (8) لمحے (9) ویلے 38 (10) تعمیر
(11) ایک معمولی لڑکی (ناولٹ) (12) اعتراف (13) پہلا پتھر۔

6- بلونت سنگھ کے افسانے

(1) جگا (2) کٹھن ڈگریا (3) کرنیل سنگھ (4) خوشبودار موڑ (5) گھر کا راستہ
(6) پنجاب کا البیلا (7) شکریہ (8) گن تل پر رم جھم۔

ان افسانوں میں جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا کو چھوڑ کر باقی سب افسانے نئے ہیں۔

اب ذرا ان کے ہندی افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ ہندی میں ان کے افسانوی مجموعے دس ہیں:

1- پنجاب کی کہانیاں (منتخب افسانے) اونکار شردھر پرکاشن، الہ آباد، 1954
(1) ڈنڈ (2) جگا (3) چور (4) گرنتھی (5) البیلے (6) کچھ چھن (7) تین باتیں
(8) کالی تیتری (9) پہلا پتھر (10) ویلے 38

2- چلمن، راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1970
(1) پرتی دھونی (2) شوینہ (3) مہمان (4) منّی کی موت (5) سوا بھیمان
(6) بابو مانک لال جی (7) اس کی پتنی (8) ویلے 38 (9) کسک
(10) بہو (11) چلمن

3- پہلا پتھر۔لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد، 1971
(1) پہلا پتھر (2) چکوری (3) میں ضرور روؤں گی (4) پیپرویٹ (5) کچھ چھن
(6) تین باتیں (7) ویشیا (8) تعویز (9) نہال چند (10) اپریچت
(11) بابا مہنگا سنگھ (12) سورما سنگھ۔

4- میری پریہ کہانیاں ۔ راج پال اینڈ سنز، نئی دہلی۔ 1971
(1) اندھیرا اجالا (2) تین باتیں (3) رنگ (4) سوا بھیمان (5) دیمک

(6) کلی کی فریاد (7) تین دیویاں (8) بخواس (9) زندگی کا خوبصورت موڑ
(10) تیسرا سگریٹ (11) کالی تیتری

5- دیوتا کا جنم۔ لوک بھارتی پرکاشن، الہ آباد 1977
(1) دیوتا کا جنم (2) گمراہ (3) گلیاں (4) باندھ (5) گھات (6) دوسرا ہنی مون
(7) زلف کی داستان (8) پھلکاری (9) پورا جوان (10) رکھوالا
(11) چاند اور کمند (12) پیلا پھاٹک (13) تری کون (14) جنازہ (15) شرط۔

6- پرتی ندھی کہانیاں۔ راج کمل پرکاشن، نئی دہلی 1977
(1) گرنتھی (2) پہلا پتھر (3) کچھ چھن (4) تین باتیں (5) مور ما سنگھ
(6) شہناز (7) دیمک (8) کالی تیتری (9) شرط (10) سزا (11) جگا۔

7- بن باس تتھا انیہ کہانیاں۔ پرتیبھا پرکاشن، الہ آباد، 1978
(1) بن باس (2) ڈاکو باگر سنگھ (3) دو بہنیں (4) قبرستان کی حسینہ
(5) گوری چلی سسرال (6) پٹھان (7) رشتہ (8) ٹکسال والا (9) جھرنا
(10) بدائی (11) راہی (12) کیا کریں دونوں (13) لاٹری زندہ باد
(14) تتلیاں

8- ایلی ایلی۔ راج کمل پرکاشن، دہلی 1982
(1) ایک بات (2) گھر کا راستہ (3) تین پتر (4) چیتنا (5) ست رنگا کبوتر
(6) کنیادان (7) گن مل پر رم جھم (8) حسن والے (9) شکریہ (10) تنتر
(11) پیلاں (12) گرنتھی (13) چندر لوک (14) ترپتی (15) گرینڈ ہوٹل

9- میری تینتیس کہانیاں: آتما رام اینڈ سنز، دہلی 6، 1988
(1) شکریہ (2) جگا (3) ایک ہی ناؤ پر (4) دنڈ (5) دوسری بھول (6) مہمان
(7) رقیب (8) اس کی پتنی (9) شام کے دھندلکے میں (10) پیپر ویٹ
(11) شہناز (12) سنہرا دیس (13) نہال چند (14) شرط (15) چندر لوک

(16) چوبیس سال بعد (17) اڑان (18) چیتا (19) سن جن پر رم جھم
(20) پیلاں (21) تیغ (22) اوراس (23) دیدار (24) کول سنگھ کی پریمیکا
(25) دل ناداں (26) بھیگی آنکھیں (27) پر تیچے (28) مکھن سنگھ کا اپہرن
(29) تین دیویاں (30) بچن کور (31) پھلکاری (32) آگے کے دو دانت
(33) اندھیرا اجالا۔

10۔ میں ضرور روؤں گی۔ راجیو پرکاش، الہ آباد، سال اشاعت درج نہیں ہے۔
(1) شام کے دھند لکے میں (2) دوسری بھول (3) شہناز (4) چکوری
(5) پیپر ویٹ (6) ویشیا (7) رقیب (8) میں ضرور روؤں گی (9) کسک
(10) پرتی دھونی (11) ایک ہی ناؤ پر (12) بابا مہنگا سنگھ (13) کشن ڈگریا

ہندی میں پہلا افسانوی مجموعہ 1954 میں شائع ہوا وہ بھی صرف پنجاب کی کہانیوں کا انتخاب۔ دوسرا افسانوی مجموعہ سولہ برس بعد 1970 میں شائع ہوا۔ اتنے لمبے خلا کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جبکہ اردو میں آخری افسانوی مجموعہ پہلا پتھر 1953 میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندی مجموعہ آیا ہے۔ اور بلونت سنگھ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں تواتر سے لکھ رہے تھے۔ ہندی میں ان کے ناول 1961 سے 1986 تک یعنی ان کے انتقال کے سال تک لگاتار شائع ہوتے رہے ہیں اور اردو میں افسانے بھی 1983 تک پابندی سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو میں ناول صرف تین شائع ہوئے اور ہندی میں 24 ۔ اس سے یہ تو اندازہ لگایا ہی جاسکتا ہے کہ انہوں نے اردو کے مقابلے ہندی میں شائع کرنے کو زیادہ ترجیح دی۔ اس کی وجہ شاید اردو میں گھٹتے قاری اور مندا بازار ہو جبکہ ہندی میں قاری اور مالی منفعت دونوں ہی تھا۔

ہندی اور اردو کے تمام افسانوی مجموعے اور ناول ان کی حیات میں شائع ہوئے۔

ہندی افسانوی مجموعوں میں کہانیوں کی تکرار بہت ہے۔ تکرار کے ساتھ کل 132 کہانیاں ہوتی ہیں۔ تکرار کی نفی کر کے کل 100 کہانیاں ہوتی ہے۔ بارہ نئی کہانیاں

ہیں جو ان مجموعوں میں شامل نہیں ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

(1) تا حیات (2) آنند کارج (3) ڈاکٹر پاپڑ سنگھ (4) بادام رنگیں (5) تلچھٹ
(6) بھیگی پلکیں (7) چار استاد (8) جیجا جی (9) سمجھوتہ (10) زن گذراں
(11) اس رات کی بات (12) ننھا چھچھکو

ان کو شامل کر کے ہندی میں کل 112 کہانیاں ہوتی ہیں۔

اردو مجموعوں میں شامل کہانیاں 65 ہیں اور نئی دریافت شدہ کہانیاں 67 ہیں۔ اس طرح کل 132 کہانیاں شمار ہوتی ہیں۔ ہندی اور اردو کی کل ملا کر 112+132=244 کہانیاں ہوتی ہیں جو اب تک میری نظروں کے سامنے آ سکی ہیں۔ اردو کی 132 کہانیوں میں سے تقریباً آدھا سے زیادہ ہندی مجموعوں میں جوں کی توں شامل کر لی گئی ہیں۔ یعنی چند کہانیوں کے صرف عنوانات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بقیہ کہانیوں کے عنوان ہندی اور اردو میں ایک ہی ہیں۔

وہ کہانیاں جو دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں

	اردو کہانی	ہندی کہانی
1	آبشار	جھرنا
2	آنند کارج	آنند کارج
3	ایک ہی ناؤ میں	ایک ہی ناؤ پر
4	اس کی بیوی	اس کی پتنی
5	البیلا	البیلے
6	اجنبی	آپرچت
7	ارداس	ارداس

(16) چونیس سال بعد (17) اڑان (18) چیتا (19) گن ہں پر رم جھم
(20) پیلاں (21) تیج (22) ارداس (23) دیدار (24) کول سنگھ کی پریمیکا
(25) دل ناداں (26) بھیگی آنکھیں (27) پرچھے (28) مکھن سنگھ کا اپہرن
(29) تین دیویاں (30) پھمن کور (31) پھلکاری (32) آگے کے دو دانت
(33) اندھیرا اجالا۔

10۔ میں ضرور روؤں گی۔ راجیو پرکاشن، الٰہ آباد، سال اشاعت درج نہیں ہے۔
(1) شام کے دھندلکے میں (2) دوسری بھول (3) شہباز (4) چکوری
(5) بیپر ویٹ (6) ویشیا (7) رقیب (8) میں ضرور روؤں گی (9) کسک
(10) پرتی دھونی (11) ایک ہی ناؤ پر (12) بابا مہنگا سنگھ (13) کٹھن ڈگریا

ہندی میں پہلا افسانوی مجموعہ 1954 میں شائع ہوا وہ بھی صرف پنجاب کی کہانیوں کا انتخاب۔ دوسرا افسانوی مجموعہ سولہ برس بعد 1970 میں شائع ہوا۔ اتنے لمبے خلا کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ جبکہ اردو میں آخری افسانوی مجموعہ پہلا پتھر 1953 میں شائع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد ہندی مجموعہ آیا ہے۔ اور بلونت سنگھ ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں تواتر سے لکھ رہے تھے۔ ہندی میں ان کے ناول 1961 سے 1986 تک یعنی ان کے انتقال کے سال تک لگاتار شائع ہوتے رہے ہیں اور اردو میں افسانے بھی 1983 تک پابندی سے شائع ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اردو میں ناول صرف تین شائع ہوئے اور ہندی میں 24۔ اس سے یہ تو اندازہ لگایا ہی جا سکتا ہے کہ انہوں نے اردو کے مقابلے ہندی میں شائع کرنے کو زیادہ ترجیح دی۔ اس کی وجہ شاید اردو میں گھٹتے قاری اور مندا بازار ہو جبکہ ہندی میں قاری اور مالی منفعت دونوں ہی تھا۔

ہندی اور اردو کے تمام افسانوی مجموعے اور ناول ان کی حیات میں شائع ہوئے۔
ہندی افسانوی مجموعوں میں کہانیوں کی تکرار بہت ہے۔ تکرار کے ساتھ کل 132 کہانیاں ہوتی ہیں۔ تکرار کی نفی کر کے کل 100 کہانیاں ہوتی ہے۔ بارہ نئی کہانیاں

ہیں جو ان مجموعوں میں شامل نہیں ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں:

(1) تا حیات (2) آنند کارج (3) ڈاکٹر پاپڑ سنگھ (4) بادام رنگیں (5) تلچھٹ
(6) بھیگی پلکیں (7) چار استاد (8) جیجا جی (9) سمجھوتہ (10) زن گذراں
(11) اس رات کی بات (12) ننھا منھکو

ان کو شامل کر کے ہندی میں کل 112 کہانیاں ہوتی ہیں۔

اردو مجموعوں میں شامل کہانیاں 65 ہیں اور نئی دریافت شدہ کہانیاں 67 ہیں۔ اس طرح کل 132 کہانیاں شمار ہوتی ہیں۔ ہندی اور اردو کی کل ملا کر 112+132=244 کہانیاں ہوتی ہیں جو اب تک میری نظروں کے سامنے آسکی ہیں۔ اردو کی 132 کہانیوں میں سے تقریباً آدھا سے زیادہ ہندی مجموعوں میں جوں کی توں شامل کر لی گئی ہیں۔ یعنی چند کہانیوں کے صرف عنوانات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ بقیہ کہانیوں کے عنوان ہندی اور اردو میں ایک ہی ہیں۔

وہ کہانیاں جو دونوں زبانوں میں شائع ہوئیں

	اردو کہانی	ہندی کہانی
1	آبشار	جھرنا
2	آنند کارج	آنند کارج
3	ایک ہی ناؤ میں	ایک ہی ناؤ پر
4	اس کی بیوی	اس کی پتنی
5	البیلا	البیلے
6	اجنبی	آپرچت
7	ارداس	ارداس

8	باندھ	باندھ
9	بابو مانک لعل جی	بابو مانک لعل
10	بابا مہنگا سنگھ	بابا مہنگا سنگھ
11	بھیگی آنکھیں	بھیگی آنکھیں
12	پہلا پتھر	پہلا پتھر
13	پورا جوان	پورا جوان
14	پھلکاری	پھلکاری
15	پھمن کور	پھمن کور
16	پیپر ویٹ	پیپر ویٹ
17	پیلا پھاٹک	پیلا پھاٹک
18	تلچھٹ	تلچھٹ
19	تین باتیں	تین باتیں
20	تیسرا سگریٹ	تیسرا سگریٹ
21	تین دیویاں	تین دیویاں
22	تعویذ	تعویذ
23	تین خط	تین پتر
24	تکون	تری کون
25	جگا	جگا
26	چکوری	چکوری
27	چلمن	چلمن
28	چاند اور کمند	چاند اور کمند
29	چار استاد	چار استاد

30	چیتا	چیتا
31	حسن والے	حسن والے
32	دیمک	دیمک
33	دوسری غلطی	دوسری بھول
34	دوسرا ہنی مون	دوسرا ہنی مون
35	ڈاکو باگڑ سنگھ	ڈاکو باگڑ سنگھ
36	دیدار	دیدار
37	رنگ	رنگ
38	رشتہ	رشتہ
39	رخصتی	بدائی
40	رقیب	رقیب
41	زلف کی داستان	زلف کی داستان
42	زن گذراں	زن گذراں
43	سزا	سزا
44	سمجھوتہ	سمجھوتہ
45	سنہرا دیش	سنہرا دیش
46	سورما سنگھ	سورما سنگھ
47	شہناز	شہناز
48	شکریہ	شکریہ
49	شرط	شرط
50	کلی کی فریاد	کلی کی فریاد
51	کالی تیتری	کالی تیتری

52	کومل سنگھ کی محبوبہ	کومل سنگھ کی پریمکا
53	کسک	کسک
54	گلیاں	گلیاں
55	گھر کا راستہ	گھر کا راستہ
56	گن ہل پر رم جھم	گن ہل پر رم جھم
57	گرہستی	گرہستی
58	گمراہ	گمراہ
59	گوری چلی سسرال	گوری چلی سسرال
60	منّی کی موت	منّی کی موت
61	مہمان	مہمان
62	مکھن سنگھ کا اغوا	مکھن سنگھ کا اپہرن
63	نہال چند	نہال چند
64	ویہلے 38	ویہلے 38

اسی طرح ہندی کی تقریباً 50 کہانیاں ایسی ہیں جو اردو میں نہیں ہیں۔ اور وہ صرف ہندی میں ہی لکھی گئی ہیں۔

آگے کے دو دانت، ایک بات، اندھیرا اجالا، اڑان، اس رات کی بات، بہو، بنواس، بھیگی پلکیں، بادام رنگیں، پرتی دھونی، پیلاں، پٹھان، پرتیچے، ترپتی، تنز، تتلیاں، تا حیات، تیج، ٹکسال والا، جنازہ، جیجا جی، چندر لوک، چالیس سال بعد، چور، دیوتا کا جنم، دو بہنیں، دل ناداں، دنڈ، ڈاکٹر پاڑ سنگھ، رکھوالا، راہی، زندگی کا خوبصورت موڑ، سوا بھیمان، ست رنگا کبوتر، شونیہ، شام کے

دھندلکے میں، قبرستان کی حسینہ، کنیا دان، کچھ چھن، کیا کریں
دونوں، گھات، گرینڈ ہوٹل، لاٹری زندہ باد، میں ضرور روؤں گی،
ننھا چھچھکو، ویشا۔

اس طرح اردو میں بھی 75 کہانیاں ایسی ہیں جو صرف اردو میں لکھی گئی ہیں۔ اور ہندی میں نہیں ہیں۔

آشیانہ، آزاد فاقہ، آبگینہ، ایڈیٹر لوگ، اعتراف، اللہ کا فضل، ایک بھیگی شام، ایک رات، اس حمام میں، بھیک، بازگشت، بیمار، بھک منگے، بھول بھلیاں، بیڈمنٹن کی چڑیا، بات ایک رات کی، بادلوں کی چھاؤں تلے، پھانس، پنجاب کا البیلا، پتھر کے دیوتا، پردیسن، پامسٹ، پودے، پردیسی چاند، پاسبان، تین چور، تعمیر، تیاگ، ٹارزن، جزیرے، جنگل میں منگل، جھرجھری، چالان، چار سو برس پہلے، حوا کی پوتی کا افسانہ، حد فاصل، خوددار، خلا، خوشبودار موڑ، خدا کی وصیت، دیش بھکت، دودھ بھری گلیاں، ڈاکو، دل بلبل، دانت ایک بات ایک، دستک، راستہ چلتی عورت، روشنی، سکوت، سہارا، سکہ زن، سنگ انداز، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی ٹکیا، صبح شام آرزو، عذاب، فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی، کسبی، کمپوزیشن ٹیچر، کالے کوس، کٹھن ڈگریا، کاتے، لمس، لمحے، لٹکتی شامیں، مداوا، نا تاہری، موت، نینا، ناگ پھنی، واپسی۔

لیکن یہ بھی ایک بڑا تحقیقی معاملہ ہے۔ اردو ہندی کی تمام کہانیوں کی چھان پھٹک کر کے ہی اس سلسلے میں کوئی حتمی رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ سرسری جائزے یا ذاتی تاثر کی بنیاد پر کوئی ٹھوس رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ اس طرف اشارے کا مقصد

صرف اتنا ہے کہ کہانیوں کے بارے میں کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ اور اردو، ہندی کے پچڑے میں پڑ کر بھی محقق اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ اردو میں دستیاب کہانیوں کو ہی اردو کی میراث سمجھے اور ہندی میں موجود کہانیاں ہی ہندی کی کہلائیں۔ ترجمہ کر کے دونوں کے سرمایے میں نقب زنی کرتے وقت بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں زبان کی اصل پونجی کیا ہے۔ اور درآمد شدہ پونجی کیا ہے۔ ناقد بھی فن کا تجزیہ کرتے وقت کہانی کے بریکٹ میں (اردو) اور (ہندی) ضرور لکھیں تا کہ قاری کا ذہن صاف رہے اور وہ کسی مخمصے میں گرفتار نہ ہو۔

اب رہی بات اشک صاحب کے قول کی بقول اشک صاحب بلونت سنگھ 300 سے زائد کہانیوں کے خالق ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حتمی بات نہ ہو بلکہ صرف اندازہ ہو۔ اگر اس اندازے کو تھوڑی دیر کے لیے سچ مان بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ 244 کہانیاں تحقیقی جانفشانی کی اس جاں کاہ مہم میں میرے سامنے سرنگوں ہو تو گئیں۔ اور وہ جن کا وجود عام اردو قاری کے لیے پردۂ خفا میں ہے (اگر ایسا ہے) اگر وہ دستیاب ہوئیں تو یہ تعداد مکمل بھی ہوسکتی ہے۔ ورنہ اشک صاحب کی بات کو صرف اندازہ ہی تصور کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں بچی ہوئی کہانیاں اردو میں اب کم ہی ہوں گی۔ ہندی میں زیادہ ہونے کا گمان اغلب ہے۔ اس لیے کہ اس ذخیرے کی چھان پھٹک ابھی میں نے کی نہیں ہے۔

اب پھر رجوع کرتے ہیں اردو مجموعوں کی طرف

''ہندوستان ہمارا'' کو چھوڑ کر بلونت سنگھ کے باقی تمام افسانوی مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ ''ہندوستان ہمارا'' الٰہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ تمام مجموعوں کے اشاعت دوم کی نوبت نہیں آئی۔ قاری نے بھی نہ جانے کیوں ایسی بے رخی برتی کہ بلونت سنگھ یا تو بد دل ہوگئے یا انہوں نے اس جانب خود توجہ نہیں دی۔ اور صرف ہندی میں کتابیں چھپوانے میں مشغول رہے۔ کیونکہ تقسیم کے کچھ دنوں بعد اردو کی زبوں حالی کو

دیکھتے ہوئے انہوں نے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اردو میں برائے نام لکھتے تھے۔ اس لیے اردو مجموعوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی میں اردو سے تین گنی کتابیں ہیں۔

چونکہ ان کی کتابوں کے ایک سے زیادہ اڈیشن شائع نہیں ہوئے اور تمام اڈیشن بلونت سنگھ کی حیات میں ان کی نگرانی میں شائع ہوئے اس لیے پہلے اڈیشن کے متن میں کسی بھی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا گیا ہے جو افسانے ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور رسائل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت بھی اصل کی ہے۔ بنیادی متن کے طور پر حاصل افسانے کو ہی اصل مان لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا کوئی دوسرا متن اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔

کلیات کی تدوین میں تقویم کا خیال رکھا گیا ہے۔ تاریخی ترتیب میں افسانوی مجموعوں کی مکمل ترتیب باقی نہیں رہی۔ بیچ بیچ میں نئے افسانوں کی شمولیت بھی تاریخی ترتیب میں ہوئی۔ پہلی جلد میں 'جگا' اور 'تارو پود' کے افسانوں کے علاوہ ساقی اور ادبی دنیا میں 1945 تک شائع افسانے جو دستیاب ہو سکے ہیں وہ شامل کیے گئے ہیں۔ ایک افسانہ ''رنگ''، ادبی دنیا نومبر 1945 میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجموعہ سنہرا دیش میں شامل ہے۔ لیکن تاریخی ترتیب میں یہ افسانہ پہلی جلد میں جگہ بنا پایا۔ اس جلد میں ایک افسانہ 'خدا کی وصیت' نیا ہے۔ یہ ادبی دنیا جون 1945 میں شائع ہوا تھا۔

سن اشاعت کے لحاظ سے ترتیب اس لیے کہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے یہی طریق کار زیادہ سائنٹیفک ہے۔ کسی بھی فن کار یا تخلیق کار کے فکری اور فنی ارتقا کو سمجھنے میں یہ تاریخی سیڑھی بے حد معاون ہوتی ہے۔ لیکن میرے لیے ایک دشواری اور تھی۔ تمام افسانوں کی سنہ اشاعت یا سن تخلیق مجھے دستیاب نہیں ہوسکی۔ ایسی صورت میں جو تاریخی ترتیب میں نے تیار کی اس میں جن افسانوں کی سنہ اشاعت ماہ وار معلوم نہیں ہوسکی اس

صرف اتنا ہے کہ کہانیوں کے بارے میں کوئی الجھن باقی نہ رہے۔ اور اردو، ہندی کے چکڑے میں پڑ کر بھی محقق اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع نہ کرے۔ بلکہ اردو میں دستیاب کہانیوں کو ہی اردو کی میراث سمجھے اور ہندی میں موجود کہانیاں ہی ہندی کی کہلائیں۔ ترجمہ کر کے دونوں کے سرمایے میں نقب زنی کرتے وقت بھی یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ دونوں زبان کی اصل پونجی کیا ہے۔ اور درآمد شدہ پونجی کیا ہے۔ ناقد بھی فن کا تجزیہ کرتے وقت کہانی کے بریکٹ میں (اردو) اور (ہندی) ضرور لکھیں تاکہ قاری کا ذہن صاف رہے اور وہ کسی مخمصے میں گرفتار نہ ہو۔

اب رہی بات اشک صاحب کے قول کی بقول اشک صاحب بلونت سنگھ 300 سے زائد کہانیوں کے خالق ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ حتمی بات نہ ہو بلکہ صرف اندازہ ہو۔ اگر اس اندازے کو تھوڑی دیر کے لیے سچ مان بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں۔ 244 کہانیاں تحقیقی جانفشانی کی اس جاں کاہ مہم میں میرے سامنے سرنگوں ہو تو گئیں۔ اور وہ جن کا وجود عام اردو قاری کے لیے پردۂ خفا میں ہے (اگر ایسا ہے) اگر وہ دستیاب ہوئیں تو یہ تعداد مکمل بھی ہوسکتی ہے۔ ورنہ اشک صاحب کی بات کو صرف اندازہ ہی تصور کرنا پڑے گا۔ میرے خیال میں بچی ہوئی کہانیاں اردو میں اب کم ہی ہوں گی۔ ہندی میں زیادہ ہونے کا گمان اغلب ہے۔ اس لیے کہ اس ذخیرے کی چھان پھٹک ابھی میں نے کی نہیں ہے۔

اب پھر رجوع کرتے ہیں اردو مجموعوں کی طرف

''ہندوستان ہمارا'' کو چھوڑ کر بلونت سنگھ کے باقی تمام افسانوی مجموعے پاکستان میں شائع ہوئے ہیں۔ ''ہندوستان ہمارا'' الٰہ آباد سے شائع ہوا ہے ۔ تمام مجموعوں کے اشاعت دوم کی نوبت نہیں آئی۔ قاری نے بھی نہ جانے کیوں ایسی بے رخی برتی کہ بلونت سنگھ یا تو بد دل ہوگئے یا انہوں نے اس جانب خود توجہ نہیں دی۔ اور صرف ہندی میں کتابیں چھپوانے میں مشغول رہے۔ کیونکہ تقسیم کے کچھ دنوں بعد اردو کی زبوں حالی کو

دیکھتے ہوئے انہوں نے ہندی میں لکھنا شروع کر دیا تھا۔ اردو میں برائے نام لکھتے تھے۔ اس لیے اردو مجموعوں کی اشاعت کی طرف توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندی میں اردو سے تین گنی کتابیں ہیں۔

چونکہ ان کی کتابوں کے ایک سے زیادہ اڈیشن شائع نہیں ہوئے اور تمام اڈیشن بلونت سنگھ کی حیات میں ان کی نگرانی میں شائع ہوئے اس لیے پہلے اڈیشن کے متن میں کسی بھی قسم کے ہیر پھیر کی گنجائش کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا کلیات کی تدوین میں اس کو ہی بنیادی نسخہ مانا گیا ہے جو افسانے ان کے کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں اور رسائل سے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت بھی اصل کی ہے۔ بنیادی متن کے طور پر حاصل افسانے کو ہی اصل مان لیا گیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا کوئی دوسرا متن اور کہیں دستیاب نہیں ہے۔

کلیات کی تدوین میں تقویم کا خیال رکھا گیا ہے۔ تاریخی ترتیب میں افسانوی مجموعوں کی مکمل ترتیب باقی نہیں رہی۔ بیچ بیچ میں نئے افسانوں کی شمولیت بھی تاریخی ترتیب میں ہوئی۔ پہلی جلد میں 'جگا' اور 'تارو پود' کے افسانوں کے علاوہ ساقی اور ادبی دنیا میں 1945 تک شائع افسانے جو دستیاب ہو سکے ہیں وہ شامل کیے گئے ہیں۔ ایک افسانہ ''رنگ''، ادبی دنیا نومبر 1945 میں شائع ہوا تھا۔ یہ افسانہ مجموعہ سنہرا دیش میں شامل ہے ۔ لیکن تاریخی ترتیب میں یہ افسانہ پہلی جلد میں جگہ بنا پایا۔ اس جلد میں ایک افسانہ 'خدا کی وصیت' نیا ہے۔ یہ ادبی دنیا جون 1945 میں شائع ہوا تھا۔

سن اشاعت کے لحاظ سے ترتیب اس لیے کہ تحقیقی اور تنقیدی نقطۂ نظر سے یہی طریق کار زیادہ سائنٹیفک ہے۔ کسی بھی فن کار یا تخلیق کار کے فکری اور فنی ارتقا کو سمجھنے میں یہ تاریخی سیڑھی بے حد معاون ہوتی ہے۔ لیکن میرے لیے ایک دشواری اور تھی۔ تمام افسانوں کی سنہ اشاعت یا سن تخلیق مجھے دستیاب نہیں ہوسکی۔ ایسی صورت میں جو تاریخی ترتیب میں نے تیار کی اس میں جن افسانوں کی سنہ اشاعت ماہ وار معلوم نہیں ہوسکی اس

کے ہیے میں نے یہ طریق کار اپنایا ہے کہ جس مجموعہ میں یہ افسانہ شامل ہے اس کی سنہ اشاعت کو ہی اس کی درمیانی تاریخ مان لی۔ اگرچہ اس میں مشکلات پیش آئیں۔ لیکن اور کوئی دوسری صورت سمجھ سے باہر تھی۔ مثلاً 'جگا' 1944 میں شائع ہوا۔ جگا میں شامل افسانے 1938 تا 1944 تک ہیں۔ لیکن 'تار و پود' کی سال اشاعت ہی معلوم نہیں۔ اس میں 1944 تا1945 سن کے افسانے شامل ہیں۔ لہٰذا اس کی سنہ اشاعت بھی میں نے 1945 متعین کی ہے۔ اس لیے کہ اس میں 1945 کے بعد کے افسانے نہیں ہیں۔ سنہرا دیش میں بھی سال اشاعت درج نہیں ہے۔ اس میں بھی 1945 تا1946 اور اس کے بعد کی کہانیاں شامل ہیں۔ 1947 میں 'ہندوستان ہمارا' شائع ہوا۔ اس میں شامل کہانیاں بھی ظاہر سی بات ہے کہ 1947 تک کی ہی ہوں گی اور یہ مجموعہ 'سنہرا دیش' یقیناً 'ہندوستان ہمارا' کے بعد آیا ہوگا۔ حالات کا تجزیہ اور موجود شواہد تو یہی کہتے ہیں۔ اس لیے 1945 کے اواخر میں 'تار و پود' کے شائع ہونے کا امکان اغلب ہے۔ ایسی صورت میں 'سنہرا دیش' 1947 کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔ چاہے وہ تاریخ 1950 ہو یا 1951 ہو۔ جب تک کوئی اور تحقیقی شواہد نہیں ملتے۔ انہی تاریخوں پر یقین کرنا ہماری تحقیقی مجبوری ہے۔ لہٰذا انہی سنہ اشاعت کے لحاظ سے کلیات کی ترتیب عمل میں آئی ہے اور نئے افسانے اپنی تاریخی ترتیب میں ان کے درمیان ہی جگہ پا سکے ہیں۔

نئے حاصل شدہ افسانے جون 1945 سے لے کر 1980 تک کے ہیں۔ افسانوی مجموعہ 'جگا' (1944) کے بعد ان کا افسانوی مجموعہ سنہرا دیش ہے جو 1950 کے لگ بھگ آیا ہے۔ اس زمانے کے بھی کئی افسانے اور ڈرامے ان مجموعوں میں شامل نہیں ہو سکے۔ بعد میں ایک انتخاب ''بلونت سنگھ کے افسانے'' کے نام سے شائع ہوا۔ جس میں تین پرانے افسانے 'جگا، کٹھن ڈگریا اور پنجاب کا البیلا' کو چھوڑ کر باقی سبھی افسانے نئے ہیں اور امید قوی ہے کہ یہ مجموعہ 1980 کے دہے میں آیا ہے۔ اس لیے کہ اس میں شامل افسانہ اگست 1969 سے مارچ 1979 تک کا ہے۔ بلونت سنگھ کا انتقال

1986 میں ہوا۔ لہٰذا یہ مجموعہ ان کی زندگی میں ہی شائع ہوا ہے۔ لیکن افسوس کہ اسے بھی کسی ہندوستانی پبلشر نے نہیں شائع کیا بلکہ اسے بھی مکتبہ اردو ادب لاہور جو بلونت سنگھ کی کتابوں کے پبلشر رہے ہیں انہوں نے شائع کیا ہے۔ بلونت سنگھ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''جگا'' کو چھوڑ کر کسی بھی مجموعے میں کوئی دیباچہ، پیش لفظ، مقدمہ، حرف گفتار نہیں ہے جس سے کہ اس کے عالم وجود میں آنے کا پتہ چل سکے۔ مجموعوں کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ناشر نے اپنی صوابدید سے جو کچھ اسے میسر آیا لے کر شائع کر دیا ہے۔ ممکن ہے بلونت سنگھ سے اجازت بھی لی ہو۔

بلونت سنگھ پر اب تک میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق ہندوستان میں تین تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں۔ ایک دلّی یونی ورسٹی میں اور دوسرا جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اور تیسرا کلکتہ یونی ورسٹی میں۔ ممتاز آراء اور شاہدہ مفتی دونوں خاتون کو پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی تفویض ہوگئی۔ ممتاز آرا کا مقالہ 'بلونت سنگھ — فن اور شخصیت' کتابی صورت میں شائع بھی ہوگیا اور شاہدہ مفتی کے مقالے کا بیشتر حصہ سہ ماہی جامعہ کے بلونت سنگھ نمبر اور کتاب نما کے گوشۂ بلونت سنگھ میں شائع ہو چکا ہے۔ کتاب ابھی شائع نہیں ہوئی ہے۔ ان دونوں طالبات کی بھی مناسب رہنمائی نہیں کی گئی جس سے بلونت سنگھ کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکا اور نہ ہی تحقیق کے تقاضے پورے ہوئے۔ آدھی ادھوری معلومات کی بنیاد پر مقالے تیار کرائے گئے اور ڈگری تفویض کر دی گئی۔ کسی نے بھی نئے افسانوں کی تلاش کا جوکھم نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ کتابوں کی سنہ اشاعت کے متعلق بھی مستند معلومات حاصل نہیں کی۔ شاہدہ مفتی نے بھی جامعہ کے خاص نمبر اکتوبر تا دسمبر 2001 میں کتابوں کی فہرست تو دی ہے لیکن وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ دوسرے کسی بھی کتاب کی تاریخ اشاعت اور پبلیشر کا نام درج نہیں کیا ہے۔ نہ ہی یہ واضح کیا ہے کہ کون سا افسانوی مجموعہ ہے اور کون سا ناول، ہندی فہرست میں یہ خلط ملط خاص طور پر ہے۔ یعنی یہ فہرست بھی تحقیقی تقاضوں سے عاری ہے۔ شاہدہ مفتی نے بلونت سنگھ کے

گیارہ نمائندہ افسانوں کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے جس میں 'چاند اور کمند' اور 'پورا جوان' نئی کہانی ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی سنجیدہ کوشش بلونت کے بارے میں ہمیں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے یہاں دیکھنے کو ملتی ہے۔ نارنگ چونکہ تحقیق کے مرد میداں ہیں اور اس سلسلے میں ان کی رائے کو وقار و اعتبار حاصل ہے۔ وہ جب بھی کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو تحقیقی تقاضوں سے مکمل طور پر عہدہ برآ ہونے کی سعی کرتے ہیں اور اس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

'بلونت سنگھ کے بہترین افسانے' کے نام سے اکیس افسانوں کا ایک بہت ہی جامع انتخاب انہوں نے کیا جس کا پہلا اڈیشن 1995 میں ساہتیہ اکیڈمی سے شائع ہوا۔ یہ کتاب اردو، ہندی اور انگریزی تین زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں انہوں نے ستر صفحے کا بسیط عالمانہ مقدمہ لکھا اور بلونت سنگھ کو نئے سرے سے ڈسکورس کیا۔ ان کی کہانیوں پر بالتفصیل گفتگو کی۔ ان کی دریافت نے بلونت سنگھ کی تفہیم کے نئے دروازے کھول دیئے۔ یہ کتاب ایک ایسے وقت میں آئی جب اردو والے بلونت سنگھ کو بھول چکے تھے۔ نارنگ کی سعی خاص طور سے توجہ دلانے پر آجکل، کتاب نما اور سوغات نے بلونت سنگھ پر خاص نمبر اور گوشے نکالے۔ جیسا کہ انہوں نے تحریر کیا ہے۔

نارنگ نے تمام مجموعوں سے بہترین کہانیاں منتخب کیں۔ اس عمل میں تین نئی کہانی بھی دریافت کی۔ 'راستہ چلتی عورت'، 'کالی تیتری' اور 'گمراہ'— گویا اٹھارہ کہانی مجموعوں سے اور تین رسائل سے لیں۔ یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے اور تحقیقی میدان سر کرنے کی مہم کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا قابل ستائش ہے۔

نارنگ نے بلونت سنگھ کی کتابوں کی فہرست بھی دی ہے۔ ناشر اور سنہ اشاعت کے ساتھ جو تحقیق کا طریقہ کار ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے اس میں کہیں کہیں تسامح ہوا۔ جیسے ایک ''معمولی لڑکی'' اور ''عورت اور آبشار'' ناولٹ ہے لیکن فہرست میں

ناول لکھا گیا ہے۔ اس طرح 'چک پیرا کا جسّا' ناول ہے اسے افسانوی مجموعہ لکھا گیا ہے۔ تیسرے 'تارو پوذ' کی سنہ اشاعت 1944 درج کی گئی ہے جو درست نہیں ہے۔ جیسا کہ میں پچھلے صفحے پر تفصیل سے لکھ چکا ہوں کہ اس میں شامل تمام افسانے 1944 اور 1945 کے ہیں۔ لہٰذا یہ مجموعہ 1945 کے بعد ہی شائع ہوا ہے۔

ناول ''رات چور اور چاند'' 1961 میں ادارہ فروغ اردو لاہور، نقوش پریس سے شائع ہوا۔ اس سے قبل یہ ناول نقوش میں قسط وار مارچ 1956 سے اکتوبر 1961 تک متواتر شائع ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس ناول کا سن اشاعت نارنگ نے 1948 درج کیا ہے۔

ہندی کتابوں کی فہرست بھی مقام اشاعت، سنہ اشاعت اور پبلیشرز کے ساتھ دی گئی ہے۔ لیکن اس میں ناول اور افسانوی مجموعے کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے۔ اگر یہ بھی کردیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ ہندی کتابوں کی کل تعداد فہرست کے مطابق 1929 ہے۔ بلونت سنگھ پر کیے گئے اب تک کے کاموں میں نارنگ کا کام سب سے زیادہ اعتبار کے لائق ہے۔

نارنگ نے 'بلونت سنگھ کا فن- سائیکی، ثقافت اور شکست رومان' کے عنوان سے جو طویل مقدمہ لکھا ہے اس کا اختتام یوں کیا ہے:

> ''ایسی پر لطف کہانیوں کا فن کار اردو افسانے کی تاریخ سے غائب نہیں ہوسکتا .... اگرچہ منٹو، بیدی، کرشن چند اور قاسمی کے فوراً بعد کے معاصرین میں ہونے کی وجہ سے ان پر نگاہیں اس قدر نہیں ٹھہریں، اور پھر قبل از وقت موت سے وہ نگاہوں سے جلد اوجھل بھی ہوگئے۔ تاہم سکھ سائیکی اور ثقافتی معنویت کی باز آفرینی کے اعتبار سے، نیز جگا، گرنتھی، سورما سنگھ، ویلے 38 ، پہلا پتھر، دیش بھگت، کالی تیتری یا کٹھن ڈگریا کے خالق کی حیثیت سے اردو

افسانے کی دنیا میں بلونت سنگھ کی جگہ محفوظ ہے۔ ان کی خاص
خاص کہانیوں کی قبولیت اور معنویت وقت کے ساتھ ساتھ بڑھے گی
کم نہیں ہوگی۔ ایسا افسانہ نگار وقتی طور پر نظر انداز تو ہوسکتا ہے،
وقت اسے ہمیشہ نظر انداز نہیں کرسکتا۔"

نارنگ کا یہ خیال بالکل درست ہے۔ میرے اس حقیر کام کو بلونت سنگھ کی از سر نو دریافت کی ایک کوشش ہی سمجھنا چاہیے۔ وقت بلونت سنگھ کو زیادہ دنوں تک نظر انداز نہیں کرسکا۔ نارنگ کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا۔

چھ افسانوی مجموعوں کے افسانوں کے علاوہ اس کلیات میں نئے تلاش کیے گئے افسانے 67 سے زیادہ ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

نئے افسانے : آبشار، آبگینہ، آنند کارج، ایک ہی ناؤ میں، اللہ کا فضل، ایک بھیگی شام، ارداس، ایک رات، باندھ، بادلوں کی چھاؤں تلے، بھیگی آنکھیں، بات ایک رات کی، بھول بھلیاں، پھانس، پاسٹ، پودے، پھلکاری، پھمن کور، پردیسی چاند، پیلا پھاٹک، پاسبان، تیسرا سگریٹ، تین خط، تین دیویاں، تعویز، تیاگ، تکون، جزیرے، چاند اور کمند، چلمن، چالان، چار سو برس پہلے، چار استاد، چیتنا، حد فاصل، حسن والے 1998 میں، خدا کی وصیت، دودھ بھری گلیاں، دیدار، دوسرا ہنی مون، دل بلبل، دستک، دانت ایک بات ایک، ڈاکو باگڑ سنگھ، راستہ چلتی عورت، زلف کی داستان، رخصتی، زن گذراں، سکہ زن، سپنوں کا راہی، شکار کا شکار، صابن کی ٹکیہ، صبح و شام آرزو، فلمی انٹرویو، کاکو اور اس کے پریمی، کالی تیتری، کومل سنگھ کی محبوبہ، گلیاں، گوری چلی سسرال، لشکتی شامیں، مکھن سنگھ کا اغوا، ناگ پھنی، ھوالشافی۔

اب وہ افسانے جن کا نام تو معلوم ہے لیکن جن تک رسائی نہیں ہوسکی ہے وہ یہ ہیں:

البینا، اس حمام میں، بیڈ منٹن کی چڑیا، دوسری غلطی، سنگ انداز، کاتے، واپسی، یہ لمحے، پودے۔

نئی کھوج میں ڈرامے اور مضامین بھی شامل ہیں۔

ڈرامے : پامال محبت، پھانس اور سکہ زن ہیں اور **ناولٹ**: عہدِ نو میں ملازمت کے تیس مہینے، **مضامین**: چار سو برس پہلے، فلمی انٹرویو، حضرت چھچھوندر چھچھوندری، ایڈیٹر لوگ اور کرشن چندر اور فراق گورکھپوری سے لیے گئے انٹرویو بھی شامل ہیں۔ اتنی ساری نئی سوغات اس کلیات میں شامل ہیں۔

عنوان کی سطح پر ایک تکرار اور ایک تبدیلی ہے۔ مثلاً 'کالے کوس' یہ ان کے ایک ناول کا نام ہے جو اردو اور ہندی دونوں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس عنوان سے ایک افسانہ بھی اس کلیات میں شامل ہے۔ اسی طرح 'رشتہ' کے نام سے ایک افسانہ 'سوغات' کے شمارہ آٹھ گوشۂ بلونت سنگھ نمبر میں شائع ہوا ہے۔ یہ دراصل 'کرنیل سنگھ' نام کی کہانی کا بدلا ہوا عنوان ہے۔ یہ کہانی ہندی میں 'رشتہ' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ اور ہندی مجموعے میں اسی نام سے شامل ہے۔ اردو میں کرنیل سنگھ کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ ''آبشار'' ان کے ایک افسانے کا نام ہے جو آج کل میں مارچ 1955 میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ''عورت اور آبشار'' کے نام سے ان کا ایک ناولٹ بھی شائع ہوا۔ کچھ لوگ اس کو ایک ہی مانتے ہیں۔ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ دراصل یہ دونوں تحریریں الگ الگ ہیں۔ آبشار افسانے کو ہی پھیلا کر ناولٹ کا روپ دیا گیا ہے۔ لیکن افسانہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ دونوں کے متن میں بھی کافی فرق ہے۔ وہی فرق جو افسانے اور ناولٹ میں ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ افسانہ آبشار ہی بعد میں ''عورت اور آبشار'' کے نام سے کتابی شکل میں آیا مناسب نہیں ہے۔ عنوان میں اضافہ کے ساتھ ساتھ متن میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ گرچہ کہانی کا محور عورت اور آبشار ہی دونوں میں ہے۔

کلیات کے افسانوں کی تقویمی ترتیب رسائل میں شائع شدہ افسانوں کے

سنہ اشاعت کے مطابق رکھا گیا ہے اور جن افسانوں کی سال اشاعت رسائل سے دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ اس کی اشاعت مجموعہ کی زمانہ اشاعت کے مطابق اسی درمیان میں رکھی گئی ہے۔ ایک افسانہ اگر کئی رسالوں میں شائع ہوا ہے تو پہلی اشاعت کو صحیح و درست مانا گیا ہے۔

یہ کلیات کی جلد دوم ہے۔ اس میں کل اٹھائیس افسانے شامل ہیں، جس میں مجموعہ ''ہندوستان ہمارا'' کے بارہ اور ''سنہرا دیس'' کے چودہ افسانوں کے علاوہ دو نئے افسانے ''پاسٹ'' اور ''پاسبان'' شامل ہیں۔

اب میں آخر میں ان افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنھوں نے اس تحقیقی کام میں میری معاونت کی، پروفیسر علی احمد فاطمی، ڈاکٹر نجیب اختر، ڈاکٹر منجو سنگھ، ڈاکٹر عطا خورشید علی گڑھ، یوں تو ان کے تعاون کے لیے شکریے کے الفاظ ناکافی ہیں۔ میں تہ دل سے ان سب کا مشکور ہوں۔

جمیل اختر

فروری 2009

18 جی، سی پی ڈبلیو ڈی کالونی
وسنت وہار، نئی دہلی-57
موبائل: 9818318512

چکوری

نزہت گھر میں اکیلی بیٹھی جرابیں بن رہی تھی۔ ابا دفتر گئے ہوئے تھے۔ پروفیسر عبداللہ کے ہاں کوئی موت ہوگئی تھی۔ امی کو وہاں جانا پڑا۔ چھوٹا بھائی اور بہن اسکول میں تھے۔ صرف ان کا بارہ سالہ نوکر عمر و صحن میں بیٹھا دیگچی مانجھ رہا تھا۔ مٹر اور قیمہ تھالی میں رکھے تھے۔ امی سالن تیار کرنے کے لیے کہہ گئی تھیں۔ نزہت نے کئی مرتبہ اٹھنے کا تہیہ کیا۔ لیکن نہ اٹھی۔ آج اس کا دل بس یہی چاہتا تھا کہ جرابیں بنے جائے۔

انہیں سرکاری مکان ملا ہوا تھا۔ مکان کے ارد گرد چند گز زمین باغ کے لیے چھوڑ دی گئی تھی۔ مکان میں ایک ہی قطار میں چار بڑے بڑے کمرے تھے۔ دو برآمدے تھے ایک باہر کی طرف جہاں سرکنڈوں کی بنی ہوئی بڑی بڑی چقیں پڑی رہتی تھیں۔ ایک برآمدہ اندر کی جانب تھا۔ جس کے دونوں سروں پر غسل خانہ اور ایک چھوٹا سا اسٹور بنا ہوا تھا۔ اچھا خاصا صحن تھا۔ صحن کے پرلے کونے پر باورچی خانہ تھا۔

ابا یوں تو بڑے خوش مزاج اور البیلی طبیعت کے شخص تھے۔ لیکن انہیں باغ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ چناں چہ باغ ویران پڑا تھا۔ سرسبز باڑھ کٹائی نہ ہونے کی وجہ سے بے تحاشا بڑی اور الجھی ہوئی داڑھی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ بیچ کی چوڑی روش کے دونوں کناروں پر لمبی قطاروں میں گڑی ہوئی آڑی اینٹیں بھی ادھر اُدھر گری پڑی

تھیں۔ زمین پر خود رو روتی سوکھی گھاس بہت بھدی معلوم ہوتی تھی۔ وہ چھوٹا سا جوہڑ تالاب جو آبیاری کے لیے سرکار کی طرف سے بنایا گیا تھا خشک پڑا تھا۔ اس میں تین چار مینڈک نہ معلوم کس طرح گر پڑے۔ کہیں بچوں نے دیکھ پائے۔ ڈھیلے مار مار کر بے چاروں کو شہید کر ڈالا۔ اب تک وہ ڈھیلے اسی طرح بے ترتیب پڑے تھے اور وہ مینڈک اُپلوں کی طرح خشک۔

سردی رخصت ہو رہی تھی۔ موسم گرما کی آمد آمد تھی لیکن صبح کے وقت ہوا خنک ہی ہوتی تھی۔ البتہ دوپہر کو حدت محسوس ہونے لگتی— اس لیے دن کا وہ حصہ تو یوں ہی کمر سیدھی کرتے اور کروٹیں بدلتے ہی گذر جاتا تھا۔ البتہ صبح کے وقت جبکہ سب لوگ باہر چلے جاتے تھے اور موسم بھی خوش گوار ہوتا تھا۔ کام کرنے میں دل لگ جاتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سلائیاں تیزی سے ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھوں سے لگائے چمیلی کے پودوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پچھلی شام کو ان پر چند کلیاں موجود تھیں۔ آج پھول کھل گئے تھے۔ وہ سوچتی تھی کہ نہ معلوم کتنے پھول ہیں۔ پودے ذرا دور تھے۔ اس لیے وہ پھولوں کی تعداد کا صحیح اندازہ نہ لگا سکتی تھی۔ اتنے میں تقریباً ایک فرلانگ پرے پکی سڑک سے ایک تانگہ ادھر کو گھوما۔ اور گزھل کے تین درختوں کے قریب سے ہوتا ہوا بڑھا۔ اس جگہ لاریوں، کاروں اور تانگوں کی ایسی ریل پیل نہ تھی۔ یہ سرکاری جگہ تھی بلا ضرورت کوئی تانگہ اس طرف کا رخ نہ کرسکتا تھا۔ تانگہ اسی صورت میں نظر آتا تھا۔ جب کسی کو کہیں جانا ہو یا کسی کا کوئی رشتہ دار ملنے کے لیے چلا آئے۔ یہاں سبھی لوگ پردیسی تھے۔ بھلا بغیر کسی خاص ضرورت کے کسی کے رشتہ دار کو کیا پڑی کہ اپنا کام چھوڑ چھاڑ کر اتنی دور ملنے کے لیے چلا آئے...... نزہت پہلے تو برآمدے کی اٹھی ہوئی چق میں سے تانگہ کی طرف دیکھتی رہی۔ لیکن جب تانگہ چقوں کی اوٹ میں آگیا تو وہ پھر جرابوں پر جھک گئی۔ البتہ اس کے کانوں میں گھوڑے کی ٹاپوں اور تانگے کی کھچا کھچ کی آوازیں آتی رہیں۔ اور پھر دفعتاً تانگہ رُک گیا۔ وہ چونک پڑی...... ان کے ہاں تو کوئی آنے والا نہیں تھا۔ لیکن تانگہ یقیناً ان ہی کے دروازے پر آن کر رکا تھا...... اگرچہ وہ جس دروازے کے قریب بیٹھی ہوئی تھی اس پر چق پڑی ہوئی تھی تاہم اس نے احتیاط

سے اپنا سر ڈھانپ لیا اور تیزی سے کھسک کر قدرے پیچھے ہٹالی۔ پھر کان دھر کر سننے لگی...... پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر برآمدے کے فرش پر سامان رکھنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد لمحہ بھر تک خاموشی طاری رہی۔ پھر تانگہ والے کی بیٹھی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''سلام صاحب!''

نزہت نے دروازے کے پٹ بھیڑنے شروع کیے۔ ابھی وہ دروازہ پورے طور پر بند بھی نہ کرنے پائی تھی کہ بوٹوں کی چرمر کا شور بہت قریب سے سنائی دیا اور وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کیا کسی اجنبی نے اسے دیکھ پایا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ لرزتے ہوئے سینے پر رکھ لیا۔ اس کی سانس نسبتاً تیز تیز چلنے لگی۔ اس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھیں پھیل کر اور بھی بڑی ہوگئیں۔ اس کے نچلے ہونٹ کا ذرا سا حصہ اس کے دانتوں تلے دب گیا۔ لیکن نہیں اجنبی اسے ہرگز نہ دیکھ پایا ہوگا۔

''خاں صاحب! ...... خاں صاحب!!''

آواز سے اجنبی نو عمر ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز بھرپور نہ تھی۔ نہ اس کی آواز میں پختگی اور بھاری پن ہی پیدا ہوا تھا...... نزہت کونے میں چپ چاپ دبکی کھڑی رہی۔ وہ جواب نہ دے سکتی تھی۔ اجنبی کی آواز بھی اس قدر مدھم تھی کہ صحن میں بیٹھے ہوئے نوکر کے کانوں تک بھی نہ پہنچ سکتی تھی۔ شاید وہ یہ سمجھا ہو کہ کمرے میں کوئی نہ کوئی تو ضرور ہوگا۔ دروازہ ابھی کچھ کھلا ہوا تھا۔ دروازہ کے آگے چق ہی سہی لیکن اجنبی آگے سے ہٹے تو وہ صحن میں جاکر نوکر کو باہر بھیجے۔ نووارد مدھم سروں میں آوازیں دیتا ہی چلا گیا۔ نزہت بھی بے جان بت بنی کھڑی رہی۔ پھر قدرے سکوت کے بعد بوٹوں کی چرمر کی آواز پرے ہٹنے لگی۔ اس نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر دروازہ بند کردیا۔ اور پھر پنجوں کے بل لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی نوکر کے قریب پہنچی۔ اور ہانپتی کانپتی آواز میں کہنے لگی۔ ''عمرو، عمرو!''

عمرو باہر گیا، پھر اندر آیا۔ پھر باہر بھیجا گیا۔ پھر جواب لے کر اندر آیا۔ اس

طرح پانچ سات منٹ اسی ہیرا پھیری میں گذر گئے۔ لیکن عمرو اس قدر احمق لڑکا تھا کہ اس کی باتوں سے نزہت کے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ بس یہی معلوم ہو سکا کہ نو وارد ابا کے کسی دوست کا لڑکا ہے۔ نزہت بے چاری عجب مخمصے میں گرفتار تھی۔ ابا کا ڈر کہ کہیں ڈانٹیں کہ اندر کیوں نہ بٹھلایا۔ اور پھر اس نے اخباروں میں یہ بھی پڑھا تھا کہ کس طرح بعض دھوکے باز ٹھگ مہمان بن کر لوگوں کے گھروں میں پہنچ جاتے ہیں — ہار کر اس نے اسے کونے والے کمرے میں جسے گھر کی بیٹھک کہنا چاہئے مہمان کو بٹھلایا اور اس کا سامان، ایک بستر، ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ — اندر منگوا لیا۔ اور پھر گھر کے کل دروازے اندر سے بند کر کے باورچی خانہ میں عمرو کے پاس جا بیٹھی۔

''ارے عمرو! کون ہوگا بھلا؟ تم نے کبھی پہلے بھی دیکھا ہے اسے؟''

تھوڑی دیر بعد امی آگئیں۔ وہ دونوں باورچی خانہ میں دبکے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مہمان سے پانی تک کے لیے نہ پوچھا تھا۔ امی کو یہ سب باتیں معلوم ہوئیں تو انہوں نے فوراً عمرو کو مہمان کے پاس بھیجا۔

امی کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ نوجوان ابا کے کسی دوست کا لڑکا تھا۔ اور اس جگہ امتحان دینے کے لیے آیا تھا۔

عمرو نے واپس آکر زور زور سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''جی وہ پانی مانگتے ہیں۔ لوٹا مانگتے ہیں۔ تولیہ مانگتے ہیں۔''

امّی ہاتھ جھٹکا کر بولیں۔ ''کلموہے چلاتا کیوں ہے۔ دیکھو تو کھڑا ہانپ رہا ہے۔''

پھر امّی نے نزہت کو ٹرنک میں سے دھوبی کا دھلا ہوا تولیہ نکالنے کے لیے بھیجا۔ وہ آنچل سنبھالتی ہوئی بڑی پھرتی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی چل دی۔ اس کے پیچھے پیچھے عمرو ناک سرسراتا ہوا لپکا چلا جارہا تھا۔ اندر والے کمرے میں پہنچ کر نزہت نے لکڑی کا بڑا بکس کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عمرو بولا۔ '' انہوں نے کہا تھا

میرے ٹرنک میں سے نکال کر دو۔"

"انہوں نے کس نے؟ امی نے!

"جی نہیں۔" عمرو نے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے خاصی بلند آواز میں کہا۔

"انہوں نے ...... وہ ...... جو آئے ہوئے بیٹھے......"

نزہت اس کی اس قدر بلند آواز سن کر لرز گئی۔ چپت مارنے کے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "تجھ سے آہستہ نہیں بولا جاتا کیا؟"

عمرو اپنے ہونٹوں پر خود ہی اُنگلی رکھ کر خاموش ہوگیا۔ نزہت دل ہی دل میں شرما رہی تھی۔" بے وقوف عمرو۔ مردود کیسا گلا پھاڑ کر چلاتا ہے۔"

چمڑے کا سوٹ کیس ابھی تک پلنگ پر جوں کا توں دھرا تھا۔ کمرے کے باقی جانے پہچانے سامان میں یہ چاکلیٹ رنگ کا سوٹ کیس بالکل اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دونوں کونوں پر قلعی کیے ہوئے لوہے کے ٹکڑے چمک رہے تھے...... وہ آگے بڑھی۔ سوٹ کیس کے لمس سے اس کی انگلیوں میں ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اس کے بٹن پر انگوٹھا رکھ کر دبایا۔ لیکن اسے اپنی جگہ سے جنبش نہ ہوئی۔ اس نے اور زور سے دبایا۔ پھر بھی وہ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اسی کش مکش میں اس کے سر سے دوپٹہ کھسک گیا۔ لیکن وہ اسے کھولنے پر تلی ہوئی تھی۔ بٹن زور سے دبانے کی وجہ سے اس کا انگوٹھا پیچھے کی جانب گھوم گیا۔ اور اس کے پوروں پر گہرے سرخ رنگ کی لکیریں نمایاں طور پر دکھائی دینے لگیں۔ اور پھر دفعتاً انگوٹھا ہٹا اور کنڈا پٹاخ سے کھل کر اس کے ہاتھ سے ٹکرایا اور وہ ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گئی...... عمرو کی بتیسی نکل آئی۔

نوکر تولیہ لے کر چلا گیا۔ اور وہ کھلے ہوئے سوٹ کیس ہی کے قریب کھڑی رہی۔ سوٹ کیس میں سے فنائل کی گولیوں اور خوشبودار تیل کی جلی بو آ رہی تھی۔ کپڑے لتے ٹھسے ٹھسائے نظر آ رہے تھے۔ تین چار رنگ برنگ کی ٹوئل ٹائیاں، ایک کونے میں چار پانچ کالر سفید رومالوں کی تہیں خراب کر رہی تھیں۔ فونٹن پن، نوٹ بک اور چند

زمین نذ نے بکھرے پڑے تھے۔

شام کو جب ابا گھر آئے تو مہمان سے بڑے تپاک سے ملے اور اندر آکر پوچھتے رہے کہ کہیں اس کی خاطر داری میں کوئی کسر تو نہیں اٹھا رکھی۔ ان دونوں کی عمر میں تفاوت بھی ہوا تو کیا وہ چھوٹے چھوٹے بچوں تک سے بل مل جاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بچے بھی اسکول سے واپس آگئے۔ خوب ہنگامہ رہا۔ مہمان کی آمد سے گھر میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ رات کے لیے دو قسم کا گوشت، سبزی اور دال وغیرہ کا حکم ملا۔ مردانے میں سے ابا کے قہقہوں اور بچوں کے چیچہوں کی صدائیں آرہی تھیں...... تھوڑی دیر بعد نو سالہ توفیق بھاگتا ہوا اندر آیا۔ ''امی — امّی۔ ہم نمائش دیکھنے کے لیے جائیں گے۔ خوشی بھی چلے گی۔ ابا کہتے ہیں کپڑے پہن کر آؤ تمہیں ممتاز بھیا کے ساتھ نمائش میں لے چلیں...... امّی بس جلدی کیجئے، بہت جلدی۔''

امّی نے توفیق کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے نزہت سے کہا کہ بچوں کو کپڑے پہنادے۔ نزہت آنچل سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پیچھے پیچھے چیختے چلّاتے بچے...... نزہت نے کپڑے ٹرنکوں میں سے نکالے۔

بچے ہانپ رہے تھے، ان کے گال تمتما اٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ممتاز بھیا سے ان کی کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ممتاز بھیا کی وہ بات......! ......'' اور پھر آپا!...... آپ جانتی ہیں ممتاز بھیا کیسے بیٹھتے ہیں......؟'' یہ کہہ کر وہ اسٹول پر ٹانگ پہ ٹانگ دھر کر اور ٹھڈی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے دل کش انداز سے بیٹھ گیا اور مسکرانے لگا...... نزہت اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی...... اور پھر...... '' آپا آپ کو معلوم ہے کہ ممتاز بھیا۔''

رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب وہ لوگ نمائش گاہ سے واپس آئے۔ بچے چیختے چلّاتے گاتے مٹکتے اور ربڑ کے رنگ دار غبارے اڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ بے چاری خوشی کچھ تھک سی گئی تھی۔ اچھا تو ہماری ننھی خوشی کیا شے خرید کر لائی ہے۔ ایک گڑیا جتنی بڑی وہ خود ہے اتنی ہی بڑی اس کی گڑیا! اور یہ کیا ہے؟ خوشی بیٹا یہ

کیا ہے؟ خوشی پھونک مارتی ہے اور کاغذ میں لپٹا ہوا سانپ سیٹی کی سی آواز نکالتا ہوا دفعتہً امی کی ناک چھو لیتا ہے۔ خوشی کی نیند کی ماتی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں لیکن...... تھوڑی ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہوجاتی ہے۔ باقی لوگ بھی کھانا وانا کھا کر رفتہ رفتہ سوجاتے ہیں۔ نزہت کھڑکی کے قریب اپنے بستر پر لیٹی ہے...... موسم بے حد خوش گوار ہے۔ تارے دھلے ہوئے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں اڑا جارہا ہے۔

صبح!

بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔ گھر کے پچھواڑے ان کی اجڑی ہوئی بگیا میں ٹماٹر کے چند پودے اُگے ہوئے تھے۔ ان کی ٹہنیوں سے چند ٹماٹر توڑے گئے۔ بچّوں کو آلو ٹماٹر دیئے تھے۔ اور پھر اس کے بعد ''ممتاز بھیّا'' کے لیے کیا چیز پکے گی؟ نہ معلوم انہیں کون سی چیز مرغوب ہے۔ ان سے کون پوچھے! نزہت خود یہ بات عمرو سے کہنا مناسب نہ سمجھتی تھی۔ اور امّی کو اس بات کا خیال ہی نہ آسکتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ نومبر کے مہینہ میں اس نے گوبھی سکھائی تھی شاید وہ رکھی ہو۔ اس خیال سے وہ اٹھی جب وہ صحن سے گذر کر برآمدے میں پہنچی تو عمرو مردانے سے سرپٹ بھاگتا ہوا نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ ہکلا ہکلا کر بولا۔ '' آپا جی! ٹھت کیا ہوتا ہے۔ جی وہ جو آئے ہیں وہ ٹھت...... ٹھت......!''

'' مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہئے۔ میرے بیگ میں......''

مردانہ سے یہ آواز سن کر نزہت دم بخود رہ گئی۔ پہلے وہ اُلٹے پاؤں دوڑنے لگی۔ اور پھر وہ کمرے کی طرف...... لیکن امی کہاں ہیں؟...... اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...... کسی نے دیکھا تو نہیں...... بڑی مشکل سے جاکر اس نے بیگ میں سے

ٹوتھ پیسٹ اور برش نکال کر سے جان چھڑائی۔ اور خود جلدی سے باورچی خانہ میں
چلی آئی۔

امّی سر جھکائے لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ نزہت کے کان ابھی تک بج
رہے تھے...... مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہئے۔ اس کے جسم میں سنسنی خیز لہریں دوڑ رہی تھیں۔
جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کے کانوں میں آواز کی بازگشت مدھم ہوتی گئی۔ یہاں تک
کہ اس کے کانوں میں نہایت میٹھا اور رسیلا نغمہ سا گونجتا رہ گیا۔

وہ آواز اسے دن میں کئی مرتبہ سنائی دیتی تھی۔ مختلف لہجوں اور لوچ کے ساتھ کبھی
بلند قہقہے، کبھی دبی دبی ہنسی— گھومتے پھرتے آشنا آوازوں میں اس کے کانوں کو یہ
آواز بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ صرف آواز ہی سن کر کئی طرح کے تصورات باندھتی تھی
ہر تصور دل فریب ہوتا تھا۔ اُسے سنتے رہنے کی دبی دبی سی تمنا اس کے دل میں
کروٹیں لیا کرتی۔ چوری چھپے مردانے میں جھانکنے کی اُسے جرأت ہی نہیں ہوسکتی تھی۔
بلکہ اس کے دل میں اس کا خیال تک نہ آیا تھا...... لیکن کوئی نازک سا رشتہ اس آواز
سے پیدا ہو چکا تھا۔

جب وہ ادھر اُدھر کے کاموں میں مصروف ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں
جاتی تو زیرِلب وہ کچھ گنگنایا کرتی۔ اس نے کبھی کوئی کام کا گیت یا شعر یاد نہ کیا تھا۔
دل میں سے کوئی گیت بن کر اس کے لبوں تک آتا تھا۔ لیکن اس قدر مبہم اور
دھندلا تاثر الفاظ میں نہ ڈھلتا تھا۔ اَن جانی اور اَن سنی دھن میں صرف ایک گنگناہٹ سی
پیدا ہو کر رہ جاتی تھی۔

شام کے وقت جب ان کے باورچی خانہ کی لوہے کی چادروں والی چھت سورج
کی روشنی میں جگمگا اٹھتی تھی۔ تو اس وقت صحن کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب وہ سب
لوگ مل کر بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ نزہت سوکھے ہوئے کپڑوں کو رسیوں سے اتار اتار

کر ان کی تھیں بٹھاتی تو اس کی نگاہیں دیوار کے اوپر اٹھ جاتیں۔ جہاں ریکٹ ایک لمحہ کے لیے گھومتے ہوئے نظر آتے اور پھر گم ہوجاتے۔ کھلاڑیوں کے پاؤں تلے سے گرد اٹھ کر ہوا میں منڈلانے لگتی۔ اور نزہت سوچنے لگتی۔ اسی گرد میں وہ گرد بھی مل گئی ہوگی جو...... بچوں کے شور مچانے اور تالیاں بجانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ ''آہا...... اب ممتاز بھیا...... ممتاز بھیا۔'' اور کبھی ''چڑیا''۔ اچھل کر صحن میں آن گرتی اور اگر کوئی آس پاس موجود نہ ہوتا تو وہ ''چڑیا'' کو اٹھا لیتی۔ اور پھر عجب الجھن میں گرفتار ہوجاتی کہ اسے باہر پھینکے یا نہ پھینکے......

کبھی نزہت صحن کے ایک کونے میں باورچی خانہ کے سائے تلے بیٹھی انگلیوں کے ناخن ہموار کیا کرتی۔ عمرو چولھا لیپنے کے لیے مٹی گوندھنے میں مگن ہوتا۔ اور امی اسے ہدایتیں کرتیں۔ مردانہ سے آواز آتی۔ ''عمرو! ...... عمرو!!'' وہ اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی۔ لیکن عمرو بے خبری کے عالم میں ناچ ناچ کر پاؤں سے مٹی گوندھے جاتا۔ امی لاپرواہی سے ہاتھ پاؤں کو مل مل کر میل کی بتیاں بناتیں اور پھر انہیں جھاڑ دیتیں۔ کیا مجال جوان کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔ نزہت دل ہی دل میں کڑھتی۔

ایک روز ممتاز بھیا کا کوئی امتحان نہیں تھا شاید گھر ہی پر بیٹھے رہے بالکل چپ چاپ نزہت کچھ گھبرائی اور کچھ لجائی ہوئی۔ کچھ سمٹی ہوئی اور کچھ لڑکھڑاتی ہوئی ادھر اُدھر گھومتی رہی۔ جب وہ باورچی خانہ سے اندر کی طرف یا اندر سے باورچی خانے کی جانب جانے کے لیے مردانے کے قریب سے ہو کر گذرتی تو اس کا دل اچھلنے لگتا۔ لیکن مردانے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ کوئی آواز، پاؤں کی چاپ، کاغذوں کی کھسر پھسر، گیت کی گنگناہٹ، سیٹی یا کچھ—— کچھ بھی نہیں...... عمرو مردانے کی طرف جاتا تھا اور لوٹ آتا تھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ پھوٹتا تھا...... ہر کوئی کس قدر مطمئن نظر آتا تھا۔

ٹوتھ پیسٹ اور برش نکال نوکر سے جان چھڑائی۔ اور خود جلدی سے باورچی خانہ میں چلی آئی۔

امّی سر جھکائے لہسن کی تریاں چھیل رہی تھیں۔ نزہت کے کان ابھی تک بج رہے تھے...... مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہئے۔ اس کے جسم میں سنسنی خیز لہریں دوڑ رہی تھیں۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا اس کے کانوں میں آواز کی بازگشت مدھم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس کے کانوں میں نہایت میٹھا اور رسیلا نغمہ سا گونجتا رہ گیا۔

وہ آواز اسے دن میں کئی مرتبہ سنائی دیتی تھی۔ مختلف لہجوں اور لوچ کے ساتھ کبھی بلند قہقہے، کبھی دبی دبی ہنسی۔۔۔ گھومتے پھرتے آشنا آوازوں میں اس کے کانوں کو یہ آواز بھلی معلوم ہوتی تھی۔ وہ صرف آواز ہی سن کر کئی طرح کے تصورات باندھتی تھی ہر تصور دل فریب ہوتا تھا۔ اُسے سنتے رہنے کی دبی دبی سی تمنا اس کے دل میں کروٹیں لیا کرتی۔ چوری چھپے مردانے میں جھانکنے کی اُسے جرأت ہی نہیں ہوسکتی تھی۔ بلکہ اس کے دل میں اس کا خیال تک نہ آیا تھا...... لیکن کوئی نازک سا رشتہ اس آواز سے پیدا ہو چکا تھا۔

جب وہ اِدھر اُدھر کے کاموں میں مصروف ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتی تو زیرلب وہ کچھ گنگنایا کرتی۔ اس نے کبھی کوئی کام کا گیت یا شعر یاد نہ کیا تھا۔ دل میں سے کوئی گیت بن کر اس کے لبوں تک آتا تھا۔ لیکن اس قدر مبہم اور دھندلا تاثر الفاظ میں نہ ڈھلتا تھا۔ اَن جانی اور اَن سنی دھن میں صرف ایک گنگناہٹ سی پیدا ہو کر رہ جاتی تھی۔

شام کے وقت جب ان کے باورچی خانہ کی لوہے کی چادروں والی چھت سورج کی روشنی میں جگمگا اٹھتی تھی۔ تو اس وقت صحن کی دیوار کے ساتھ باہر کی جانب وہ سب لوگ مل کر بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ نزہت سوکھے ہوئے کپڑوں کو رسیوں سے اتار اتار

کر ان کی نہیں بھاتی تو اس کی نگاہیں دیوار کے اوپر اٹھ جاتیں۔ جہاں ریکٹ ایک لمحہ کے لیے گھومتے ہوئے نظر آتے اور پھر گم ہوجاتے۔ کھلاڑیوں کے پاؤں تلے سے گرد اٹھ کر ہوا میں منڈلانے لگتی۔ اور نزہت سوچنے لگتی۔ اسی گرد میں وہ گرد بھی مل گئی ہوگی جو...... بچوں کے شور مچانے اور تالیاں بجانے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ "آہا...... اب ممتاز بھیا...... ممتاز بھیا۔" اور کبھی "چڑیا"۔ اچھل کر صحن میں آن گرتی اور اگر کوئی آس پاس موجود نہ ہوتا تو وہ "چڑیا" کو اٹھا لیتی۔ اور پھر عجب الجھن میں گرفتار ہوجاتی کہ اسے باہر پھینکے یا نہ پھینکے......

کبھی نزہت صحن کے ایک کونے میں باورچی خانہ کے سائے تلے بیٹھی انگلیوں کے ناخن ہموار کیا کرتی۔ عمرو چولھا لیپنے کے لیے مٹی گوندھنے میں مگن ہوتا۔ اور امّی اسے ہدایتیں کرتیں۔ مردانہ سے آواز آتی۔ "عمرو! ...... عمرو!!" وہ اس آواز کو ہزاروں آوازوں میں سے پہچان سکتی تھی۔ لیکن عمرو بے خبری کے عالم میں ناچ ناچ کر پاؤں سے مٹی گوندھے جاتا۔ امّی لاپرواہی سے ہاتھ پاؤں کو مل مل کر میل کی بتیاں بناتیں اور پھر انہیں جھاڑ دیتیں۔ کیا مجال جوان کے کان پر جوں بھی رینگ جائے۔ نزہت دل ہی دل میں کڑھتی۔

ایک روز ممتاز بھیا کا کوئی امتحان نہیں تھا شاید گھر ہی پر بیٹھے رہے بالکل چپ چاپ نزہت کچھ گھبرائی اور کچھ لجائی ہوئی۔ کچھ سمٹی ہوئی اور کچھ لڑکھڑاتی ہوئی ادھر اُدھر گھومتی رہی۔ جب وہ باورچی خانہ سے اندر کی طرف یا اندر سے باورچی خانے کی جانب جانے کے لیے مردانے کے قریب سے ہوکر گزرتی تو اس کا دل اچھلنے لگتا۔ لیکن مردانے میں مکمل خاموشی طاری تھی۔ کوئی آواز، پاؤں کی چاپ، کاغذوں کی کھسر پھسر، گیت کی گنگناہٹ، سیٹی یا کچھ — کچھ بھی نہیں...... عمرو مردانے کی طرف جاتا تھا اور لوٹ آتا تھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ پھوٹتا تھا...... ہر کوئی کس قدر مطمئن نظر آتا تھا۔

رنگین لفافے بکھرے پڑے تھے۔

شام کو جب ابا گھر آئے تو مہمان سے بڑے تپاک سے ملے اور اندر آکر پوچھتے رہے کہ کہیں اس کی خاطر داری میں کوئی کسر تو نہیں اٹھا رکھی۔ ان دونوں کی عمر میں تفاوت بھی ہوا تو کیا وہ چھوٹے چھوٹے بچوں تک سے ہل مل جاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بچے بھی اسکول سے واپس آگئے۔ خوب ہنگامہ رہا۔ مہمان کی آمد سے گھر میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ رات کے لیے دو قسم کا گوشت، سبزی اور دال وغیرہ کا حکم ملا۔ مردانے میں سے ابا کے قہقہوں اور بچوں کے چہچہوں کی صدائیں آرہی تھیں...... تھوڑی دیر بعد نو سالہ توفیق بھاگتا ہوا اندر آیا۔ ''امی — امّی۔ ہم نمائش دیکھنے کے لیے جائیں گے۔ خوشی بھی چلے گی۔ ابا کہتے ہیں کپڑے پہن کر آؤ تمھیں ممتاز بھیا کے ساتھ نمائش میں لے چلیں...... امّی بس جلدی کیجئے، بہت جلدی۔''

امّی نے توفیق کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے نزہت سے کہا کہ بچوں کو کپڑے پہنادے۔ نزہت آنچل سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پیچھے پیچھے چیختے چلاتے بچے......

نزہت نے کپڑے ٹرنکوں میں سے نکالے۔

بچے ہانپ رہے تھے، ان کے گال تمتما اٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ممتاز بھیا سے ان کی کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ ممتاز بھیا کی وہ بات......! ......'' اور پھر آپا!...... آپ جانتی ہیں ممتاز بھیا کیسے بیٹھتے ہیں......؟'' یہ کہہ کر وہ اسٹول پر ٹانگ پہ ٹانگ دھر کر اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے دل کش انداز سے بیٹھ گیا اور مسکرانے لگا...... نزہت اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی...... اور پھر......'' آپا آپ کو معلوم ہے کہ ممتاز بھیا۔''

رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب وہ لوگ نمائش گاہ سے واپس آئے۔ بچے چیختے چلاتے گاتے ملکتے اور ربڑ کے رنگ دار غبارے اڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ بے چاری خوشی کچھ تھک سی گئی تھی۔ اچھا تو ہماری ننھی خوشی کیا شے خرید کر لائی ہے۔ ایک گڑیا جتنی بڑی وہ خود ہے اتنی ہی بڑی اس کی گڑیا! اور یہ کیا ہے؟ خوشی بیٹا یہ

کیا ہے؟ خوشی پھونک مارتی ہے اور کاغذ میں لپٹا ہوا سانپ سیٹی کی سی آواز نکالتا ہوا دفعتاً امی کی ناک چھو لیتا ہے۔ خوشی کی نیند کی ماتی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں لیکن..... تھوڑی ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہوجاتی ہے۔ باقی لوگ بھی کھانا دانا کھا کر رفتہ رفتہ سوجاتے ہیں۔ نزہت کھڑکی کے قریب اپنے بستر پر لیٹی ہے..... موسم بے حد خوش گوار ہے۔ تارے دھلے ہوئے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں اڑا جارہا ہے۔

صبح!

بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔گھر کے پچھواڑے ان کی اجڑی ہوئی بگیا میں ٹماٹر کے چند پودے اُگے ہوئے تھے۔ ان کی ٹہنیوں سے چند ٹماٹر توڑے گئے۔ بچوں کو آلو ٹماٹر دینے تھے۔ اور پھر اس کے بعد'' ممتاز بھیا'' کے لیے کیا چیز پکے گی؟ نہ معلوم انہیں کون سی چیز مرغوب ہے۔ ان سے کون پوچھے! نزہت خود یہ بات عمرو سے کہنا مناسب نہ سمجھتی تھی۔ اور امی کو اس بات کا خیال ہی نہ آسکتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ نومبر کے مہینہ میں اس نے گوبھی سکھائی تھی شاید وہ رکھی ہو۔ اس خیال سے وہ اٹھی جب وہ صحن سے گذر کر برآمدے میں پہنچی تو عمرو مردانے سے سرپٹ بھاگتا ہوا نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ ہکلا ہکلا کر بولا۔'' آپا جی! ٹھت کیا ہوتا ہے۔ جی وہ جو آئے ہیں وہ ٹھت...... ٹھت......!''

'' مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہئے۔ میرے بیگ میں.....''

مردانہ سے یہ آواز سن کر نزہت دم بخود رہ گئی۔ پہلے وہ اُلٹے پاؤں دوڑنے لگی۔ اور پھر وہ کمرے کی طرف..... لیکن امی کہاں ہیں؟..... اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا..... کسی نے دیکھا تو نہیں..... بڑی مشکل سے جاکر اس نے بیگ میں سے

رنگین لفافے بکھرے پڑے تھے۔

شام کو جب ابا گھر آئے تو مہمان سے بڑے تپاک سے ملے اور اندر آ کر پوچھتے رہے کہ کہیں اس کی خاطر داری میں کوئی کسر تو نہیں اٹھا رکھی۔ ان دونوں کی عمر میں تفاوت بھی ہوا تو کیا وہ چھوٹے چھوٹے بچوں تک سے ہل مل جاتے تھے۔

تھوڑی دیر بعد بچے بھی اسکول سے واپس آ گئے۔ خوب ہنگامہ رہا۔ مہمان کی آمد سے گھر میں خوب چہل پہل ہو رہی تھی۔ رات کے لیے دو قسم کا گوشت، سبزی اور دال وغیرہ کا حکم ملا۔ مردانے میں سے ابا کے قہقہوں اور بچوں کے چہچہوں کی صدائیں آ رہی تھیں...... تھوڑی دیر بعد نو سالہ توفیق بھاگتا ہوا اندر آیا۔ ''امی — امی۔ ہم نمائش دیکھنے کے لیے جائیں گے۔ خوشی بھی چلے گی۔ ابا کہتے ہیں کپڑے پہن کر آؤ تمہیں ممتاز بھیا کے ساتھ نمائش میں لے چلیں...... امی بس جلدی کیجئے، بہت جلدی۔''

امی نے توفیق کی پیشانی سے بال ہٹاتے ہوئے نزہت سے کہا کہ بچوں کو کپڑے پہنا دے۔ نزہت آنچل سنبھالتی ہوئی اندر چلی گئی۔ پیچھے پیچھے چیختے چلاتے بچے......

نزہت نے کپڑے ٹرنکوں میں سے نکالے۔

بچے ہانپ رہے تھے، ان کے گال تمتما اٹھے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ممتاز بھیا سے ان کی کافی بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ممتاز بھیا کی وہ بات......! ......'' اور پھر آپا!...... آپ جانتی ہیں ممتاز بھیا کیسے بیٹھتے ہیں......؟'' یہ کہہ کر وہ اسٹول پر ٹانگ پہ ٹانگ دھر کر اور ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر بڑے دل کش انداز سے بیٹھ گیا اور مسکرانے لگا...... نزہت اسے کنکھیوں سے دیکھتی رہی...... اور پھر......'' آپا آپ کو معلوم ہے کہ ممتاز بھیا۔''

رات کے ساڑھے دس بجے کے قریب وہ لوگ نمائش گاہ سے واپس آئے۔ بچے چیختے چلاتے گاتے مٹکتے اور ربڑ کے رنگ دار غبارے اڑاتے ہوئے صحن میں داخل ہوئے۔ بے چاری خوشی کچھ تھک سی گئی تھی۔ اچھا تو ہماری ننھی خوشی کیا شے خرید کر لائی ہے۔ ایک گڑیا جتنی بڑی وہ خود ہے اتنی ہی بڑی اس کی گڑیا! اور یہ کیا ہے؟ خوشی بیٹا یہ

گیا ہے؟ خوشی پھونک مارتی ہے اور کاغذ میں لپٹا ہوا سانپ سیٹی کی سی آواز نکالتا ہوا دفعتاً امی کی ناک چھو لیتا ہے۔ خوشی کی نیند کی ماتی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں لیکن..... تھوڑی ہی دیر بعد اس پر غنودگی طاری ہوجاتی ہے۔ باقی لوگ بھی کھانا وانا کھا کر رفتہ رفتہ سوجاتے ہیں۔ نزہت کھڑکی کے قریب اپنے بستر پر لیٹی ہے..... موسم بے حد خوش گوار ہے۔ تارے دھلے ہوئے موتیوں کی طرح چمک رہے ہیں۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں اڑا جارہا ہے۔

صبح!

بچے اسکول جانے کے لیے تیار ہونے لگے۔گھر کے پچھواڑے ان کی اجڑی ہوئی بگیا میں ٹماٹر کے چند پودے اُگے ہوئے تھے۔ ان کی ٹہنیوں سے چند ٹماٹر توڑے گئے۔ بچوں کو آلو ٹماٹر دینے تھے۔ اور پھر اس کے بعد "ممتاز بھیا" کے لیے کیا چیز پکے گی؟ نہ معلوم انہیں کون سی چیز مرغوب ہے۔ ان سے کون پوچھے! نزہت خود یہ بات عمرو سے کہنا مناسب نہ سمجھتی تھی۔ اور امّی کو اس بات کا خیال ہی نہ آسکتا تھا۔ پھر اسے یاد آیا کہ نومبر کے مہینہ میں اس نے گوبھی سکھائی تھی شاید وہ رکھی ہو۔ اس خیال سے وہ اٹھی جب وہ صحن سے گذر کر برآمدے میں پہنچی تو عمرو مردانے سے سرپٹ بھاگتا ہوا نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ ہکلا ہکلا کر بولا۔" آپا جی! ٹھت کیا ہوتا ہے۔ جی وہ جو آئے ہیں وہ ٹھت......ٹھت......!"

"مجھے ٹوتھ پیسٹ چاہئے۔ میرے بیگ میں....."

مردانہ سے یہ آواز سن کر نزہت دم بخود رہ گئی۔ پہلے وہ اُلٹے پاؤں دوڑنے لگی۔ اور پھر وہ کمرے کی طرف...... لیکن امی کہاں ہیں؟...... اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا...... کسی نے دیکھا تو نہیں...... بڑی مشکل سے جاکر اس نے بیگ میں سے

جب دوپہر کے وقت امّی سو گئیں.... تو نزہت نے اندر باہر کے کئی چکّر لگائے۔ اور کوؤں کی کائیں کائیں سنتی رہی..... اس نے صبح سے غسل ہی نہ کیا تھا۔ وہ بڑے آئینہ کے سامنے بیٹھ گئی۔ ہفتہ بھر سے اُسے بال تک دھونے کی فرصت نہ ملی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ بال دھو ہی ڈالے..... چوٹی کھول کر وہ آئینے میں اپنے بالوں کو دیکھنے لگی۔ یہ بال کیسے ہیں؟ بڑے تو نہیں..... اچھے ہیں، بہت اچھے ہیں..... اگر بالوں کی ایک لٹ اس جگہ ہوتو ؟..... یا ایک زلف چوٹی کی گرفت سے آزاد رہ کر رخسار پر لہراتی رہے تو؟..... اس نے کنگھی اٹھائی..... اس کی قمیص کے سب بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو گریبان کا کچھ حصہ بھی اوپر کو اٹھ گیا..... وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر کو دیکھنے لگی۔ امّی سو رہی تھیں۔ عمرو گھر پر نہیں تھا۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ دیر تک بیٹھی رہی۔

پھر وہ غسل خانے میں نہانے کے لیے گئی۔ وہ چپ تھی۔ کچھ مطمئن تھی، کچھ خوش تھی۔ کچھ بے چین سی تھی۔ غسل خانہ کی دیواروں پر صابن ملے چھینٹوں سے عجب عجب صورتیں بن گئی تھیں۔ جن، پریاں، جنگل، پہاڑ، دریا، جھیلیں سبھی کچھ بنا ہوا تھا۔ وہ دیر تک ان نقوش کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے پہلے کبھی ان کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ لیکن اب جوں جوں وہ غور کرتی ان بے ڈھنگے خطوط کی نئی سے نئی صورتیں بنتی چلی جاتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب جس جگہ صابن دانی پڑی رہتی تھی صابن کی جھاگ بہہ جانے سے طویل لکیریں ایسے دکھائی دیتی تھیں جیسے سفیدے کے درخت تنے کھڑے ہوں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتی رہی..... پھر اس نے قمیص اتار دی۔ کھڑکی کے پٹ ذرا سے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں سے صحن کے کونے میں کھڑا ہوا پپیتے کا پیڑ نظر آرہا تھا دو پپیتے بالکل پک گئے تھے۔ گول، گول، چکنے، باہر سے سخت اندر سے نرم۔ ان کا رنگ بھی کیسا دل کش تھا۔ کم از کم یہ دونوں تو اس قابل تھے کہ ان کو توڑ لیا جاتا—— پیڑ کے بڑے بڑے پتے ہل رہے تھے۔ جب پتّے لرز کر ادھر اُدھر ہوجاتے تو دھوپ

کھڑکی کے نارنجی رنگ کے شیشوں میں سے گزر کر اندر داخل ہوتی۔ اور اس کے خوش وضع سفیدی مائل گندم گوں شانے پہ جھلملانے لگتی۔ اس کے جسم کی جلد کا رنگ نارنجی رنگ میں گھل مل کر نیا روپ دھار لیتا تھا۔

ممتاز کے امتحانات ختم ہوگئے۔

آخری پرچہ ختم ہوتے ہی اس نے واپس جانے کی تیاری شروع کردی۔ اس کے ابا نے ہدایت کردی تھی کہ امتحانات کے بعد فوراً واپس چلے آنا۔ اس کی جو چھوٹی بڑی چیز گھر کے اندر پڑی رہ گئی تھی وہ عمرد ایک ایک کر کے مردانے میں لے گیا۔ اس کا تولیہ، کوئی گرا پڑا رومال یا ٹائی یا پن — ہر چیز عمرد بڑی بے جگری سے اٹھائے لیے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ چھوٹے پیمانے پر...... چنگیز خاں بنا ہوا تھا۔ پھر اُسے تانگہ لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس دوران میں ابا کے بے باک، مسرت انگیز اور بلند قہقہے سنائی دیتے رہے۔ تانگہ آنے پر اس میں سامان رکھا گیا اور پھر تانگہ چرخ چوں کر کے چلا اور گرجل کے درختوں کے قریب سے گذرتا ہوا پکی سڑک کی طرف گھوم گیا۔

اور نزہت............

یہ افسانہ پہلی بار 'ساقی' جنوری 1946 میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ "سنہرا دیس" میں شامل ہے۔

جب دوپہر کے وقت امّی سو گئیں...... تو نزہت نے اندر باہر کے کئی چکّر لگائے۔ اور کوؤں کی کائیں کائیں سنتی رہی...... اس نے صبح سے غسل ہی نہ کیا تھا۔ وہ بڑے آئینہ کے سامنے بیٹھ گئی۔ ہفتہ بھر سے اُسے بال تک دھونے کی فرصت نہ ملی تھی۔ اس نے سوچا کہ وہ بال دھو ہی ڈالے...... چوٹی کھول کر وہ آئینے میں اپنے بالوں کو دیکھنے لگی۔ یہ بال کیسے ہیں؟ بڑے تو نہیں...... اچھے ہیں، بہت اچھے ہیں...... اگر بالوں کی ایک لٹ اس جگہ ہو تو ؟...... یا ایک زلف چوٹی کی گرفت سے آزاد رہ کر رخسار پر لہراتی رہے تو؟...... اس نے کنگھی اٹھائی...... اس کی قمیص کے سب بٹن کھلے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھایا تو گریبان کا کچھ حصہ بھی اوپر کو اٹھ گیا...... وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر کو دیکھنے لگی۔ امّی سو رہی تھیں۔ عمرو گھر پر نہیں تھا۔ ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ دیر تک بیٹھی رہی۔

پھر وہ غسل خانے میں نہانے کے لیے گئی۔ وہ چپ تھی۔ کچھ مطمئن تھی، کچھ خوش تھی۔ کچھ بے چین سی تھی۔ غسل خانہ کی دیواروں پر صابن ملے چھینٹوں سے عجب عجب صورتیں بن گئی تھیں۔ جن، پریاں، جنگل، پہاڑ، دریا، جھیلیں سبھی کچھ بنا ہوا تھا۔ وہ دیر تک ان نقوش کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے پہلے کبھی ان کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا۔ لیکن اب جوں جوں وہ غور کرتی ان بے ڈھنگے خطوط کی نئی سے نئی صورتیں بنتی چلی جاتی تھیں۔ کھڑکی کے قریب جس جگہ صابن دانی پڑی رہتی تھی صابن کی جھاگ بہہ جانے سے طویل لکیریں ایسے دکھائی دیتی تھیں جیسے سفیدے کے درخت تنے کھڑے ہوں۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف دیکھتی رہی...... پھر اس نے قمیص اتار دی۔ کھڑکی کے پٹ ذرا سے کھلے ہوئے تھے۔ ان میں سے صحن کے کونے میں کھڑا ہوا پپیتے کا پیڑ نظر آ رہا تھا دو پپیتے بالکل پک گئے تھے۔ گول، گول، چکنے، باہر سے سخت اندر سے نرم۔ ان کا رنگ بھی کیسا دل کش تھا۔ کم از کم یہ دونوں تو اس قابل تھے کہ ان کو توڑ لیا جاتا—— پیڑ کے بڑے بڑے پتے ہل رہے تھے۔ جب پتے لرز کر ادھر اُدھر ہوجاتے تو دھوپ

کھڑکی کے نارنجی رنگ کے شیشوں میں سے گزر کر اندر داخل ہوتی۔ اور اس کے خوش وضع سفیدی مائل گندم گوں شانے پر جھلملانے لگتی۔ اس کے جسم کی جلد کا رنگ نارنجی رنگ میں گھل مل کر نیا روپ دھار لیتا تھا۔

ممتاز کے امتحانات ختم ہو گئے۔

آخری پرچہ ختم ہوتے ہی اس نے واپس جانے کی تیاری شروع کردی۔ اس کے ابا نے ہدایت کردی تھی کہ امتحانات کے بعد فوراً واپس چلے آنا۔ اس کی جو چھوٹی بڑی چیز گھر کے اندر پڑی رہ گئی تھی وہ عمرو ایک ایک کر کے مردانے میں لے گیا۔ اس کا تولیہ، کوئی گرا پڑا رومال یا ٹائی یا پن — ہر چیز عمرو بڑی بے جگری سے اٹھائے لیے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ چھوٹے پیمانے پر...... چنگیز خاں بنا ہوا تھا۔ پھر اُسے تانگہ لانے کے لیے بھیجا گیا۔ اس دوران میں ابا کے بے باک، مسرت انگریز اور بلند قہقہے سنائی دیتے رہے۔ تانگہ آنے پر اس میں سامان رکھا گیا اور پھر تانگہ چرخ چوں کر کے چلا اور گڑھل کے درختوں کے قریب سے گذرتا ہوا پکی سڑک کی طرف گھوم گیا۔

اور نزہت............

یہ افسانہ پہلی بار 'ساقی' جنوری 1946 میں شائع ہوا۔ افسانوی مجموعہ ''سنہرا دیس'' میں شامل ہے۔

پامسٹ

اب تو خیر میں نے اپنا کاروبار بہت بڑھا لیا ہے اور ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے کوئی کام شروع نہیں کیا تھا۔ یوں ہی آوارہ گھوما کرتا تھا۔ میں بے کار تھا، لیکن میرا دماغ بے کار نہیں تھا۔ دن رات ایک ہی فکر تھی۔

دسویں جماعت پاس کی تھی۔ ایف اے میں داخل ہوا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ میرے اخراجات اس قدر زیادہ تھے کہ پتا جی نے مجھے خرچ کی بجائے یہ رائے دی کہ مجھے کوئی کام کرنا چاہئے۔

جہاں تک نوکری کا معاملہ تھا۔ دسویں پاس کو تیس پینتیس روپے سے زیادہ کی ملازمت مل ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پتا جی کا اصرار تھا کہ جیسی نوکری ملے کرلوں۔ انہیں بڑی مشکل سے میں نے یہ بات سمجھائی کہ اس قسم کی نوکریوں میں کچھ نہیں دھرا۔ بجائے نوکری کے کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔ وہ دیہاتی اور ان پڑھ شخص تھے۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں اس بات پر رضا مند کر لیا۔

اب سوال یہ تھا کہ کاروبار کیا جائے تو کس قسم کا۔

جنگ دو اڑھائی برس سے زور شور سے جاری تھی۔ تجارت پیشہ لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے تھے۔ ہمارے پاس زیادہ سرمایہ تو تھا نہیں۔ یہی طے پایا کہ امرت سر میں کوئی

دکان ڈھونڈ کر خاص گھی کا کاروبار شروع کیا جائے۔

ہمارا خاندان گاؤں ہی میں رہتا تھا۔ پتا جی کا ارد گرد کافی رسوخ تھا۔ گھی آسانی سے فراہم ہوسکتا تھا۔ ایک ہاتھ دے اور دوسرے ہاتھ والا معاملہ تھا۔ کوئی دقت پیش نہ آسکتی تھی اور پھر گھی کے ''خلوص'' کے بارے میں آج کل حواس خمسہ کہاں تک کام آسکتے ہیں؟ چنانچہ میں فوراً امرت سر چلا گیا۔

جنگ کے زمانے میں اگر ایک طرف گھی نہیں ملتا تھا تو دوسری طرف دوکانیں بھی نایاب تھیں۔ ویسے تو شہر میں جس طرف نظر دوڑاتا دوکانیں ہی دوکانیں تھیں۔ پہلے بڑے بازار میں کوشش کی گئی۔ پھر چھوٹے چھوٹے بازاروں میں تلاش کی گئی۔ لیکن دوکان نہ ملی پر نہ ملی۔

اس طرح امرتسر میں چار پانچ روز آوارگی میں گذر گئے۔ پتا جی نے تھوڑے سے روپے بھیج دیئے تھے۔ جو میرے لیے ناکافی تھے۔ واپس گاؤں کو جانے سے دل گھبراتا تھا۔ پتا جی کے خط پہ خط چلے آتے تھے کہ اگر دوکان نہیں ملتی تو واپس چلے آؤ۔ میں یہی جواب دیتا کہ لڑائی کی وجہ سے دوکانوں کی قلت ہے۔لیکن میرا موقع پر رہنا بہت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دکان مل رہی ہو اور میری غیر موجودگی میں ہاتھ سے نکل جائے۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ڈاکیہ خط لایا۔ خط پتا جی کی طرف سے تھا۔ لکھا تھا:

''.......... میں شیر کوٹ میں ایک بیاہ کے سلسلے میں گیا تھا۔ وہاں میرے پرانے دوست سردار اندر جیت سنگھ مل گئے۔ اتفاق کی بات کہ تمہارا ذکر بھی ہوا۔ وہ کہتے ہیں کہ امرتسر کے بھنڈی بازار میں ان کے سالے کی اپنی دوکانیں ہیں۔ وہ ضرور اپنی دوکانوں میں سے کوئی دوکان دے دے گا۔ برخوردار! تم اس کو ملو۔ اس کا نام سردار جگندر سنگھ گھڑی ساز ہے۔ اس سے مل کر دوکان کے لیے کہو امید ہے کہ تمہارا کام بن جائے گا۔ ادھر سردار اندر جیت سنگھ نے بھی ان کو ایک چٹھی لکھ دی ہے۔ بار بار تاکید ہے۔ سستی نہ کرنا۔ میرا خط ملتے ہی ان سے ملو......

اسی کے بعد دیسی طریقہ کے مطابق بار بار تاکید ..... اس خط کو تار سمجھ وغیرہ لکھا ہوا تھا۔

میں ذرا دیر سے اٹھنے کا عادی ہوں۔ لیکن اس دن میں صبح آٹھ ہی بجے اٹھ بیٹھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ بستر سے نکلنے کو دل تو نہ چاہتا تھا۔ لیکن مجبوراً اٹھ کر کپڑے پہنے۔ احتیاطاً اپنا چسٹر بھی جو بھلے دنوں کی یاد تھا۔ پہن لیا۔ ہاتھوں پر دستانے چڑھائے۔ دھوپ کا چشمہ لگایا اور جھنڈی بازار کا پتہ پوچھتا ہوا چل دیا۔

والد صاحب نے لکھا تھا کہ وہ گھڑیوں کی دوکان کرتے ہیں۔ میں جگندر سنگھ گھڑی ساز کے بورڈ کا دل میں خیال رکھتے ہوئے جھنڈی بازار میں سے گذرنے لگا۔ جب بازار ختم ہوگیا۔ تو بڑا تعجب ہوا کہ آخر جگندر سنگھ گھڑی ساز کہاں غائب ہوگئے۔ چنانچہ الٹے پاؤں آنا پڑا۔ اب کے پہلے سے بھی زیادہ غور کے ساتھ نیچے اوپر دیکھتا ہوا چلا جارہا تھا کہ معاً اوپر کی منزل پر ایک چھوٹے سے بورڈ پر نظر پڑی۔

سردار جگندر سنگھ گھڑی ساز (سند یافتہ)

اب میں اوپر جانے کا رستہ ڈھونڈنے لگا۔ یہ بھی ایک معمہ ہی ثابت ہوا۔ بازار میں ایک تنور تھا۔ کونے پر سائن بورڈ لکھنے والے کی ایک دوکان تھی۔ ارد گرد گھوم کر دیکھا۔ دوکانداروں سے دریافت کیا تب کہیں معلوم ہوا کہ حضرت نے سیڑھیاں کسی نائی کو کرایہ پر دے رکھی ہیں۔

میں اس نائی کی آنکھ بچا کر سیڑھیوں پر چڑھ گیا۔ جب سیڑھیاں بائیں ہاتھ کو گھومیں تو دیکھا کہ سامنے ایک دروازہ ہے جس پر قفل پڑا ہوا ہے۔ دروازے کے اوپر ایک چھوٹا سا سائن بورڈ ٹنگا ہے جس پر لکھا تھا:

Palmistic Researches.

گویا اس کمرے میں ہاتھ کی ریکھاؤں کی ریسرچ کی جاتی تھی۔ میں بوکھلا کر

پامسٹ

اب تو خیر میں نے اپنا کاروبار بہت بڑھا لیا ہے اور ہر طرح سے مطمئن ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں نے کوئی کام شروع نہیں کیا تھا۔ یوں ہی آوارہ گھوما کرتا تھا۔ میں بے کار تھا، لیکن میرا دماغ بے کار نہیں تھا۔ دن رات ایک ہی فکر تھی۔

دسویں جماعت پاس کی تھی۔ ایف اے میں داخل ہوا۔ بڑی شاہانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ میرے اخراجات اس قدر زیادہ تھے کہ پتا جی نے مجھے خرچ کی بجائے یہ رائے دی کہ مجھے کوئی کام کرنا چاہیے۔

جہاں تک نوکری کا معاملہ تھا۔ دسویں پاس کو تیس پینتیس روپے سے زیادہ کی ملازمت مل ہی نہیں سکتی تھی۔ لیکن پتا جی کا اصرار تھا کہ جیسی نوکری ملے کرلوں۔ انہیں بڑی مشکل سے میں نے یہ بات سمجھائی کہ اس قسم کی نوکریوں میں کچھ نہیں دھرا۔ بجائے نوکری کے کوئی کاروبار شروع کیا جائے۔ وہ دیہاتی اور ان پڑھ شخص تھے۔ بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر انہیں اس بات پر رضامند کر لیا۔

اب سوال یہ تھا کہ کاروبار کیا جائے تو کس قسم کا۔

جنگ دو اڑھائی برس سے زور شور سے جاری تھی۔ تجارت پیشہ لوگوں نے خوب ہاتھ رنگے تھے۔ ہمارے پاس زیادہ سرمایہ تو تھا نہیں۔ یہی طے پایا کہ امرت سر میں کوئی

سیڑھی اترنے لگا تو اس کے قریب ہی ایک دوسرا دروازہ دکھائی دیا۔ ذرا گردن بڑھائی تو دیکھا کہ یہ دوسرا دروازہ ایک کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ چنانچہ قدم ناپتا ہوا آگے بڑھا۔

یہ ایک نیچی چھت والا تقریباً پندرہ فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا کمرہ تھا۔ پرلے کونے میں داہنی طرف ایک میز اور اس کے اوپر شیشے کا بنا ہوا ایک کیس نظر آ رہا تھا۔ میز کے نیچے سے دو ٹانگیں ایک دوسری کے اوپر لگی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ میز کے قریب ہی بازوؤں والی دو کرسیاں بچھی تھیں۔ بس اس کے علاوہ کمرہ بالکل خالی تھا۔

میں نے سگریٹ پھینک کر پاؤں سے کچل دیا۔ اور رومال سے منہ پونچھتا ہوا آگے بڑھا۔

سب سے پہلے تو میری متجسس نظریں اس شخص پر پڑیں جو میز کے پیچھے دبکا بیٹھا تھا۔ وہ سکھ تھا۔ اس نے پگڑی باندھ رکھی تھی اور اس کی داڑھی پر ایک پٹی سی بندھی تھی۔ جسے ٹھاٹھ کہتے ہیں۔ سردار صاحب کا ڈیل ڈول تو ویسا ہی تھا۔ جیسا ہونا چاہئے لیکن صورت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ٹھاٹھے سے ان کا آدھے سے زیادہ چہرہ ڈھنپا ہوا تھا۔ البتہ مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ٹھاٹھے کی وجہ سے گال سمٹ کر ابھر آئے تھے اور آنکھیں اندر کو گھس گئی تھیں۔

جتنے عرصہ میں میں ان کی صورت جائزہ لیتا رہا۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے اطلاعاً مصنوعی کھانسی کی آواز نکالی۔

ان کے ٹھاٹھے میں سے مبہم سی آواز آئی۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ست سری اکال!''

''س سری کال'' انہوں نے جواب دیا۔ ''کرسی پر بیٹھ جایئے۔''

اگر وہ صرف بیٹھ جایئے کہہ دیتے تو بھی میں کرسی ہی پر بیٹھتا۔ خیر!

''کہیے۔''

میں نے ذرا اہتمام کے ساتھ گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔'' مجھے اپنے پتا جی کی ایک چٹھی موصول ہوئی تھی۔ کل شام انہوں نے ہدایت کی تھی کہ میں جناب سے ملوں۔ شاید پچھلے دنوں آپ کو بھی اپنے...... سردار اندر جیت سنگھ سے کوئی چٹھی موصول ہوئی ہو۔ میں اسی کام سے حاضر ہوا تھا۔

سردار صاحب نے ناک میں بولتے ہوئے کہا۔'' جی ہاں! مجھے بھی چٹھی ملی تھی۔ میں خود آپ کے کام کی بابت غور کر رہا تھا۔''

ناک میں بولنے کا باعث ان کا گنگنا پن نہیں تھا۔ بلکہ وہ اسے محض ایک امیرانہ ادا سمجھتے تھے۔

''جی۔ اگر آپ نے غور کر لیا ہو۔ تو فرمایئے۔ میرے لیے کوئی امید ہے......''

''اوہم .... دیکھئے بابو جی میں ذرا صاف گو آدمی ہوں......''

مجھے معلوم ہو گیا کہ دوکان نہیں ملے گی۔

''............ آپ سمجھے نا! میں لگی لپٹی باتیں پسند نہیں کرتا۔ آپ سمجھ گئے؟''

''جی'' میں نے جواب دیا۔''یہاں تک تو سمجھ گیا ہوں۔''

''سو اب آپ خود غور کیجئے۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ دکانیں ملتی نہیں۔ جو دوکانیں تھیں وہ لگی ہوئی ہیں۔ میری دوکانوں میں سے ایک بھی خالی نہیں ہے......''

''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ان دوکان داروں کو اپنی دوکانوں سے نکال نہیں سکتے۔ اس لیے آپ اس معاملہ میں میری مدد کرنے سے معذور ہیں......''

''جی نہیں میں جسے چاہوں اپنی دوکان سے نکال کر باہر کروں۔ واہ یہ کیا بات کہہ دی آپ نے ......''

میں گھبرایا۔'' جی نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ سرکاری قانون ہی ایسا ہے کہ کسی کو دوکان سے باہر نہیں نکالا جا سکتا ہے......''

نیچے اترنے لگا تو اس کے قریب ہی ایک دوسرا دروازہ دکھائی دیا۔ ذرا گردن بڑھائی تو دیکھا کہ یہ دوسرا دروازہ ایک کمرے کی طرف کھلتا تھا۔ چنانچہ قدم ناپتا ہوا آگے بڑھا۔

یہ ایک نیچی چھت والا تقریباً پندرہ فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا کمرہ تھا۔ پرلے کونے میں داہنی طرف ایک میز اور اس کے اوپر شیشے کا بنا ہوا ایک گیس نظر آ رہا تھا۔ میز کے پیچھے سے دو ٹانگیں ایک دوسری کے اوپر لگی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ میز کے قریب ہی بازوؤں والی دو کرسیاں بچھی تھیں۔ بس اس کے علاوہ کمرہ بالکل خالی تھا۔

میں نے سگریٹ پھینک کر پاؤں سے کچل دیا۔ اور رومال سے منہ پونچھتا ہوا آگے بڑھا۔

سب سے پہلے تو میری متجسس نظریں اس شخص پر پڑیں جو میز کے پیچھے دبکا بیٹھا تھا۔ وہ سکھ تھا۔ اس نے پگڑی باندھ رکھی تھی اور اس کی داڑھی پر ایک پٹی سی بندھی تھی۔ جسے ٹھاٹھ کہتے ہیں۔ سردار صاحب کا ڈیل ڈول تو ویسا ہی تھا۔ جیسا ہونا چاہئے لیکن صورت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ ٹھاٹھے سے ان کا آدھے سے زیادہ چہرہ ڈھنپا ہوا تھا۔ البتہ مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح سیدھی اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ ٹھاٹھے کی وجہ سے گال سمٹ کر ابھر آئے تھے اور آنکھیں اندر کو گھس گئی تھیں۔

جتنے عرصہ میں میں ان کی صورت جائزہ لیتا رہا۔ انہوں نے نگاہ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ میں نے اطلاعاً مصنوعی کھانسی کی آواز نکالی۔

ان کے ٹھاٹھے میں سے مبہم سی آواز آئی۔

''کیا بات ہے؟''

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''ست سری اکال!''

''س سری کال'' انہوں نے جواب دیا۔ ''کرسی پر بیٹھ جایئے۔''

اگر وہ صرف بیٹھ جایئے کہہ دیتے تو بھی میں کرسی ہی پر بیٹھتا۔ خیر!

''کہیے۔''

میں نے ذرا اہتمام کے ساتھ گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔'' مجھے اپنے پتا جی کی ایک چٹھی موصول ہوئی تھی۔ کل شام انہوں نے ہدایت کی تھی کہ میں جناب سے ملوں۔ شاید پچھلے دنوں آپ کو بھی اپنے...... سردار اندر جیت سنگھ سے کوئی چٹھی موصول ہوئی ہو۔ میں اسی کام سے حاضر ہوا تھا۔

سردار صاحب نے ناک میں بولتے ہوئے کہا۔'' جی ہاں! مجھے بھی چٹھی ملی تھی۔ میں خود آپ کے کام کی بابت غور کر رہا تھا۔''

ناک میں بولنے کا باعث ان کا گنگنا پن نہیں تھا۔ بلکہ وہ اسے محض ایک امیرانہ ادا سمجھتے تھے۔

''جی۔ اگر آپ نے غور کر لیا ہو۔ تو فرمایئے۔ میرے لیے کوئی امید ہے......''

''اوہم .... دیکھئے بابو جی میں ذرا صاف گو آدمی ہوں......''

مجھے معلوم ہو گیا کہ دوکان نہیں ملے گی۔

''.......... آپ سمجھے نا! میں لگی لپٹی باتیں پسند نہیں کرتا۔ آپ سمجھ گئے؟''

''جی'' میں نے جواب دیا۔''یہاں تک تو سمجھ گیا ہوں۔''

'' سو اب آپ خود غور کیجئے۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ دکانیں ملتی نہیں۔ جو دوکانیں تھیں وہ لگی ہوئی ہیں۔ میری دوکانوں میں سے ایک بھی خالی نہیں ہے......''

'' آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ ان دوکان داروں کو اپنی دوکانوں سے نکال نہیں سکتے۔ اس لیے آپ اس معاملہ میں میری مدد کرنے سے معذور ہیں......''

''جی نہیں میں جسے چاہوں اپنی دوکان سے نکال کر باہر کروں۔ واہ یہ کیا بات کہہ دی آپ نے ......''

میں گھبرایا۔'' جی نہیں۔ میرا مطلب تھا کہ سرکاری قانون ہی ایسا ہے کہ کسی کو دوکان سے باہر نہیں نکالا جا سکتا ہے......''

اس پر انہوں نے گرم ہو کر کہا۔'' میں کوئی قانون وانون نہیں جانتا۔ میں جس دوکان دار کو دل چاہے شام سے پہلے پہلے نکال دوں۔ میں کیا نکالوں گا۔ وہ خود ہی بھاگ جائے گا۔

میں ذرا اور قسم کا آدمی ہوں.....''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ آدمی تو خیر آپ دکھائی دے ہی رہے ہیں۔ البتہ ''قسم'' ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔ در اصل مجھے سخت مایوسی ہوئی تھی۔ پتہ نہیں سردار صاحب نے میرے چہرے پر کون سی پوشیدہ تحریر پڑھ لی۔ بڑی نرمی سے بولے۔'' دیکھئے نابابو جی! فرض کیجئے آپ ہی نے میری دوکان کرایہ پر لے رکھی ہو۔ اگر آپ مجھے وقت پر کرایہ دے دیا کریں۔ اور مجھے آپ سے کوئی شکایت نہ ہو تو پھر نکال سکتا ہوں۔ آپ خود ہی غور کیجئے۔''

اس کی یہ مدلل گفتگو سن کر میرے دل کی رنجش دور ہوگئی۔ میں نے سوچا در حقیقت سردار صاحب بہت شریف آدمی ہیں۔

انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' آپ سمجھ گئے نا! میری دوکانوں میں سے ابھی کوئی دوکان ملنے کی امید ہی نہیں ہوسکتی۔ میں اس معاملہ میں بہت مجبور ہوں۔ البتہ میں اور کوئی دوکان ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں۔ آج کل دوکان کا ملنا ناممکنات میں سے ہے۔ لیکن میں انتہائی کوشش کروں گا۔

اس کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ اب گفتگو تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اب مجھے یہاں سے چل دینا چاہئے۔ لیکن پھر ایک بات یاد آگئی۔ میں نے کہا۔'' سردار صاحب! اگر آپ برا نہ مانیں تو میں آپ سے ایک بات دریافت کرلوں۔''

''شوق سے'' ان کے ٹھاٹھے میں پوشیدہ منہ سے آواز آئی۔

'' یہ سیڑھیوں کے سامنے جو آپ نے پلاسٹک ریسرچ کا بورڈ لگا رکھا ہے۔ اس کا

مقصد کیا ہے۔ میرا مطلب ہے یہاں کوئی صاحب اس فن میں ریسرچ کیا کرتے ہیں۔''

انہوں نے میرا یہ سوال سنا تو بس نہال ہو کر پہاڑی کوے کی طرح پھول گئے۔ اسی وقت گھڑیوں کا کام بند کر دیا اور کرسی گھما کر رخ میری طرف کر لیا۔ اور تمام تر توجہ میری طرف مرکوز کرتے ہوئے فرمایا۔'' میں پامسٹری میں آج کل ریسرچ کر رہا ہوں......''

انہوں نے مجھے اور زیادہ مرعوب کرنے کے لیے ٹھا ٹھا اُتار کر علاحدہ رکھ دیا۔

میں نے مرعوب ہو کر کہا۔'' آپ...... آپ ریسرچ کر رہے ہیں؟''

'' بندہ پرور''

میں پتہ نہیں کس جذبہ کے ماتحت کچھ بول ہی نہ سکا۔

انہوں نے ہاتھ سے داڑھی سنوارتے ہوئے کہا۔'' اس فن میں میری معلومات بہت وسیع ہیں...... اب میں نے اعلا پیمانے پر ریسرچ کا کام شروع کر دیا ہے۔ مختصر الفاظ میں آپ یہ سمجھ لیجئے کہ میں ریسرچ سکالر ہوں۔''

میں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔

کہنے لگے۔'' مجھے لڑکپن ہی سے اس بات کا شوق تھا۔ میں نے ادھر اُدھر کی بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ لیکن اس وقت میرا علم بالکل ادھورا تھا۔ ایک مرتبہ میرا ایک دوست کہیں سے چیروCheroٍ (صحیح تلفظ کیرو ہے) کی کتاب لے آیا۔ میں نے اسے پڑھا تو میری آنکھیں کھل گئیں۔ تب مجھے پتہ چلا کہ اب تک میں اندھیرے میں ہی ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا۔ دل کو افسوس بھی ہوا کہ اب تک ساری محنت بس بے کار ثابت ہوئی۔ لیکن خوشی بھی ہوئی کہ آخر صحیح رستہ نظر آ ہی گیا...... میں کیا عرض کروں میں اس فن کا شیدائی ہوں، دیوانہ ہوں۔ اس کا مجھ پر خبط سوار ہے......

اور دیکھئے۔ یہی انگریزوں اور ہم ہندوستانیوں میں فرق ہے۔ انگریز جو کام کریں گے۔ ساری قوت اس پر صرف کر دیں گے۔ لیکن ہم لوگ کوئی کام جان توڑ کر نہیں

کرتے۔ اسی لیے وہ لوگ ہم پر حکومت کر رہے ہیں.....''

میں نے کہا۔'' سردار صاحب! آپ تو چھپے رستم نکلے۔ کوئی شخص آپ کی ظاہرا صورت سے اس بات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ آپ اس قدر ''گنی گیانی'' ہوں گے۔

''بندہ پرور.......... دیکھئے جب میں نے دسویں پاس کرلی تو گھڑیاں کا یہ کام شروع کردیا۔ واہگورو کا دیا سب کچھ ہے۔ گھڑیوں کا کام تو وقت گذارنے کا حیلہ ہے اور میری اصلی دلچسپی پامسٹری ہی میں ہے.......... آپ میری اس بات کو یاد رکھئے کہ اس دنیا میں انسان کے اندر کوئی ایسا گن ضرور ہونا چاہئے جس سے وہ لوگوں کو اپنے پیچھے لگا سکے۔ آپ سمجھے نا؟ دراصل ہمیں سب انسانوں کی خدمت کرنی چاہئے۔ اسی میں ساری دنیا کا بھلا ہے۔ اگر ہر آدمی دوسرے کی خدمت پر کمر باندھ لے تو بس بیڑا پار ہے۔ بابو جی! آخر یہ دنیا کیا ہے۔ یہاں کی ہر چیز آنی جانی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ لوگ ایک دوسرے پر اس قدر ظلم کیوں کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے نفرت کیوں کرتے ہیں.......... میں صاف گو شخص ہوں..... معاف کیجئے گا۔ بابو جی! میں لگی لپٹی باتیں کرنا جانتا ہی نہیں۔ میں ایک سیدھا سادا شخص ہوں۔ مجھے ادھر اُدھر کی چالاکیاں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ گورو صاحب نے فرمایا ہے:

''باہروں دھوتی تو نبڑی

?...............................

باہروں دھوتی تو نبڑی''

انہوں نے اپنی پیشانی دباتے ہوئے کہا۔

''خیر اس وقت مجھے یہ شلوک یاد نہیں آرہا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ اگر کوئی چیز باہر سے دھلی ہوئی اور اندر سے گندی ہو تو پھر باہر کی صفائی کا فائدہ ہی کیا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔''سردار صاحب سچ مانئے مجھے آپ کے درشن کر کے بہت ہی خوشی ہوئی ہے۔ جیسے خیالات آپ کے ہیں۔ اگر سب لوگ

اسی طرح سوچنے لگیں تو پھر دنیا میں یہ دکھ یہ تکلیف اور پریشانی باقی نہ رہے۔''

''جی ہاں تو اس قسم کے خیالات تھے جن کی وجہ سے میں نے پامسٹری میں دلچسپی لینی شروع کی۔ لیکن میں نے یہ کام بڑی توجہ اور لگن کے ساتھ کیا۔ اور پھر واہگورو اکال پرکھ کی کرپا سے اب میں اس فن میں استاد سمجھا جاتا ہوں۔ آپ اسے بڑا بول نہ سمجھیں کہ ہندوستان بھر میں شاید ہی کوئی پامسٹ ہوگا۔ جو میرے پاس مجھے ملنے کے لیے نہ آیا ہو۔ کئی لوگ تو اس راستے سے گذرتے ہیں تو صرف مجھے ملنے کے لیے امرتسر میں کچھ روز ضرور ٹھہرتے ہیں اور بعض لوگ تو مدراس سے صرف مجھ ہی سے ملنے کے لیے پنجاب آتے ہیں۔''

ان کی یہ باتیں سن کر مجھے خیال آیا کہ میں بھی انہیں ہاتھ دکھا ہی دوں۔ پھر سوچا نہ معلوم ان کی بہت لمبی چوڑی فیس ہو۔ میں دے بھی نہ سکوں۔ اس لیے میں خاموش رہا۔

''بابو جی! دنیا میں قدر دانوں کی کچھ کمی نہیں۔ صرف انسان میں کوئی گن ہونا چاہئے۔ اب اپنی قدردانی کا حال اگر آپ کو بتاؤں تو شاید آپ یقین ہی نہ کریں۔ لیکن میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ پراچین بھارت میں ہمارے گورو، رشی منی وغیرہ لوگوں پر اس قدر اثر قائم کیسے کر لیتے تھے؟ کیوں ساری دنیا انہی کے نام کی مالا جپتی تھی۔ اس لیے کہ ان میں کچھ گن ہوتے تھے.......... دیکھئے نا! اس دنیا میں لوگ آپ کی بات پر اس وقت تک پوری توجہ نہیں دیں گے جب تک کہ آپ انہیں کوئی چمتکار نہ دکھائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ گورو صاحب نے چمتکار یا معجزہ دکھانا کبھی درست نہیں سمجھا۔ لیکن اس دنیا کے لوگ دوسرے طریقوں سے اچھی طرح سمجھتے بھی تو نہیں۔ کم از کم ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کوئی نہ کوئی بات پیدا ضرور کرنی چاہئے ورنہ اگر ان کے حق میں کوئی نیکی کرنا چاہیں تو بھی وہ آپ کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔

میں حیران تھا کہ یہ سردار صاحب تو فلاسفر نکلے۔ کون کہہ سکتا تھا کہ اس چھوٹے

سے کمرے میں معلق اتنے بڑے سردار صاحب ایسی ٹھوس اور مدلل گفتگو کرسکتے ہیں۔ انہوں نے میری بڑھتی ہوئی دلچسپی کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھڑکی میں سے سامنے کے مکان کی طرف رخ کر کے زور زور سے آوازیں دیں۔'' کاکا اوئے کاکا''

ایک آٹھ نو برس کا لڑکا آتا دکھائی دیا جس کے سر پر بالوں کا بڑا سا ڈھیلا ڈھالا جوڑا تھا۔ سردار جی نے پکار کر کہا۔'' بیٹا چائے لاؤ دو گلاس اور نمکین مٹھیاں بھی لیتے آنا۔''

اب ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگی تھی۔ ایسے موقع پر سردار جی کی اس برمحل تجویز سے دل بہت خوش ہوا۔ میں نے اظہار خوشنودی کی غرض سے ان کی باتوں میں اور بھی دلچسپی لینی شروع کردی۔ وہ ہنس کر بولے۔'' معاف کیجئے گا۔ میں آپ سے چائے کے لیے پوچھنا بھول ہی گیا تھا۔ سردی پڑ رہی ہے نا کڑا کے کی......''

'' جی کوئی مضائقہ نہیں'' میں نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔'' اگر صبح کا بھولا شام کو واپس آجائے تو پھر.........''

'' ہاہا...... جی تو میں کیا کہہ رہا تھا؟ ہاں، سو یہ بات ہے جناب عالی! اب مجھی کو دیکھئے اتنا تو آپ تسلیم کریں گے کہ آج کل ریل گاڑیوں میں بہت سخت ہجوم ہوتا ہے اگر کسی ڈبے میں داخل ہونے کی کوشش کیجئے تو اندر والے لوگ ٹھوکریں مارتے ہیں، لیکن مزے کی بات دیکھئے کہ اگر مجھے ایک دفعہ پائیدان پر پاؤں رکھنے کے لیے جگہ مل جائے تو دس منٹ کے اندر اندر میں ڈبہ کے اندر سب سے آرام دہ جگہ پر بیٹھا نظر آؤں گا.........

.........آپ کو تعجب ہو رہا ہے۔ جی؟.........

پچھلے بدھ وار ہی کی تو بات ہے۔ مجھے ذرا لاہور تک جانا پڑا۔ اسٹیشن تک پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہوگئی۔ جب ٹکٹ لے کر اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ گاڑی میں تل پھینکنے کو بھی جگہ نہ تھی۔ ڈبے تو خیر بھرے ہوئے تھے ہی بعض لوگ چھت پر جا بیٹھے اور بیسیوں

آدمی بھڑوں کی طرح دروازوں کی سلاخوں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ میں پلیٹ فارم پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوم گیا۔ لیکن جناب کوئی جگہ نظر نہ آئی۔ گاڑی کے چلنے میں ایک آدھ منٹ ہی باقی رہ گیا تھا۔ خیر جناب میں نے بھی دھینگا مشتی کر کے دروازے کا ہینڈل پکڑ لیا اور پائیدان پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ جو پہلے کھڑے تھے وہ لگے بڑبڑانے۔ میں نے ان میں سے ایک کا ہاتھ دیکھ کر پتے کی بات بتا دی۔ قریب کھڑے ہوئے دوسرے شخص نے بھی ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اسے بھی ایک آدھ بات بتا دی۔ گاڑی کے اندر کھڑے ہوئے ایک شخص نے بھی مجھے ہاتھ دکھانا چاہا۔ میں ذرا آگے سرک گیا۔ بس اس طرح ہاتھ دیکھتا ہوا میں گاڑی کے اندر داخل ہوا اور لوگوں نے میرے لیے جگہ بنا دی اور میں آرام سے بیٹھ گیا۔ کئی امیر آدمی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ہاتھ دکھائے۔ غرض کیا عرض کروں، کس قدر مزا آیا۔ میں ٹھاٹھ سے ایک جگہ بیٹھا ہوا لوگوں کے ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ وہی لوگ جو چند منٹ پہلے مجھے ٹھوکریں مارنے پر آمادہ تھے۔ اب مجھے آنکھوں پر بٹھا رہے تھے۔ دیکھا آپ نے ...... دنیا کا تو یہی رویہ ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اندر کوئی گن پیدا کرے۔"

میں نے آداب بجا لاتے ہوئے کہا۔ دھنیہ ہو مہاراج، دھنیہ ہو۔"

اسی طرح وہ بڑی تفصیل کے ساتھ اس مشکل فن میں اپنی جان توڑ کوششوں کا ذکر کرتے رہے۔ جب دو گلاس چائے اور ان کے قول کے مطابق نمکین مٹھیاں بھی آگئیں تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ ان کی زبان منہ سے نکل کر ناک کی نوک سے چھو گئی۔

"لیجئے بابو صاحب! میں آپ کو اور بات سناتا ہوں۔"

اب میرے ہاتھ دستانوں میں کھجلانے لگے۔ میں نے دستانے اُتار کر پرے رکھ دیئے۔

"جی! — ایک مرتبہ میں انبالہ اسٹیشن پر کھڑا تھا۔ امرتسر کو جانے والی گاڑی کا انتظار تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے۔

میرے ہمراہ میرا ایک دوست بھی تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے پامسٹری سے دلچسپی ہے۔ چنانچہ گاڑی کے انتظار میں جب ہم بنچ پر بیٹھے ہوئے تھے تو اس فن شریف کا ذکر شروع ہوگیا۔ میں نے جب ذرا اس کی اہمیت کا ذکر کیا تو بس صاحب وہ اسے مبالغہ سمجھے۔ مین نے کہا۔ حضور! دکھادوں تماشہ؟ بولے دکھاؤ۔ پھر کیا تھا، میں نے اٹھ کر ایک اچھے خاصے جنٹل مین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہاتھ دیکھتے ہی چند پتے کی باتیں ایسی بتائیں کہ وہ میرے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنی دیر میں اور بھی بہت سے لوگ جمع ہوگئے۔ ان میں سے ایک اور سفید پوش حضرت نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جب انہیں باتیں بتائیں تو حضرت حیران رہ گئے۔ اب کیا تھا اور لوگ بھی ہاتھ بڑھانے لگے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں سب کا ہاتھ دیکھوں گا۔ لیکن دو ہی دو باتیں بتاؤں گا وہ بڑے خوش ہوئے لیکن اتنا صبر کہاں۔ معلوم کہاں سے اتنے لوگ آن جمع ہوئے۔ وہ مجھ پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ صاحب! کیا کہوں میں کس قدر پریشان ہوا۔ یہاں تک کہ مجھے آخر کار بھاگتے ہی بنی۔ اب تماشہ دیکھئے۔ آگے آگے میں پیچھے پیچھے ہجوم بڑی مشکل سے میری جان چھوٹی...... میرا ساتھی بس حیران ہی رہ گیا۔ اس دن وہ گاڑی بھی رہ گئی اور ہم دوسرے دن گاڑی پر سوار ہوسکے۔''

میری حیرانی کی بھی کچھ حد نہ رہی۔ میں نکھیوں سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا۔ نہ معلوم میرے ہاتھوں میں کیا لکھا ہو۔ سردار صاحب بولتے چلے گئے...... یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اسے خاص اہمیت دی جانی چاہئے۔ ہاتھ کی لکیروں سے انسان کے کردار کا بخوبی پتہ چل جاتا ہے۔ اس کی خوبیاں اور خامیاں صاف نظر آنے لگتی ہیں؟ آپ پوچھیں گے کہ اس کا فائدہ ہی کیا تو جناب فرض کیجئے ایک شخص کاروبار کرتا ہے۔ حالانکہ وہ کاروبار کرنے کا اہل نہیں ہے۔ وہ بجائے اس کے اگر نوکری کرے تو زیادہ کامیاب رہے۔ ابھی دور کیوں جاتے ہو۔ میرے بڑے بھائی صاحب کا قصہ سنیے:

پہلے وہ دندان سازی کا کام کرتے تھے۔ ادھر نکڑ پر ان کی دوکان تھی۔ بابو جی آپ سچ مانئے ڈھائی سال تک وہ اس دوکان میں رہے۔ لیکن جناب کیا مجال جو کوئی گاہک پھٹک بھی جائے۔ یعنی یوں ہی کوئی بھولا بھٹکا گاہک تو خیر آپ جانے ہی دیجئے۔ ان کی روٹی بھی مشکل ہی سے چلتی تھی۔ خیر صاحب ایک دن میں نے ان کا ہاتھ دیکھا۔ میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ حضرت کس دھیان میں ہیں۔ کاروبار میں آپ کو کوئی فائدہ وائدہ ہو ہی نہیں سکتا۔ بڑے پریشان ہوئے میں نے کہا۔ بھائی صاحب ملازمت اختیار کیجئے...... خیر جناب میرے بہت کہنے سننے پر انہوں نے دوکان کا کام چھوڑ کر معمولی مستری بن گئے۔ لیجئے صاحب ترقی کرتے کرتے اب وہ انجینئر بن گئے۔ خوب روپیہ بٹورتے ہیں۔ کیا عزت ہے کیا شان ہے، اپنا مکان بھی بنوا لیا ہے.......... اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں پامسٹری سے مدد لی جاسکتی ہے۔ مثلاً چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ بچوں کے ماں باپ انہیں زبردستی کوئی نہ کوئی مضمون پڑھواتے ہیں حالانکہ بچے کی طبیعت اور اس کے طبعی رجحان کے مطابق ہی سب کام کرنے چاہئیں۔ اس معاملے میں پامسٹری سے بڑھ کر کسی اور چیز سے مدد نہیں مل سکتی۔ سمجھے آپ، کوئی لڑکا سائنسداں بن سکتا ہے۔ کوئی آرٹسٹ کوئی چور کوئی کاروباری اور کوئی لیڈر یہ سب باتیں ان کے ہاتھ دیکھنے سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ غور فرمایئے کہ اگر ہم اس تجویز کے مطابق عمل کرنے لگیں۔ تو کسی کو تکلیف نہ رہے۔ جس طرف بچے کا رجحان ہو وہی موقع اسے دیا جائے۔ بڑا ہو کر وہ یقیناً بہت قابل شخص بن جائے گا بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ عدالتوں میں بھی پامسٹری سے کام لینا چاہئے آپ کو شاید معلوم نہیں کتنے بے گناہ شخص پھانسی پر لٹکا دیئے جاتے ہیں۔ بعض بے چارے کئی کئی برس قید کی سزا پاتے ہیں۔ غلط ثبوت مل جانے پر ان بے چاروں کی زندگی تباہ ہوجاتی ہے۔ اس کا بھی سہل علاج یہی ہے کہ اچھے پامسٹوں کی خدمات حاصل کی جائیں صاحب دیکھئے صاف گو شخص ہوں۔ لگی لپٹی کہنے کی مجھے عادت ہی نہیں۔ آپ ہی کہئے کہ اگر کسی شخص کے ہاتھ سے یہ بات ظاہر ہو

کہ وہ ایک شریف اور نیک دل شخص ہے اور اس کا طبعی رجحان جرائم کی طرف ہے ہی نہیں تو پھر اس بے چارے کو سزا دینے سے کیا فائدہ؟— یہ ہے میرا نظریہ۔ اس طرح میں بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ ہائے ہم ہندوستانیوں کو آخر کب سمجھ آئے گی۔ پراچین بھارت میں ان سب باتوں پر یقین کیا جاتا تھا۔ اسی لیے ان دنوں اس ملک میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔ اب وہ زمانہ بھی گیا۔ بابو جی! آپ ان باتوں سے واقف نہیں پہلے زمانے میں ان سب باتوں کا علم اس قدر مکمل تھا کہ ایک مصور آپ کے جسم کا کوئی حصہ دیکھ کر آپ کے سارے جسم کی کیفیت بتا سکتا تھا۔ میں نے ایک کتاب ''نرنجن ورکشی'' میں ایک راجہ کا قصہ پڑھا۔ وہ اپنی رانی کی تصویر بنوانا چاہتا تھا۔ اس نے ایک مصور کو بلوایا جب مصور حاضر خدمت ہوا تو فرمایا کہ ہماری مہارانی کی تصویر بناؤ۔ لیکن ایک شرط ہے کہ میں مہارانی کی صورت نہیں دیکھنے دوں گا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جب سے وہ راج محل میں آئی ہے۔ اس کی صورت میرے سوا کسی غیر مرد نے نہیں دیکھی۔ مصور نے عرض کی مہاراج! آپ انہیں میرے روبرو مت لایئے۔ انہیں پردے کے پیچھے بٹھلا دیجئے۔ سامنے قد آدم آئینہ رکھ دیجئے۔ میں آئینے میں صورت دیکھ دیکھ کر تصویر تیار کردوں گا راجہ نے کہا یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ اس پر مصور نے بہت غور کرنے کے بعد کہا تو مہاراج ایک اور ترکیب ہوسکتی ہے۔ آپ مجھے ان کا پاؤں دکھا دیجئے صرف پاؤں میں اسی سے اندازہ لگا لوں گا۔''

یہ کہہ کر سردار صاحب نے یہ بڑی بڑی آنکھیں نکال کر میری طرف دیکھا۔'' سمجھے آپ؟ بس راجہ نے منظور کر لی یہ بات۔ خیر صاحب رانی کے پاؤں دیکھ کر ان کی پوری تصویر بنا ڈالی۔ ایک بات اس نے یہ کی کہ رانی کی ران پر تل کا نشان بنا دیا۔ مہاراج کو تصویر بہت پسند آئی لیکن راجہ نے ایک اعتراض کیا کہ مہارانی کی ران پر تل کا نشان کیوں بنایا۔ اس پر مصور نے کہا کہ ران پر تل موجود ہے۔ چنانچہ جب مہاراج نے مہارانی کی ران دیکھی تو اس پر تل نظر آیا۔ اس پر مہاراج کو مصور پر شک گذرا............

اور جناب مصور نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف پاؤں دیکھ کر نہ صرف انسان کے قد و قامت اور شکل وصورت کا بالکل صحیح اندازہ لگا سکتا تھا بلکہ وہ یہ بھی معلوم کر سکتا تھا کہ انسان کے جسم کے کس حصہ پر تل کا نشان موجود ہے۔"

میں نے دل میں سوچا کہ اس کہانی میں خواہ مبالغہ ہی کیا گیا ہو لیکن پامسٹری کو ماننے والے تو بہت سے لوگ موجود ہیں۔ میں بھی انہیں ہاتھ دکھا ہی ڈالوں۔ صرف ان کی فیس کا خوف تھا۔ میں نے ہاتھ رگڑ رگڑ کر ان ریکھاؤں کی طرف دیکھنا شروع کیا۔ سردار صاحب نے میز کی دراز میں سے ایک بڑا سا آتشی شیشہ نکال کر کہا "میں اس شیشے سے ہاتھ دیکھا کرتا ہوں سمجھ گئے آپ؟ اس شیشے سے ہر قسم کی لکیریں نظر آجاتی ہیں۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ منگل کے دن میں ہاتھ دیکھتا ہوں چوں کہ میں کسی سے کوئی فیس نہیں لیتا۔ اسی لیے بہت لوگ آجاتے ہیں......" میرے دل کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ میں نے رومال سے ہاتھ صاف کیے اور آگے بڑھانے ہی لگا تھا کہ سردار صاحب بولے "ایک مرتبہ جناب! گورنمنٹ سے ٹکر ہو گئی میری۔ میں نے دوکانوں کا ٹیکس نہیں دیا تھا۔ اس بات پر ٹیکس وصول کرنے والے افسر سے میرا جھگڑا ہو گیا۔ وہ تھا کٹر مسلمان۔ میں نے کہا بیٹا دیکھ میرے ہاتھ۔ لیجئے صاحب! اصل معاملہ یہ تھا کہ وہ ٹیکس کے ساتھ کچھ جرمانہ بھی وصول کرنا چاہتا تھا۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں جرمانہ نہیں دوں گا۔ ٹیکس ادا کر دوں گا۔ حضرت بگڑ گئے۔ جھگڑا بڑھا تو میں ایک دن سیدھا ڈی سی کے دفتر میں جا پہنچا۔ چپڑاسی نے مجھے اندر داخل ہونے سے روکا، میں نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کے حوالے کیا اور کہا جاؤ صاحب کو دے دو۔ میرے کارڈ پر لکھا تھا۔ سردار جگندر سنگھ ریسرچ سکالر، صاحب نے مجھے فوراً اندر بلا لیا۔ انہوں نے پوچھا کس چیز میں ریسرچ کرتے ہیں آپ؟ میں نے کہا۔ پامسٹری میں— چنانچہ میں نے ان کا ہاتھ دیکھا اور ایسی ایسی باتیں بتائیں .... کہ خوش ہو گئے۔ پھر میں نے اپنا مدعا بیان کیا۔ انہوں نے اسی وقت لکھ کر حکم بھیج دیا کہ سردار جگندر سنگھ ریسرچ سکالر سے جرمانہ

آپا کی شادی ہوئی تھی ایک مرتبہ جو دلہن بن کر گھر سے گئی تو ببنے نے یہی سمجھا کہ اب وہ واپس کیا آئے گی، وہ اپنی دانست میں آپا کو سدا کے لیے خیر باد کہہ چکا تھا۔ رخصتی کے وقت کیا کیا آنسوے بہائے گئے لیکن چند ہی روز بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ لال ہو کر اور رنگ نکھار کر خوش خوش چھم چھم کرتی ایسے لوٹ آئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو...... پہلے ہی کی طرح شریر تھی اب بھی۔ اپنی ساس اور سسر کی باتوں اور ان کی حرکات و سکنات کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ باتیں کرتے وقت باچھیں کھلی جاتی تھیں مانو بڑے اچنبھے کا تماشا دیکھ کر چلی آ رہی ہو...... ہائے کیسی رس بھری باتیں کر رہی تھی...... لیکن اس حاجی کے بچے کو آج ہی آنا تھا...... اور حرام زادے نوکر کی نانی کو بھی اج اسی وقت مرنا تھا۔ سور چھٹی لے کر چل دیا...... ابا کو تو کچھ یاد نہیں رہتا...... چھٹی کی خاطر وہ ایک نہیں کئی مرتبہ اپنی نانی کو مار چکا تھا۔

ببنے محض کام ہی سے نہیں بچنا چاہتا تھا بلکہ تاریکی میں اتنی دور جانا بھی اسے پسند نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دو برس پہلے جب وہ شہر کے اندر رہتے تھے تو بس مزے اڑاتے تھے ایسے موقعوں پر کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ گلی کی ایک نکڑ پر موڑے والے کی دوکان تھی، دوسری نکڑ پر حلوائی کی، ادھر بساطی کی ادھر پنساری کی۔ غرض کوئی دقت محسوس نہ ہوئی تھی نہ معلوم ابا کو کیا سوجھی کہ شہر سے بارہ پتھر باہر بنگلے میں آن بسے کہتے تھے شہر کے اندر کی آب و ہوا اچھی نہیں بچوں کی صحت بگڑ رہی ہے' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معمولی سے معمولی چیز کے لیے آدھ میل ہلکان ہوتے ہوئے جاؤ......

حاجی صاحب کوچ میں غرق چائے اور پیسٹریوں کے تصور میں قہقہے لگا رہے تھے...... ببنے نے دل کا سارا غصہ کوٹ کے کالروں پر نکالتے ہوئے انہیں بڑی بے رحمی سے موڑ کر اٹھایا اور اپنا سینہ ڈھانپ لیا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی جسم میں سوراخ کر دینے والی تیز و تند ہوا چل رہی تھی، باہر چاند کی اداس اور پھیکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے برآمدے میں کھڑے کھڑے نگاہ دوڑائی، ان کے بنگلے کے ارد گرد دور دور تک زمین کے قطعے ابھی خالی پڑے تھے صرف کرسچین کالج کے کھیل کے میدان کے ایک

سرے پر چھوٹی سی عمارت بن چکی تھی جس میں کھیل کود کا سامان رکھا جاتا تھا۔ دور کے بنگلوں کے شیشوں میں سے بجلی کی سرخی مائل روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی، تھوڑے تھوڑے وقفے پر دور سے کسی کتے کی بھونکنے کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اس نے مفلر سر اور گردن کے گرد کچھ اس طریقے سے لپیٹ لیا کہ جب برآمدے میں ہیٹ لٹکانے والے اسٹینڈ کے ساتھ لگے ہوئے آئینے میں جھانک کر دیکھا تو اسے یوں نظر آیا جیسے وہ کوئی نقاب پوش ڈاکو ہے۔ اپنی صورت دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اب کسی سے خوف کھانے کی کیا ضرورت تھی، بلکہ جو کوئی اسے اس حلیے میں دیکھے گا ڈر جائے گا۔

اس طرح تیار ہو کر بنے بچ بچ جانے پر آمادہ ہوگیا۔ خیالی گھاس کے لان میں سے ہو کر گزرنے والی دو فٹ چوڑی روش تھی جس پر روڑی بچھی ہوئی تھی۔ وہ پھیکی چاندنی میں تکان زدہ اور مغموم سی دکھائی دیتی تھی۔ روش کے پرلے سرے پر رات کی رانی کے پودے کھڑے تھے، اس پر ننھے ننھے سپید پھول کھلے ہوئے تھے اور ساری فضا ان کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ رات کی رانی کی خوشبو بہت روح پرور ہی سہی لیکن بنے نے سنا تھا کہ اس کی خوشبو سے مست ہو کر سانپ کنڈلی مار کر اس کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے..... نہ معلوم یہ بات کہاں تک درست تھی لیکن ایک روز جب کہ نوکر فوارے سے پھولوں کو پانی دے رہا تھا دفعتاً اس نے پھنکار کی آواز سنی۔ نظر اٹھا کر جو دیکھا تو سامنے ایک جلیبی سانپ دکھائی دیا جو پیچ در پیچ بل کھاتا ہوا پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا، اگر اور چند لمحوں کے لیے نوکر بے خبر رہتا تو یقیناً اسے ڈس لیتا..... بنے میاں نے ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بجائے گھاس کے روش پر سے جانے کی ٹھانی وہ جانتا تھا کہ سانپ نوک دار کنکریوں پر نہیں رینگ سکتا۔ رات کی رانی کے قریب سے گزرتے وقت وہ کنکھیوں سے ان کے سایوں کی طرف دیکھتا رہا۔

بنگلے سے کریم کی دوکان تک اس نے خدا خدا کر کے راستہ طے کیا۔ پہلے تو کالج کے میدان میں اسے دو آدمی دوڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ سمجھا کہ اس کا گلا

آپا کی شادی ہوئی تھی ایک مرتبہ جو دلہن بن کر گھر سے گئی تو بنے نے یہی سمجھا کہ اب وہ واپس کیا آئے گی، وہ اپنی دانست میں آپا کو سدا کے لیے خیرباد کہہ چکا تھا۔ رخصتی کے وقت کیا کیا آنسوے بہائے گئے لیکن چند ہی روز بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ لال ہو کر اور رنگ نکھار کر خوش خوش چھم چھم کرتی ایسے لوٹ آئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو...... پہلے ہی کی طرح شریر تھی اب بھی۔ اپنی ساس اور سسر کی باتوں اور ان کی حرکات و سکنات کا مضحکہ اڑا رہی تھی۔ باتیں کرتے وقت باچھیں کھلی جاتی تھیں مانو بڑے اچنبھے کا تماشا دیکھ کر چلی آ رہی ہو...... ہائے کیسی رس بھری باتیں کر رہی تھی...... لیکن اس حاجی کے بچے کو آج ہی آنا تھا...... اور حرام زادے نوکر کی نانی کو بھی اج اسی وقت مرنا تھا۔ سور چھٹی لے کر چل دیا...... ابا کو تو کچھ یاد نہیں رہتا...... چھٹی کی خاطر وہ ایک نہیں کئی مرتبہ اپنی نانی کو مار چکا تھا۔

بنے محض کام ہی سے نہیں بچنا چاہتا تھا بلکہ تاریکی میں اتنی دور جانا بھی اسے پسند نہیں تھا۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ دو برس پہلے جب وہ شہر کے اندر رہتے تھے تو بس مزے اڑاتے تھے ایسے موقعوں پر کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ گلی کی ایک نکڑ پر سوڈے والے کی دوکان تھی، دوسری نکڑ پر حلوائی کی، ادھر بساطی کی ادھر پنساری کی۔ غرض کوئی دقّت محسوس نہ ہوئی تھی نہ معلوم ابا کو کیا سوجھی کہ شہر سے بارہ پتھر باہر بنگلے میں آن بسے کہتے تھے شہر کے اندر کی آب و ہوا اچھی نہیں بچوں کی صحت بگڑ رہی ہے' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معمولی سے معمولی چیز کے لیے آدھ میل ہلکان ہوتے ہوئے جاؤ......

حاجی صاحب کوچ میں غرق چائے اور پیسٹریوں کے تصور میں قہقہے لگا رہے تھے...... بنے نے دل کا سارا غصہ کوٹ کے کالروں پر نکالتے ہوئے انہیں بڑی بے رحمی سے موڑ کر اٹھایا اور اپنا سینہ ڈھانپ لیا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی جسم میں سوراخ کر دینے والی تیز و تند ہوا چل رہی تھی، باہر چاند کی اداس اور پھیکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے برآمدے میں کھڑے کھڑے نگاہ دوڑائی، ان کے بنگلے کے ارد گرد دور دور تک زمین کے قطعے ابھی خالی پڑے تھے صرف کرسچین کالج کے کھیل کے میدان کے ایک

سرے پر چھوٹی سی عمارت بن چکی تھی جس میں کھیل کود کا سامان رکھا جاتا تھا۔ دور کے بنگلوں کے شیشوں میں سے بجلی کی سرخی مائل روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی' تھوڑے تھوڑے وقفے پر دور سے کسی کتے کی بھونکنے کی آواز سنائی دینے لگتی۔ اس نے مفلر سر اور گردن کے گرد کچھ اس طریقے سے لپیٹ لیا کہ جب برآمدے میں ہیٹ لٹکانے والے اسٹینڈ کے ساتھ لگے ہوئے آئینے میں جھانک کر دیکھا تو اسے یوں نظر آیا جیسے وہ کوئی نقاب پوش ڈاکو ہے۔ اپنی صورت دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اب کسی سے خوف کھانے کی کیا ضرورت تھی' بلکہ جو کوئی اسے اس حلیے میں دیکھے گا ڈر جائے گا۔

اس طرح تیار ہو کر بنے سچ مچ جانے پر آمادہ ہو گیا۔ خیالی گھاس کے لان میں سے ہو کر گذرنے والی دو فٹ چوڑی روش تھی جس پر روڑی بچھی ہوئی تھی۔ وہ پھیکی چاندنی میں تکان زدہ اور مغموم سی دکھائی دیتی تھی۔ روش کے پرلے سرے پر رات کی رانی کے پودے کھڑے تھے' اس پر ننھے ننھے سپید پھول کھلے ہوئے تھے اور ساری فضا ان کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ رات کی رانی کی خوشبو بہت روح پرور ہی سہی لیکن بنے نے سنا تھا کہ اس کی خوشبو سے مست ہو کر سانپ کنڈلی مار کر اس کے سائے میں بیٹھ جاتا ہے...... نہ معلوم یہ بات کہاں تک درست تھی لیکن ایک روز جب کہ نوکر فوارے سے پھولوں کو پانی دے رہا تھا دفعتاً اس نے پھنکار کی آواز سنی۔ نظر اٹھا کر جو دیکھا تو سامنے ایک جلیبی سانپ دکھائی دیا جو پیچ در پیچ بل کھاتا ہوا پیچھے کی طرف ہٹ رہا تھا' اگر اور چند لمحوں کے لیے نوکر بے خبر رہتا تو یقیناً اسے ڈس لیتا...... بنے میاں نے ان سب باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے بجائے گھاس کے روش پر سے جانے کی ٹھانی وہ جانتا تھا کہ سانپ نوک دار کنکروں پر نہیں رینگ سکتا۔ رات کی رانی کے قریب سے گذرتے وقت وہ کنکھیوں سے ان کے سایوں کی طرف دیکھتا رہا۔

بنگلے سے کریم کی دوکان تک اس نے خدا خدا کر کے راستہ طے کیا۔ پہلے تو کالج کے میدان میں اسے دو آدمی دوڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ وہ سمجھا کہ اس کا گلا

دبانے کے لیے آ رہے ہیں' اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا وسیع میدان میں چھپنے کے لیے کوئی مقام نہیں تھا۔ پھر اس نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ چیخ مارے تو آواز گھر تک پہنچ سکتی ہے یا نہیں لیکن ان کے بنگلے سے باہر زندگی کے آثار مفقود تھے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آج وہ ہرگز نہ بچ سکے گا وہ لوگ اور بھی قریب آ گئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس پر جھپٹ پڑنے کو ہوں۔ اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آن پھنسا...... اور پھر وہ لوگ ایک فراٹے کے ساتھ اس کے قریب سے گذر کر آگے بڑھ گئے...... وہ تعجب کرنے لگا پھر اسے یاد آیا کہ یہ کالج کے لڑکے ہیں جو دوڑنے کی مشق کر رہے ہیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد اس کے سانس کی آمد و رفت درست ہوئی۔ وہ سنسان مندر کے قریب کھڑے ہوئے پیپل کے گھنے سائے تلے سے لپک کر گذر گیا ایک نیا مکان بن رہا تھا جس کی دیواریں اٹھائی جا چکی تھیں لیکن ابھی اس پر چھت نہ ڈالی گئی تھی' یہ جگہ اسے بہت ڈراؤنی دکھائی دیتی تھی' بالآخر جب اسے کریم کی دوکان دکھائی دینے لگی تو اس کی جان میں جان آئی۔

حسب معمول کریم کی دوکان کے باہر آج بھی ایک شرابی کھڑا بازو ہلا ہلا کر بکواس کر رہا تھا' چند بے فکرے اس کے گرد گھیرا ڈالے اسے شہ دے رہے تھے۔ شرابی بار بار سر کو جھٹک کر اپنی پیشانی پر گرے ہوئے بالوں کو پیچھے کی طرف پھینکتا تھا اور منہ سے کف اڑا اڑا کر باتیں بنائے جا رہا تھا...... بنے دوکان کے اندر داخل ہوا۔ کریم کی دوکان بہت بڑی تھی' وہ نہ صرف جنرل مرچنٹ تھا بلکہ بمبئی کے پارسیوں کی طرح اس نے دوکان کے اندر ہی ریستوران کھول رکھا تھا۔ جہاں کافی اور چائے پینے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا...... بنے میاں نے بڑے اطمینان سے سب چیزیں خرید لیں تو پھر واپس جانے کے خیال سے پریشان ہونے لگا...... قریب بابو دیوی چند کھڑے تھے۔ بھاری ڈیل ڈول اور بارعب صورت تھی بنے کے ابا سے بھی علیک سلیک تھی' بنے نے سلام کیا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ بابو صاحب ان کے بنگلے کے قریب ہی

سے گذر کر اپنی کوٹھی کو جایا کرتے ہیں۔ کاش اب وہ جانے والے ہوں تو وہ بھی ان کے ہمراہ چلا جائے لیکن کاؤنٹر کے قریب کھڑا ہوا ان کا دوست کریم انہیں روک رہا تھا' بہ خدا نہیں جانے دوں گا۔''

دیر ہوگئی تو ابا بگڑیں گے آخر بنے کو ایک دفعہ پھر تن تنہا واپس جانا پڑا جوں جوں وہ بازار سے دور چلا جارہا تھا۔ توں توں زندگی کا شور دغل مدھم پڑ رہا تھا ایک بار پھر وہی ادھورا مکان، درختوں کے تاریک سائے' بھائیں بھائیں کرتا ہوا مندر ـــــ مندر کی دیوار تلے سے کوئی سادھو نکل آیا ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ''کچھ ایشور کے واسطے'' وہ اس کی گھناؤنی صورت کو ایک نظر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آگے پھر وہی میدان...... اب وہ لڑکے دوڑ نہیں لگا رہے تھے' اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سادھو اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ درختوں تلے سے گذرتے وقت اسے اپنے پیچھے سوکھی پتیوں پر پاؤں پڑنے کی چرمر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً سادھو لپکا چلا آرہا تھا۔ کاش! کالج کے وہ بیئے کئے لڑکے اب بھی دوڑ لگاتے دکھائی پڑجاتے...... اس نے جلدی جلدی میدان عبور کیا...... ہر آن اسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ بس سادھو نے اس کا ٹیٹوا دبایا کہ دبایا...... مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ کیا معلوم وہ سادھو بھوت ہی ہو اس نے سن رکھا تھا کہ اگر بھوت پیچھا کرے یا پکار کر آواز دے تو انسان کو چاہئے کہ گھوم کر نہ دیکھے بالآخر جب وہ ہانپتا کانپتا رات کی رانی کے قریب پہنچا تو دل کو کچھ تسکین حاصل ہوئی، وہ تیزی سے برآمدے میں سے گذرتا ہوا سیدھا باورچی خانے میں امّی کے پاس پہنچا اور ڈولچی پٹخ کر بولا ''لیجئے یہ رہیں آپ کی چیزیں...... اوراب ہم رات کے وقت بازار کبھی نہیں جائیں گے......''

''بھئی خیر تو ہے نا۔''

اس نے توقف کیا اصل بات گول کر گیا۔ ''خیر کیا...... ہمیں پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔ دیکھئے نا آٹھ بجنے کو ہیں ہم نے کچھ نہیں پڑھا۔ اتنا وقت ضائع ہوگیا۔''

دبانے کے لیے آ رہے ہیں' اس نے گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھا وسیع میدان میں چھپنے کے لیے کوئی مقام نہیں تھا۔ پھر اس نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ چیخ مارے تو آواز گھر تک پہنچ سکتی ہے یا نہیں لیکن ان کے بنگلے سے باہر زندگی کے آثار مفقود تھے اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ آج وہ ہرگز نہ بچ سکے گا وہ لوگ اور بھی قریب آ گئے اور ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس پر جھپٹ پڑنے کو ہوں۔ اس کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آن پھنسا...... اور پھر وہ لوگ ایک فراٹے کے ساتھ اس کے قریب سے گذر کر آگے بڑھ گئے...... وہ تعجب کرنے لگا پھر اسے یاد آیا کہ یہ کالج کے لڑکے ہیں جو دوڑنے کی مشق کر رہے ہیں۔

ان کے چلے جانے کے بعد اس کے سانس کی آمد و رفت درست ہوئی۔ وہ سنسان مندر کے قریب کھڑے ہوئے پیپل کے گھنے سائے تلے سے لپک کر گذر گیا ایک نیا مکان بن رہا تھا جس کی دیواریں اٹھائی جا چکی تھیں لیکن ابھی اس پر چھت نہ ڈالی گئی تھی' یہ جگہ اسے بہت ڈراؤنی دکھائی دیتی تھی' بالآخر جب اسے کریم کی دوکان دکھائی دینے لگی تو اس کی جان میں جان آئی۔

حسبِ معمول کریم کی دوکان کے باہر آج بھی ایک شرابی کھڑا بازو ہلا ہلا کر بکواس کر رہا تھا' چند بے فکرے اس کے گرد گھیرا ڈالے اسے شہ دے رہے تھے۔ شرابی بار بار سر کو جھٹک کر اپنی پیشانی پر گرے ہوئے بالوں کو پیچھے کی طرف پھینکتا تھا اور منہ سے کف اڑا اڑا کر باتیں بنائے جا رہا تھا...... ببنے دوکان کے اندر داخل ہوا۔ کریم کی دوکان بہت بڑی تھی' وہ نہ صرف جنرل مرچنٹ تھا بلکہ بمبئی کے پارسیوں کی طرح اس نے دوکان کے اندر ہی ریستوران کھول رکھا تھا۔ جہاں کافی اور چائے پینے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا...... ببنے میاں نے بڑے اطمینان سے سب چیزیں خرید لیں تو پھر واپس جانے کے خیال سے پریشان ہونے لگا...... قریب بابو دیوی چند کھڑے تھے۔ بھاری ڈیل ڈول اور بارعب صورت تھی ببنے کے ابا سے بھی علیک سلیک تھی' ببنے نے سلام کیا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ وہ سوچنے لگا کہ بابو صاحب ان کے بنگلے کے قریب ہی

سے گذر کر اپنی کوٹھی کو جایا کرتے ہیں۔ کاش اب وہ جانے والے ہوں تو وہ بھی ان کے ہمراہ چلا جائے لیکن کاؤنٹر کے قریب کھڑا ہوا ان کا دوست کریم انہیں روک رہا تھا'' بہ خدا نہیں جانے دوں گا۔''

دیر ہوگئی تو ابا بگڑیں گے آخر بٹے کو ایک دفعہ پھر تن تنہا واپس جانا پڑا جوں جوں وہ بازار سے دور چلا جارہا تھا۔ توں توں زندگی کا شور وغل مدھم پڑ رہا تھا ایک بار پھر وہی ادھورا مکان، درختوں کے تاریک سائے بھائیں بھائیں کرتا ہوا مندر—— مندر کی دیوار تلے سے کوئی سادھو نکل آیا ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ''کچھ ایشور کے واسطے'' وہ اس کی گھناؤنی صورت کو ایک نظر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آگے پھر وہی میدان...... اب وہ لڑکے دوڑ نہیں لگا رہے تھے اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سادھو اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ درختوں تلے سے گذرتے وقت اسے اپنے پیچھے سوکھی پتیوں پر پاؤں پڑنے کی چرمر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ غالباً سادھو لپکا چلا آرہا تھا۔ کاش! کالج کے وہ ہٹے کٹے لڑکے اب بھی دوڑ لگاتے دکھائی پڑ جاتے...... اس نے جلدی جلدی میدان عبور کیا...... ہر آن اسے یہی محسوس ہوتا تھا کہ بس سادھو نے اس کا ٹیٹوا دبایا کہ دبایا...... مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ کیا معلوم وہ سادھو بھوت ہی ہو اس نے سن رکھا تھا کہ اگر بھوت پیچھا کرے یا پکار کر آواز دے تو انسان کو چاہئے کہ گھوم کر نہ دیکھے بالآخر جب وہ ہانپتا کانپتا رات کی رانی کے قریب پہنچا تو دل کو کچھ تسکین حاصل ہوئی، وہ تیزی سے برآمدے میں سے گذرتا ہوا سیدھا باورچی خانے میں امّی کے پاس پہنچا اور ڈولچی پٹخ کر بولا ''لیجئے یہ رہیں آپ کی چیزیں...... اوراب ہم رات کے وقت بازار کبھی نہیں جائیں گے......''

''بھئی خیر تو ہے نا۔''

اس نے توقف کیا اصل بات گول کر گیا۔ ''خیر کیا...... ہمیں پڑھنا بھی تو ہوتا ہے۔ دیکھئے نا آٹھ بجنے کو ہیں ہم نے کچھ نہیں پڑھا۔ اتنا وقت ضائع ہوگیا۔''

پڑھنے کا نام سن کر امی کی باچھیں کھل گئیں۔ ''اچھا بھئی آئندہ نہیں بھیجیں گے جاؤ پڑھو......''

یہ پڑھنے والی بات تو یوں ہی اس کے منہ سے نکل گئی۔ آپا پہلے کی طرح لچھے دار باتیں سنا رہی تھیں۔ لیکن اب اس کا وہاں ٹھہرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ چائے کی ٹرے اور دیگر چیزیں ڈرائنگ روم میں پہنچا کر وہ سیدھا اپنے پلنگ پر جا بیٹھا۔ ٹانگوں پر رضائی ڈال لی' حساب کی کاپی اور کتاب کھول کر سامنے رکھ لی اور بستر کے نیچے سے ''پراسرار حسینہ نکال کر پڑھنے لگا۔''

اس کی نظریں کتاب پر تھیں کان باورچی خانے کی طرف لگے ہوئے تھے' نہ معلوم کیا باتیں ہو رہی تھیں، آپا کی ہنسی رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ کسی بات پر امی اور ادھیڑ عمر کی نوکرانی بھی چیخ کر ہنس پڑتی تھیں۔ اب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اس نے پڑھنے کا نام لے کر مفت میں مصیبت اپنے سر لے لی۔ اب امی اسے کسی شرط پر بھی اپنے پاس نہ بیٹھنے دیں گی۔ عورتوں میں گھس کر ان کی باتیں سننے کا طعنہ تو ہمیشہ سے دیتی آئی تھیں۔ آپا کو دیکھو بھلا اسے سب کی سب مزیدار باتیں آج ہی کر ڈالنی تھیں کیا؟

ان باتوں کو ذہن میں الٹتے پلٹتے اس نے پر اسرار حسینہ میں کھو جانے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ رفتہ رفتہ قصے میں اس کی دلچسپی بڑھنے ہی لگی تھی کہ ایک نئی ہنسی کی آواز سنائی دی...... اور اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا......

نئی ہنسی کی آواز سوائے شوشی کے اور کس کی ہو سکتی تھی' دیگر عورتوں کو تو تھوڑی بہت اس بات کی جھجک تھی کہ غیر ان کی آواز نہ سن لے لیکن شوشی کو کیا پروا تھی اس کی عمر بارہ سال سے کسی صورت میں بھی زیادہ نہ تھی۔ بڑوں کے لیے تو وہ ابھی ننھی بچی ہی تھی...... حاجی جی کی بھاری بھرکم ڈکاروں کو چیرتی ہوئی شوشی کی تیز کھلکھلاتی ہنسی صاف سنائی دے رہی تھی۔ وہ زور زور سے باتیں بھی کر رہی تھی......

شہر سے دور اس سنسان بنگلے میں آنے کا بنّے میاں کو ایک ہی فائدہ ہوا تھا— شوشی سے ملاقات ہوگئی۔ دو برس سے وہ دونوں ساتھ ساتھ کھیل رہے تھے۔ شوشی چودھری جان محمد ریٹائرڈ انسپکٹر آف اسکولز کی بیٹی تھی۔ چودھری صاحب ساری عمر اولاد کے لیے ترستے رہے بڑھاپے میں اولاد کا منہ دیکھنا نصیب ہوا' انہیں اپنے بچے بہت عزیز تھے چنانچہ شوشی بھی بڑی لاڈلی تھی' وہ مٹک مٹک کر اور ہونٹ بنا بنا کر بھولپن سے باتیں کرتی بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ دو چار فقروں کے بعد منہ بند کر کے لعابِ دہن کو اس طرح نگلتی جیسے گلاب جامن کھا رہی ہو۔

دونوں گھرانوں کا آپس میں بہت میل جول تھا۔ بچے بھی گھل مل گئے۔ خصوصاً بنے میاں اور شوشی میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ بنّے میاں کو شوشی یوں تو ہمیشہ ہی سے بہت اچھی لگتی تھی لیکن جب سے اس نے سنیما دیکھنا شروع کیا تھا شوشی اسے بہت ہی پیاری لگنے لگی تھی۔ اس کے بال سب سے پہلے دیکھنے والے کو اپنی طرف متوجہ کرتے تھے۔ وہ از حد گھنے، بہت ہی کالے، خوب لمبے اور بے حد ملائم تھے۔ اس کی آنکھیں بڑی نہیں تھیں لیکن چمک دار اور دلکش تھیں۔ اس کے گال زردی مائل گندی رنگ کے تھے۔ ہونٹ پتلے اور پھڑکتے ہوئے ٹھوڑی گول اور چکنی۔

اب بنے شوشی کو دیکھتا تو اس پر ایک اور کیفیت طاری ہونے لگتی۔ اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ جسم سر سے پاؤں تک سلگنے لگتا اور چھاتی میں سانس نہیں سماتا تھا...... وہ بڑے بڑے تصور باندھنے لگتا......

شوشی باورچی خانے میں ہنس ہنس کر باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ تھوڑی دیر بعد وہ اس کے پاس آئے گی— پہلے بھی جب کبھی رات کو اپنی اماں اور ان کی سہیلیوں کے ساتھ سیر کرتی ہوئی ان کے ہاں آتی تو وہ امی کا ساتھ چھوڑ کر اس کے پاس آن بیٹھتی وہ دیر تک کھیلتے رہتے کبھی شوشی انہی کے ہاں سو جاتی کبھی اسے اپنے ہاں لے جاتی۔

جب کبھی رات کو وہ ان کے ہاں آتی تو وہ جان بوجھ کر پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ شوشی اسے اپنے گھر لے جانے پر اصرار کرتی تو وہ کہتا بھئی ابا سے پوچھ لو۔ میں پڑھنے میں مصروف ہوں۔ تنگ آ کر شوشی اس کے ابا کے پاس پہنچتی۔ بھلا ابا کو وہ کم لاڈلی تھی کہتے ''ہاں بیٹا! جاؤ لے جاؤ بنے کو......''

وہ منہ بسور کر بھرائی ہوئی آواز میں کہتی ''وہ جو کہتا ہے میں پڑھنے میں مشروف ہوں۔''

یہ مشروف بنے کو چڑانے کے لیے کہتی۔ ابا آواز دیتے ''جاؤ بیٹا بنے...... دیکھو شوشی بچاری کتنی دور سے تمہیں اپنے ہاں لے جانے کے لیے آئی ہے......''

...... اور پھر وہ بظاہر بے دلی سے محض ابا کے حکم سے مجبور ہو کر کوٹ پہننے لگتا......

دفعتاً شوشی کی ہنسی کی آوازیں بند ہوگئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ اب وہ باورچی خانے سے اس کی طرف چل دی ہوگی۔ اس نے فوراً پر اسرار حسینہ کو گدیلے کے نیچے چھپا دیا اور تپائی گھسیٹ کر کاپی اس پر رکھ دی۔ ایک ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائی اور دوسرے ہاتھ میں پنسل پکڑ کر اس کے سرے سے دانت بجانے لگا۔ اپنی صورت پر گہرے استغراق کی کیفیت پیدا کر لی۔

وہ بظاہر ہر بات سے بے خبر کاپی پر نظریں جمائے تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بس چند ہی لمحوں کے بعد اس کی تپائی پر ایک دبلا پتلا نرم ہاتھ آن ٹکے گا۔ اس ہاتھ کی بناوٹ کے تصور ہی سے سنسنی کی ایک لہر اس کے جسم میں دوڑ گئی...... وہ کھڑی رہے گی لیکن یہ نظر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھے گا۔ اس بات سے شوشی کی خود دار طبیعت پر چوٹ سی لگے گی۔ وہ جھلا کر کہے گی ''میں آئی ہوں''

''تو میں کیا کروں؟''

وہ ہونٹ کاٹ کر چلائے گی ''اوپر دیکھو نا میری طرف''

یہ بھنا کر جواب دے گا ''نہیں دیکھتا...... میں پڑھ رہا ہوں۔''...... اور اگر ممکن ہوا یا مناسب سمجھا گیا تو یہ بھی کہہ دے گا۔ ''جاؤ بھاڑ میں......''

اب تو پانی سر پر سے گر جائے گا۔ شوشی سچ مچ خفا ہو کر دروازے کی اوٹ میں اس کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑی ہو جائے گی۔ لیکن یہ کچھ پروا نہیں کرے گا۔ ہار کر وہ تیز ناخنوں سے دیوار کا پلستر اکھیڑے گی...... پہلے ہی کم بخت نے دیوار کا بہت سا حصہ کرید ڈالا تھا...... پلستر کی چھوٹی چھوٹی کنکریاں اس کی طرف پھینکنے لگے گی۔ یہ منع کرے گا وہ باز نہیں آئے گی۔ آخر تنگ آ کر یہ اسے سزا دینے کے لیے اٹھ کر اس کی طرف لپکے گا اور وہ چیخ کر ہنستی ہوئی اس کے آگے آگے دوڑ پڑے گی ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں، ایک پلنگ سے دوسرے پلنگ پر پھلانگتی پھرے گی اور بالآخر ان کی آپس میں صلح ہو جائے گی......

معاً بنے میاں چونکا۔ آخر شوشی اب تک اس کے پاس پہنچی کیوں نہیں، ممکن ہے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی مسکرا رہی ہو۔ چنانچہ اس نے چندے سکوت کیا۔ پھر اس نے اچٹتی ہوئی نظر سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ شاید دیوار کے پیچھے کھڑی ہو...... اس نے یونہی کھانس کر پیشاب کے بہانے سے باتھ روم کی طرف قدم اٹھایا، اِدھر اُدھر متجسس نظروں سے دیکھتا ہوا بڑھا۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ واپس لوٹا تو سوچا ممکن ہے چپ چاپ بیٹھی ہو امّی کے پاس۔ وہاں گیا تو اور سب موجود تھے۔ آپا، امی، خادمہ لیکن شوشی نہیں تھی۔ امی نے اسے مضطرب پا کر پوچھا ''کیا بات ہے بنے؟''

بنے گھبرا کر ہکلایا ''امی۔ مجھے نیند آ رہی ہے...... دودھ گرم کر دیجئے...... پھر خواہ مخواہ سوتے کو جگائیے گا......''

امی نے دودھ کا پتیلا چولھے پر رکھ دیا وہ ادھر ادھر دیکھتا ہوا کمرے کی طرف بڑھا۔ صحن خالی تھا۔ اسے حاجی اور ابا کے قہقہے زہر معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے ڈرائنگ روم میں جھانکا۔ شوشی وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ عجب ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ بھلا یہ کیسے

ممکن ہے کہ شوشی اس سے ملے بغیر ہی چلی جائے.....

مایوس ہو کر جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اسے باہر والے برآمدے کی طرف لٹکی ہوئی چق ہلتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی مایوسی امید میں تبدیل ہوگئی۔ وہ دبے پاؤں آگے بڑھتا گیا اور دفعتاً چق اٹھا کر ادھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ برآمدہ خالی پڑا تھا۔ پھیکی چاندنی برآمدے کی محرابوں کے نیچے سے فرش تک چلی آئی تھی۔

اس نے کوٹ کا کالر دہرایا کیا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پرلے سرے پر جا کر کھڑا ہوا۔ سامنے رات کی رانی کے پودے ہوا میں جھوم رہے تھے' ان کے پھولوں کی خوشبو سے اس کے نتھنے مہک اٹھے۔

پہلے اسے اس بات پر سخت غصہ آیا کہ شوشی اس سے ملے بغیر چلی گئی...... لیکن پھر جیسے عجز اور فتادگی سے اس کا سر جھک گیا۔ کاش وہ یوں اس سے ملے بغیر نہ جاتی۔ آج اس کی طبیعت اداس اور مضمحل سی تھی۔ شوشی سے باتیں کر کے اس کے ساتھ بیٹھ کر اسے تسکین ہوجاتی...... اگر وہ اس کے پاس آجاتی تو وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے کیسے خوش خوش چہکتے ہوئے ان کے گھر کو چل دیتے......

سامنے کھیلنے کے میدان کے ایک سرے پر سفید عمارت تنہا کھڑی تھی۔ وہ سوچنے لگا ممکن ہے شوشی اس کے برآمدے کے کسی تاریک گوشے میں چھپی کھڑی ہو...... پھر اسے خود ہی اپنے اس خیال پر ہنسی آنے لگی' وہ دبلی پتلی نازک بدن شوشی جو ذرا سی آہٹ پر خرگوش کی طرح چونکی ہوجاتی تھی بھلا وہ اس سنسان عمارت کے برآمدے میں کیوں کر چھپ سکتی تھی، ڈرپوک کہیں کی!

اگر آج رات وہ دونوں اس عمارت کے قریب سے ہو کر گذرتے تو وہ حسب معمول کہتی کہ رات کے وقت اس برآمدے میں بھتنے ناچا کرتے ہیں۔ یہ سن کر وہ اس کا جی بھر کر مذاق اڑاتا...... اور کہتا چل اس برآمدے کے تاریک کونے میں دیکھیں تو کون سا بھتنا چھپا کھڑا ہے۔

اس پر وہ سہم کر کہتی ''نا بابا! مجھے ڈر لگتا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کا ہاتھ تھام لیتی۔

اپنے ہاتھ میں شوشی کے ہاتھ کے تصور سے اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوگیا، جسم میں تیز سنسناہٹ سی محسوس ہوئی پھر جیسے اس نے ہاتھ بڑھا کر شوشی کی نازک کمر اپنے بازو کے حلقے میں لے لی ہو اور شوشی نے ڈر کے مارے اپنا بازو اس کے کندھے پر رکھ دیا ہو...... جامن کی لچکیلی ڈال کی طرح بل کھاتی ہوئی کمر...... اس قدر نرم اور سبک جسم...... ایسی نازک اور کمزور انگلیاں......ہاتو بچاری کے جسم میں جان تک نہیں۔ اکیلی ہو تو مارے خوف کے مر جائے......لیکن اس کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے جھجک جھجک کر برآمدے کی دو تین سیڑھیاں بھی چڑھ جاتی...... اور پھر ٹھٹک کر رک جاتی...... وہ اسے اپنے ساتھ قدرے بھینچ کر کہتا ''تم ڈرتی ہو؟ اس تاریک کونے میں کچھ بھی تو نہیں۔ کوئی بھتنا نہیں......کوئی بلا نہیں...... ہاہاہا ڈرپوک کہیں کی...... بھلا ڈرنے کی کوئی بات بھی ہو...... اور پھر میں جو تمہارے ساتھ ہوں......''

یہ افسانہ پہلی بار ساقی سالنامہ جنوری 1947 میں شائع ہوا۔ کسی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ کلیات میں پہلی بار شامل کیا جارہا ہے۔

ہندوستاں ہمارا

ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
(اقبالؔ)

جگجیت سنگھ اپنی بیوی کی تلاش میں تھا۔

بھلا اتنے بڑے جوڑ میلے میں ایک عورت کو ڈھونڈ نکالنا بھی کوئی آسان کام تھا۔ سکھوں کا جوڑ میلہ ایک برس میں ایک ہی مرتبہ لگتا تھا۔ گورو ارجن دیو جی مہاراج کی یاد میں بڑے بڑے دیوان لگتے۔ پنجاب کے دور افتادہ مقامات سے پریمی سکھ جوق در جوق آتے۔ دو دن تو اس جگہ تل پھینکنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سبھی جمع ہوتے تھے۔ اتنی بھیڑ میں بھلا جگجیت سنگھ کی بیوی کا کیا پتہ چل سکتا تھا۔

لیکن وہ بیوی کو ڈھونڈے بغیر واپس نہ جا سکتا تھا۔ وہ کچھ عرصہ تک برما کے محاذ پر جانے والا تھا۔ اس نے بہ مشکل دو ہفتے کی چھٹی حاصل کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ان چھٹیوں میں وہ اپنی بیوی کو ہمراہ لے کر شملے چلا جائے۔ اس کی بیوی کی خواہش تھی کہ وہ کسی پہاڑی مقام کی سیر کرے۔ ہز میجسٹی کی فوج کا لفٹنٹ ہونے کی حیثیت سے نہ معلوم کتنے عرصے تک اسے اپنی قوم اور ملک کی خدمت کرنی پڑے۔ ہندوستان کی خاک

پ ۔ ۔ پی اور خونخوار دشمنوں سے بچانے کے لیے نیز ہندوستان کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے نہ معلوم کب تک اسے شمشیر بکف رہنا پڑے۔ ان حالات میں اس نے مناسب سمجھا کہ چند روز اپنی بیوی کی صحبت میں کسی پر فضا مقام پر گزارے۔

وہ آج صبح ہی گھر پہنچا تھا لیکن بیوی موجود نہ تھی صرف ماں بیٹھی چرخہ کات رہی تھی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ وہ منہ سے کچھ کہنے سے شرماتا تھا۔ شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ ماں بھانپ گئی۔ سُوت کے ساتھ نئی پونی لگا کر بولی۔ ''لڑکیاں جوڑ میلے پر گئی ہیں۔ میرا بھی جی چاہتا تھا۔ لیکن میلے کے دنوں میں گھر اکیلا چھوڑ کر جانا مناسب نہیں اس لیے میں نے آج انہیں بھیج دیا۔ کل میں خود جاؤں گی۔''

پھر ماں نے بلائیں لے کر کہا ''اچھا اب نہا دھو کر کچھ کھا پی لو۔''

''لیکن وہ کب آئیں گی ماں؟''

ماں ہنسنے لگی۔ ''چھوکریاں ہیں کون کہہ سکتا ہے کب آئیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ شام سے پہلے نہیں آئیں گی۔ آج دوپہر کا کھانا بھی وہ لنگر ہی سے کھائیں گی۔''

جگجیت سنگھ عجلت میں تھا۔ اس نے ماں کو اپنا سارا پروگرام بتایا۔ ماں کہنے لگی اب وہ تیرے ساتھ پہاڑ پر نہیں جاسکتی۔

''نہیں جاسکتی؟— کیوں؟''

''احمق!'' اس کی ماں پرمعنی انداز میں ہنسنے لگی ''کہہ جو دیا وہ نہیں جاسکتی۔''

وہ کچھ نہ سمجھا۔ لیکن وہ بلا کچھ کھائے پیئے بیوی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔

شادی ہوئے چار پانچ مہینے ہی گزرے تھے۔ شادی کے بعد وہ ایک ماہ کے قریب اپنی بیوی کے ساتھ رہا۔ پھر اسے ملازمت پر جانا پڑا۔ اب یہی ایک موقع تھا۔ اس کے بعد نہ معلوم کب ملاقات ہو یا نہ ہو۔ اسے اپنی بیوی سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی نوعمر جوشیلے نوجوان کو ہوسکتی ہے۔ اسے اس کا خوب صورت تیکھے خدو خال والا چہرہ بخوبی یاد تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوگی وہ اسے پہچان لے گا۔

بھیڑ میں سے رستہ بناتا ہوا وہ چلا جارہا تھا۔ پہلے وہ خیموں کے عارضی بازار میں

سے ادھر اُدھر نظریں دوڑاتا ہوا گزر گیا۔ اس کی بیوی چٹپٹی چیزیں کھانے کی بہت شوقین تھی۔ اس نے دور چاٹ والے کی دکان پر چند عورتوں کا جمگھٹا دیکھا۔ وہ لپک کر وہاں پہنچا۔ عورتوں کی خاصی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ان میں اس کی بیوی شامل ہو یا نہ ہو۔ اگر وہ یوں ہی نظر اٹھا کر کسی غیر مرد کو دیکھ لے تو وہ ہاتھ دھوکر اس کے پیچھے ہی پڑ جائے۔ چناں چہ وہ دو پیسے کے دہی بڑے لے کر ایک طرف کھڑا ہوگیا اور کنکھیوں سے عورتوں کا جائزہ لینے لگا۔ لیکن ان میں اس کی بیوی موجود نہ تھی۔ وہاں سے نکلا تو پرے مچھلی بیچنے والے کی دکان نظر آئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی مچھلی کے پکوڑے یا تلی ہوئی مچھلی بھی بڑی رغبت سے کھاتی تھی۔ ممکن ہے وہاں بینچ پر انگلیاں چاٹتی ہوئی سی سی کر رہی ہو۔ اس کی بیوی ابھی نو عمر لڑکی ہی تھی۔ یہی سولہ سترہ کا سن تھا۔ بڑی چنچل اور طرح دار ۔ اسے دیکھ پائے گی تو بھلا وہ کس انداز سے مسکرانے لگے گی۔ وہ بھاگا بھاگا پہنچا۔ لیکن اس کی بیوی اس جگہ بھی موجود نہ تھی۔ اسی طرح بھاگم بھاگ اس کی پگڑی بھی ڈھیلی ہوگئی۔ گردن کی جلد سرخ ہوگئی۔

بڑے گوردوارے کے ارد گرد دور تک علاحدہ علاحدہ شامیانوں کے نیچے دیوان لگے ہوئے تھے۔ ان دیوانوں میں مرد بھی شامل تھے عورتیں بھی۔ اس نے سوچا ممکن ہے وہ کسی دیوان ہی میں بیٹھی ہو۔ وہ بھاگا بھاگا ایک دیوان میں گھس گیا۔ اسٹیج پر نئی روشنی کا ایک سکھ جنٹل مین کھڑا ہوا تھا۔ وہ سکھ قوم کے کسی مسئلہ پر جدید روشنی میں بحث کر رہا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے قد کا مختصر سا آدمی تھا۔ اگر چہ وہ بڑے جوش میں بول رہا تھا لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ دیہاتوں سے آئے ہوئے اکھڑ سکھ اس کے لکچر میں خاصی دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ اس کی کمزور پتلی پتلی باہیں اور چھوٹی چھوٹی کسی ہوئی مٹھیاں، اس کی باریک زنانہ آواز اور پھر اس کی اردو ملی پنجابی بولی یا پنجابی ملی اردو سونے پہ سہاگا کا کام کر رہی تھی۔

"میں آپ نوں یقیں دلاتا ہاں۔ بلکہ ہم ایسی بات پر مجبور ہوگئے ہیں۔ ای یہ

نتیجہ نکالن میں حق بجانب ہیں کہ سکھ قوم بڑی بہادر قوم تھی اور ہن بھی ہے، لیکن سکھ راج نیتی کے معاملے وچ کورے ہی ہیں۔ سیاست میں کوئی ٹاواں ٹاواں آدمی سمجھ دار بھی نظر آجاندا ہے پر اس بات کی پینتھ نوں ہمیشہ ہی کی رہندی ہے...... جے آپ بگھیل سنگھ کی گل پر غور کرو۔ بگھیل سنگھ نے دتی پر قبضہ کر لیتا۔ دتی پر پنتھ کا نشان لہران لگ پیا۔ تو خالصہ صاحبو! دیوالی کے دن آگئے۔ سب سکھوں نے کہا کہ ایس دیوالی امرتسر مناونی ہے جی۔ اس گل نوں سن کر بگھیل سنگھ جی بولے۔'' خالصہ جی بات ہم سویکار کرتے ہیں۔ ہن خالصہ جی امرتسر جی کی طرف کوچ کردیو۔ اس وقت کسے نے کہیا۔'' سردار صاحب! دتی دا کیا بنے گا؟'' سردار بگھیل جی کہن لگے۔'' پھر فتح کر لیں گے۔'' تو جی جیکارے بلاندے اور واپس امرتسر آن دھمکے......''

جگجیت سنگھ اچک اچک کر عورتوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے اپنی بیوی کہیں بھی نظر نہ آئی۔ بچارا بہت پریشان تھا وہاں سے ہٹ کر بھیڑ میں دھکے کھاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ کوئی عورت اس کی نظر اسے نہ بچتی تھی۔ وہ اور ایک دیوان میں جا نکلا۔ وہاں بھی لکچر ہو رہا تھا۔ یہ لکچر دینے والے سردار صاحب خوب لمبا سا لٹھ ہاتھ میں تھامے ہوئے تھے۔ وہ بڑے جوش میں بول رہے تھے۔ ان کی آواز گرج دار تھی اور صورت سے رعب ٹپکتا تھا۔ اس نے اپنے منہ کے دہانے کے آگے سے اپنی گھنی اور بڑی بڑی موچھیں ہاتھ سے ہٹاتے ہوئے کہا:—

'' پنتھ جیو! مجھے ایک بڑے وِدوان پروفیسر نے یہ بات بتائی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہندوستان کی ہسٹریاں لکھنے والے سب انگریز مصنف اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں انہیں مشرق میں سب سے سخت دشمن سکھ ہی ملے تھے۔ یہ بات کٹر سے کٹر انگریز بھی تسلیم کرتے ہیں۔— آخر یہ جوش اور طاقت سکھوں میں کہاں سے آگئی؟ یہ شری گرو کلغی دھر کا بھرا ہوا جوش ہے اور یہ سب شری گورو ارجن دیو جی مہاراج کی قربانیوں کا نتیجہ ہے...... میں آپ کو ایک مزے کی بات سناتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ ذرا

زور کے ساتھ کھانسا۔ جگجیت سنگھ عورتوں کے جھرمٹ کے قریب چلا گیا۔ '' یہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے زمانہ کی بات ہے۔ اس وقت مہاراجہ جی کے جرنیل ہری سنگھ نلوے کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہ وہی نلوا تھا جس نے کابل قندھار تک سکھوں کی تلوار کا سکہ بٹھا دیا تھا۔۔ پٹھان مائیں اپنے روتے ہوئے بچوں کو اس کا نام لے کر چپ کراتی تھیں۔ انہیں دنوں کی بات ہے کہ انگریزوں نے کلکتہ میں ایک کانفرنس بلائی۔ اس میں ہندوستان کے بڑے بڑے حکمراں یا ان کے نمائندے بھی مدعو کیے گئے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہری سنگھ نلوے کو روانہ کر دیا۔ جس دن پہلی میٹنگ ہونے والی تھی سردار ہری سنگھ نلوا وقت سے کچھ پہلے ہی وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ ہری سنگھ بہت بھاری ڈیل ڈول والا شخص تھا۔ صورت ایسی ہیبت ناک اور پر جلال تھی کہ دیکھ کر دل تھرا جاتا تھا۔ آنکھوں میں ایسی تیزی تھی کہ کوئی شخص اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا۔ خیر! اس میٹنگ میں بھی سبھی لوگ جمع ہونے شروع ہوگئے۔ جو کوئی نلوے کو دیکھتا حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتیں۔ میٹنگ کی کارروائی کا وقت آن پہنچا۔ لیکن حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہر طرف خاموشی طاری تھی۔ ہری سنگھ نلوا کچھ دیر تک تو منتظر رہے پھر وہ کچھ برا مان گئے اور اسی دن پنجاب کی طرف روانہ ہو پڑے اور لاہور پہنچ کر مہاراج سے اس بات کی شکایت کی۔ مہاراج نے اسی وقت انگریزوں کو چٹھی لکھی کہ آپ لوگوں نے ہمارے نمائندے کی تضحیک کی ہے۔ وہ آپ کی کانفرنس میں شامل ہوا اور سب چپ چاپ بیٹھے رہے۔ اس بات پر انگریزوں نے جواب دیا کہ ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن ہم لاچار تھے آپ کے جرنیل کا دبدبہ ہی کچھ ایسا تھا کہ یہاں پر کسی کو زبان ہلانے کی جرأت تک نہ ہوئی۔ سب ممبران یہی سوچتے رہ گئے کہ ممکن ہے وہ کوئی بات کہیں جو نلوے کو پسند نہ آئے اور وہ خفا ہو جائے......سو یہ تھا ہمارے جرنیل ہری......''

جگجیت سنگھ آگے بڑھ گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ اس نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ جلدی سے اپنی بیوی کو ڈھونڈ کر لے آئے گا۔ پھر وہ

نہا دھو کر کھانا کھائے گا۔ اور اس کی بیوی بھی شام تک تیاری کرے گی۔ اگر اس طرح ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی شام ہوگئی تو وہ آج نہ جا سکیں گے۔ جس کے معنی ہیں ایک دن ضائع ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ اور بھی سرگرمی سے بیوی کو تلاش کرنے لگا۔ اس کی پریشانی دیکھ کر کوئی سیوا دار پوچھ بیٹھتا'' کیوں سردار جی خیریت تو ہے۔ کوئی بچّہ وچہ تو نہیں کھو گیا۔ وہ مسکرا کر آگے بڑھ جاتا۔ واقعی اتنے بڑے میلے میں بیوی کو تلاش کرنا بہت مشکل تھا۔

پرے گھاس کے ٹکڑے پر درخت کی چھاؤں تلے رنگ برنگ کے کپڑوں والی عورتیں بیٹھی تھیں۔ اسے کچھ اس قسم کا دھوکا ہوا جیسے اس کی بیوی بھی انہیں میں شامل ہو۔ وہ بڑی امیدوں کے ساتھ وہاں پہنچا۔ لیکن مایوس آنا پڑا۔

کئی طرح دار بانکی عورتوں کو پیچھے سے دیکھ کر اسے شک گزرتا ممکن ہے یہ میری بیوی ہی ہو۔ مگر جب قریب پہنچ کر ان کی طرف دیکھتا تو شرمندہ ہونا پڑتا۔ ادھر وہ عورتیں اپنی خوب صورت آنکھیں ایک مرتبہ تو حیرت سے اس کے چہرے پر گاڑ دیتیں۔ پھر وہ جلدی سے منہ پھیر کر چل دیتیں۔

ایک اور بڑے مجمع میں بہت عورتیں بیٹھی دکھائی دیں۔ وہ خود لمبے قد کا شخص تھا۔ لیکن اس کے آگے کھڑے ہوئے طرّہ باز سکھ نوجوانوں کی پگڑیوں کے چھلیے ہوئے کلفے اس کے راستے میں حائل ہوجاتے تھے۔ وہ بھی مجمع میں گھس کر کھڑا ہوگیا۔ یہاں ڈھڈ سارنگی والوں نے سماں باندھ رکھا تھا۔ ڈھڈ چھوٹی ڈھولک سی ہوتی ہے جسے ایک ہاتھ میں پکڑ کر دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے اسے بجایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ستار بجتا ہے۔ یہ دونوں ساز رزمیہ اور جوشیلے گانوں کے لیے مخصوص ہیں۔ سب سے زیادہ بھیڑ اسی جگہ تھی۔ عورتوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ جگجیت سنگھ کو پورا یقین تھا کہ اس کی بیوی اس جگہ ضرور مل جائے گی۔

وہ کچھ آگے بڑھا پھر رک گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اس نے زیادہ دھا چوکڑی

مچائی تو لوگ اسے نکال باہر کریں گے۔ وہ ایسے زاویہ پر کھڑا ہونا چاہتا تھا جہاں سے وہ عورتوں کو بخوبی دیکھ سکے۔ وہ کچھ دیر کے لیے ڈھڈ سارنگی والوں کے گیت سننے کے لیے کھڑا ہوگیا۔

وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں شخص خوب پلے ہوئے بھینسوں کی طرح موٹے تازے تھے۔ رنگ تانبے کے مانند سرخ۔ گردن کی رگیں پھولی ہوئیں۔ جوش میں بھرے ہوئے شیروں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اس وقت وہ مشہور شاعر شاہ محمد کی لکھی ہوئی رزمیہ نظم سنا رہے تھے۔ اس نظم میں شاہ محمد نے بڑے پر جوش انداز میں سکھوں اور انگریزوں کی لڑائی کا حال بیان کیا ہے۔

ان تین اشخاص میں سے ایک کے ہاتھ میں ستار تھا اور دو کے ہاتھ میں ڈھڈ کی دھپا دھپ کی آواز کے ساتھ ان کے ہاتھ اور سر بھی ہل رہے تھے۔ حاضرین بیٹھے جھوم رہے تھے۔ ڈھڈ والوں میں ایک شخص کبھی نثر میں جنگ کا نقشہ کھینچتا اور پھر کوئی بول وہ تینوں ہم آواز ہو کر ایک ساتھ پر جوش انداز میں گانے لگتے۔

"صاحباں! یہ ایک غلط بات ہے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد سکھوں نے جنگ کا آغاز کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ خود انگریزوں کی نیت خراب تھی۔ انہوں نے رشوت دے کر چند سکھ سرداروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا مجبوراً سکھوں کو بھی لڑنا پڑا۔ یہ انگریزوں کی خوش قسمتی تھی اس وقت سکھوں کا کوئی رہنما نہ تھا۔ اگر یہ لڑائی مہاراجہ شیر پنجاب کی زندگی میں شروع ہوگئی ہوتی تو یقیناً آج ہندستان کی تاریخ کچھ اور ہی ہوتی۔ ایک طرف فرنگیوں نے کچھ ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ سکھوں کے لیے جنگ ناگزیر ہوگئی۔ اور جب سکھ مرنے یا مارنے پر تیار ہوگئے تو انگریزوں نے چاہا کہ طوفان تھم جائے۔ چناں چہ شاہ محمد فرماتے ہیں:

چٹھی لکھی فرنگیاں خالصے نوں
تُسی کاس نوں جنگ مچانو ویں او

(انگریزوں نے سکھوں کو چٹھی لکھی کہ آپ جنگ کیوں چھیڑ رہے ہیں۔)

ہور دیے جوش فرماندے او

(ہم سے لاکھوں روپیہ لے جاؤ اور اس کے علاوہ جو کچھ آپ طلب کریں ہم دینے کو تیار ہیں۔)

جگجیت سنگھ مایوس ہو کر مجمع سے باہر نکل آیا۔ اب کوئی چارہ باقی نہ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ پسینہ اس قدر زیادہ آیا تھا کہ اس کی بغلوں میں اس کا خاکی کوٹ تک بھیگ گیا تھا۔ پیٹ پیٹھ سے جا لگا تھا۔ شدت کی پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اسے اپنی بیوی پر سخت غصہ آنے لگا۔ نہ معلوم کم بخت کہاں چھپ کر بیٹھ رہی ہے۔ اس کا سارا پروگرام درہم برہم ہوا جا رہا تھا—— اس نے سبیل سے دودھ کی کچی لسی پی اور لاہور کے قلعہ کی دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہوگیا۔ اس کی ٹانگیں شل ہوگئی تھیں۔ وہ زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکا۔ اس قدر شور وغل اور دھکم دھکے میں وہ بھوکا پیاسا صبح سے گھوم رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ کہیں لیٹ کر کمر سیدھی کر لے۔

یہ سوچ کر وہ میلے سے ذرا ہٹ کر ایک درخت کی طرف بڑھا۔ برگد کے پھیلے ہوئے درخت کے نیچے۔ گاؤں سے آئی ہوئی عورتیں بیل گاڑیوں کے نیچے بیٹھی ہوئی روٹیاں کھا رہی تھیں۔ وہ مایوس تھکا ہارا قدم بڑھائے چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں ایک لڑکی بھاگتی ہوئی ان کے سامنے آن کھڑی ہوئی...... اس نے آنکھیں اٹھائیں...... ارے اس کی چھوٹی بہن! ...... ”ستو! ستو!! تم لوگوں کو صبح سے ڈھونڈ رہا ہوں۔ کہاں بیٹھی ہو تم لوگ؟“

بہن نے انگلی سے دور اشارہ کیا۔ وہ اس کے ساتھ چل دیا اور وہاں اس کی دوسری بہن اور بیوی صاحبہ بھی براجمان تھیں۔ بیوی حسب معمول چٹوری بلی کی طرح اپنے سامنے کئی چٹپٹی چیزیں رکھے پوریاں کھانے میں مصروف تھی۔

دونوں کی نظریں ملیں تو بیوی دل فریب انداز سے مسکرا کر شرما گئی۔ کتنی محنت کے بعد بیوی کی صورت نظر آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح سانولی سلونی سی تھی۔ سرخ رنگ

کی شلوار اور تنگ سی قمیص پہنے ہوئے جس میں اس کی چھاتیوں کی ابھری ہوئی گولائیاں صاف نظر آتی تھیں۔ اس کا جسم پہلے ہی کی طرح جاذب تھا......

جگجیت سنگھ ان کے پاس بیٹھ گیا اور دو تین پوریاں بھی کھالیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنا رونا بھی روتا گیا۔ بیوی بولی'' آخر میں کہیں گم نہ ہو جاتی، آپ گھر ہی پر کیوں نہ بیٹھے رہے...... اس قدر دھوپ میں...... خواہ مخواہ......''

اس نے بہنوں کی نظریں بچا کر اس کی بغل میں چٹکی لے لی اور وہ بل کھا کر پرے سرک گئی۔ اس نے بتایا کہ وہ دونوں شملہ کو جانے والے تھے۔

اس کی بیوی حیران رہ گئی۔ اس کے منہ کا نوالہ منہ ہی میں رہ گیا۔ حلق سے اترا ہی نہیں۔ بڑی خوشی ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کتنی خوش ہوگی۔

وہ لوگ جلدی سے میلے کو خیر باد کہہ کر گھر آئے۔ آتے ہی اس کی بیوی نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ ماں نے کہا۔ وہ تیرے ساتھ کیسے جا سکتی ہے۔ ایک تو تم احمق ہو اور تم سے زیادہ وہ احمق ہے جو جھٹ تمہارے ساتھ چلنے پر آمادہ ہوگئی۔

ادھر اس کی بہنیں بھی واویلا کرنے لگیں کہ وہ بھی چلیں گی۔ نہیں تو بھائی کو بھی نہ جانے دیں گی۔ یہ نیا جھنجھٹ آن پڑا۔ اس نے ماں سے کہا'' آخر حرج ہی کیا ہے۔ پہاڑ پر چلی جائے گی تو اس کی صحت اور اچھی ہوجائے گی۔''

اس پر اس کی ماں نے ناک چڑھا کر کہا'' باگورو، باگورو، لفٹی ننٹ بن گیا ہے پر اتنی عقل بھی نہیں سر میں......''

پھر وہ اسے گھر کے ایک کونے میں لے گئی اور اس کے کان میں کھسر پھسر کرنے لگی۔ جگجیت سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کے منہ سے مسرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کی بیوی حاملہ تھی۔ اس نے ماں کو بازوؤں میں جکڑ کر اوپر اٹھا لیا ''افوہ میری اچھی ماں...... میری بہت ہی اچھی ماں...... بول تو کس چیز سے منہ میٹھا کرے گی۔''

ماں خوشی سے پھول کر کپا ہوگئی بولی۔'' ارے پگلے! منہ تو میٹھا کر ہی لوں گی تو یہ

بتا کہ میرا مطلب بھی سمجھ گیا کہ میں کیوں تجھے اسے ساتھ لے جانے سے منع کرتی تھی۔"

"لیکن ماں اس سے کیا ہوتا ہے وہ چلے گی میرے ساتھ، اچھا ہوا جو تو نے بتا دیا۔ میں اس کا سب خیال رکھوں گا...... میں سب کچھ سمجھتا ہوں۔

ماں بگڑ گئی" پھر وہی مرغے کی ایک ٹانگ۔ جب میں نے کہہ دیا نہیں جائے گی۔"

"کیوں ماں! کیوں نہیں جائے گی؟"

"نہیں جائے گی ہزار بار لاکھ بار کہہ دیا نہیں جائے گی۔"

یہ نئی مشکل آن پڑی۔ اس نے منت کر کے کہا" ماں آخر تجھے ہو کیا گیا ہے؟"

" ارے جاہل، ہوش کی دوا لے۔ عورت کے پیٹ میں بچہ ہو اور پہاڑوں پر قلانچیں بھرتی پھرے۔ تیری عقل گھاس چرنے گئی ہے کیا۔"

وہ آگے بڑھ کر ماں کو سمجھانے لگا۔" ماں! دھیرج کر کے میری بات بھی تو سن...... تین چار مہینے کا بچہ تو ہے ہی اس میں پریشانی کی بات کیا ہے؟"

اس پر ماں جھنجھلا کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس نے اس کا منہ بند کر کے کہا" میری بات تو سن لے پہلے مجھے یہ بتا کہ تو پہاڑ کو سمجھتی کیا ہے۔ وہاں ہموار سڑکیں ہوتی ہیں۔ پھر ہر قسم کی سواری مثلاً رکشا ڈانڈی وغیرہ۔ بھلا میں اسے پیدل گھماؤں گا۔ تو نے بھی مجھے ایسا ہی بے وقوف سمجھا ہے۔ میں تجھ سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر دس قدم بھی جانا ہوگا تو میں اسے رکشا پر بٹھا لے جاؤں گا۔"

ان پڑھ ماں نے روتی آواز میں کہا" ارے بیٹا رکشا کیا ہوتی ہے میں نے تو آج ہی نام سنا ہے۔ کیوں بناتا ہے مجھے....."

جگجیت سنگھ نے ماں کو سمجھانے میں اپنی ساری قابلیت صرف کر دی۔ ماں بڑی مشکل سے رضا مند تو ہوگئی لیکن اس کے دماغ میں اب بھی وہی خیال بیٹھا ہوا تھا کہ بیٹا غلطی کر رہا ہے۔ ماں سے جان چھوٹی اور سامان بندھنے لگا تو بہنیں بسورنے لگیں۔ آج

اسے بہنوں پر بڑا غصہ آرہا تھا۔ انہیں اتنی تعلیم بھی نہیں دی گئی کہ اگر میاں بیوی کسی جگہ تفریح کے لیے جارہے ہوں تو دوسروں کو خواہ مخواہ اس میں اپنی ٹانگ نہ اڑانی چاہئے۔

وہ بہنوں کو کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ لیکن اس موقع پر اس کی ماں نے دونوں لڑکیوں کو جھاڑ کر بٹھا دیا۔ ''خبردار! چوٹی کاٹ کر پھینک دوں گی اگر تم میں سے کسی نے ساتھ جانے کا نام بھی لیا تو۔''

اب بہنیں بھائی کی طرف دیکھنے لگیں۔ بھائی نے سر اور آنکھوں کے اشارے سے ظاہر کیا کہ اب وہ کیا کرسکتا تھا۔

بچاری سیدھی سادی بہنیں سمجھتی رہیں کہ بھیا بچارا تو انہیں لے جانے کے لیے تیار تھا۔ ماں نے نہیں جانے دیا۔

ان سب باتوں سے فراغت پاکر اس نے گھڑی دیکھی تو چار بجے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے گاڑی روانہ ہوتی تھی۔ ابھی کافی وقت باقی تھا۔ لیکن وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں کوئی نئی رکاوٹ کھڑی نہ ہوجائے۔ اس لیے اس نے نوکر کو اسی وقت تانگہ لانے کے لیے بھیج دیا۔ ماں کہنے لگی ''بیٹا ایسی بھی کیا جلدی ہے؟''

اس نے بہانہ کیا کہ گاڑی میں بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا ہے۔ تانگہ آیا اور وہ جلدی سے سامان رکھ کر تانگے میں بیٹھ گئے۔ ماں نے بلائیں لیں، دونوں کو تانگہ چل دینے پر بھی پکار پکار کر قیمتی نصیحتیں کرتی رہی۔

جب گھر سے دور چلے آئے تو وہ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا ''بھئی شکر ہے ہزار ہزار جان چھوٹ ہی گئی۔''

اس کی بیوی ہنس کر اس کے قریب ہوگئی اس نے بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''اچھا اب تم بھی مجھ سے باتیں چھپانے لگیں؟''

''میں نے کیا بات چھپائی؟'' اس کی بیوی لاعلمی میں آنکھیں جھپکا کر بولی۔

جگجیت سنگھ نے پیٹ کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے منہ

چھپا کر روٹھ گئی۔ '' آپ بہت بے شرم ہیں اور نہیں تو۔''

'' ہو ہو۔'' جگجیت نے کہا۔'' تم روٹھ گئیں۔ بھئی تمہیں منا لینا کیا مشکل ہے۔ ابھی دو پیسے کے گول گپے کھلا دوں تو خوش ہو جاؤ گی۔''

اس پر اس کی بیوی انگلیوں کے بیچ میں سے دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگی۔

''اچھا واقعی بتاؤ تو کیا کھاؤ گی؟ دہی بڑے، پکوڑے، کلفی ، رس گلے، آئس کریم...... بتاؤ میرے چٹوری بلی!''

'' کھانے بیٹھ جائیں گے تو گاڑی جو چل دے گی۔''

'' ہاہا...... آ گئیں چکمے میں...... بھئی ابھی تو بہت وقت پڑا ہے ۔ میں نے یوں ہی غپ اڑا دی تھی۔ سوچا ذرا ان لوگوں سے جان چھڑا کر بھاگیں۔''

وہ دونوں ایک بہت بڑے ہوٹل میں گھس گئے۔ وہ جان بوجھ کر بیوی کو اس ہوٹل میں لے گیا تھا۔ اب وہ لفٹنٹ ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ذرا بیوی بھی اس کی شان دیکھ لے۔ وہ ایک علاحدہ باکس میں بیٹھ گئے۔ اس کی بیوی کے تر و تازہ حسین چہرے پر حیرت کے آثار کس قدر بھلے معلوم ہوتے تھے۔ پہلے بھی اس نے ہوٹلوں میں کھانا کھایا تھا لیکن ایسے شان دار ہوٹل میں آنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

جگجیت سنگھ نے بٹن دبایا گھنٹی بجی۔ بیرا حاضر ہوا۔ اس نے آرڈر دیا۔

آج وہ بہت خوش تھا۔ اپنی محبوب بیوی کے ساتھ نہ پہلے کبھی اکیلے سفر کیا تھا نہ وہ کبھی اکیلے کسی مقام پر جا کر رہے تھے۔ پھر شملہ جیسے مقام پر وہ دونوں کس قدر لطف اندوز ہوں گے۔

موجودہ لمحہ سے لے کر مکمل دو ہفتوں کی چھٹیاں ختم ہونے تک وہ ایک ایک لمحہ مسرت اور شادمانی میں گزارنا چاہتا تھا۔ آج صبح سے وہ عجب سراسیمگی میں گھومتا رہا۔ وہ سمجھنے لگا کہ یہ بھی واہگورو اکال پرکھ کی کرپا تھی کہ اس کی سب مشکلات آنکھ جھپکتے میں دور ہو گئیں۔

کھانا آیا اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ اس کی بیوی کی شیریں آواز اس کے کانوں میں امرت ٹپکاتی تھی۔ وہ بھی تو از حد خوش تھی۔ مینا کی طرح چہک چہک کر باتیں کر رہی تھی اس کی طفلانہ حرکتیں اور بھی زیادہ مزا دے رہی تھیں۔

وہ بولی "کیوں جی! ہم گوردوارے میں ٹھہریں گے جا کر؟"

"نہیں مائی ڈارلنگ۔ ہم کسی شان دار ہوٹل میں ٹھہریں گے۔ گوردوارے کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہئے۔ گوردوارے پر بوجھ ڈالنے کے بجائے ہمیں اپنے ہاتھ سے وہاں دان کرنا چاہئے۔"

پھر اس نے بیوی کو پہاڑی مقامات کی بابت سب باتیں بتائیں۔ "وہاں مکانات اوپر تلے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب بارش ہوتی ہے تو وہاں ہمارے شہروں کی طرح کیچڑ نہیں ہوتی بلکہ پانی فوراً بہہ جاتا ہے۔ سڑکیں دھل کر صاف ہوجاتی ہیں...... وہاں ہم زمین سے بہت اونچے ہوجائیں گے کبھی...... یہ بادل جو آسمان پر نظر آتے ہیں ہمارے نیچے نظر آنے لگیں گے...... ہاں۔"

اس کی بیوی یہ باتیں سن کر بہت حیران ہوئی۔ کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں خوش خوش باتیں کرتے ہوئے اسٹیشن کی طرف چل دیے۔ تانگے سے سامان اتروا کر قلیوں کے حوالے کیا۔ ابھی گاڑی جانے میں آدھ گھنٹہ باقی تھا اس نے سکنڈ کلاس کے دو ٹکٹ خرید لیے۔

جنگ کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ بہت زیادہ تھی اس لیے وہ دونوں فوراً پلیٹ فارم کی طرف چل دیے۔ بیوی شوہر کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ اس کا طاقت ور اور چوڑے چکلے جسم والا خاوند اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ گاڑی ٹھساٹھس بھری ہوئی تھی۔ سکنڈ کلاس کے صرف ایک ڈبہ میں ایک انگریز کے سوا اور کوئی نظر نہ آتا تھا۔

جگجیت سنگھ دروازہ کھول کر اندر جانے لگا تو انگریز اٹھ کر دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ "کسی اور ڈبے میں بیٹھیے جاکر۔"

وہ بہت حیران ہوا۔ ''اور کوئی ڈبہ خالی نہیں ہے۔''

''خیر اس ڈبے میں نہیں بیٹھنے دوں گا۔''

''کیوں، کیا یہ ریزرو ہو چکا ہے؟''

انگریز نے نتھنے پھلا کر کہا۔ ''ریزرو ہی سمجھ لو۔''

جگجیت سنگھ بہت پریشان ہوا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا، کہیں بھی ریزرو لکھا ہوا نظر نہ آیا۔ ''یہ ریزرو نہیں ہے۔'' یہ کہہ وہ اندر داخل ہونے لگا، تو صاحب نے پھر راستہ روک دیا۔ اس بات پر کچھ تو تو میں میں ہوگئی۔ کچھ لوگ بھی جمع ہو گئے۔ اسٹیشن کا بابو بھی آنکلا۔ جگجیت سنگھ نے بابو کو ساری بات سمجھائی۔ صاحب نے چلاّ کر کہا ''میں اسے اپنے ڈبے میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

بابو نے کہا اسٹیشن ماسٹر سے کہئے۔ جگجیت سنگھ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گیا۔ اس نے آکر صاحب کو سمجھایا لیکن صاحب نے سو سوالوں کا جواب ایک ''نہیں'' میں دے دیا۔ پولس کے کانسٹبل چپ چاپ ادھر اُدھر کھسک گئے۔

اسٹیشن ماسٹر نے سپرنٹنڈنٹ پولس کو فون کیا۔ وہ دفتر میں نہیں تھا اس نے بھی لاچاری ظاہر کی آخر ہو بھی کیا سکتا تھا۔

گاڑی چلنے میں پانچ منٹ باقی رہ گئے تھے جگجیت سنگھ پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ قلی سامان زمین پر رکھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اس کی سرگیں آنکھوں والی بیوی سراسیمگی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ صاحب کھڑکی کے قریب بیٹھا اطمینان سے چرٹ پی رہا تھا۔

مادرِ وطن کے سینے پر مادرِ وطن کی ریل گاڑی کھڑی تھی اور مادرِ وطن کے ایک بیٹے کو اس سرزمین سے ہزارہا میل پر رہنے والا اجنبی گاڑی کے اندر داخل نہیں ہونے دیتا تھا۔ اس کا یہ جائز حق کوئی قانون واپس نہ دلا سکتا تھا۔ جگجیت سنگھ کا جسم تنگ وردی میں جکڑن سی محسوس کرنے لگا...... دفعتاً اس نے قلیوں کو سامان اٹھانے کے لیے کہا اور بیوی کو ساتھ لے کر گاڑی کے اسی ڈبے کی طرف بڑھا۔ پیش تر اس کے کہ صاحب اٹھ

کر اس کا راستہ روکے وہ پھرتی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ صاحب کی گردن پکڑی اور اس کی ٹانگوں میں ہاتھ دیا اور اچھال کر پلیٹ فارم پر پھینک دیا۔ بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیٹ پر بٹھایا۔ قلی سامان لے کر اندر آگئے اور اس نے صاحب کا سامان اٹھا اٹھا کر پلیٹ فارم پر پھینکنا شروع کر دیا۔

صاحب گاڑی کی طرف لپکا۔ جگجیت سنگھ نے گاڑی سے نیچے اتر کر اسے راستہ ہی میں جالیا۔ اس کے گندم گوں ہاتھوں کی گرفت میں صاحب کی ٹائی آ گئی اور دوسرے فولادی ہاتھوں کے دو زناٹے کے تھپڑ اس کے منہ پر پڑے۔ صاحب کی بتیسی ہل گئی اور اسے دن میں تارے نظر آنے لگے۔ وہ تھپڑ کھا کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف اپنے کھلے سوٹ کیس میں جا دھنسا...... اس کش مکش میں اس کے سر سے ہیٹ گر کر جو لڑھکا تو ایک بازاری کتا اسے منہ میں داب کر لے بھاگا۔

اس کے بعد صاحب کو آگے بڑھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جونہی جگجیت سنگھ نے پائیدان پر پاؤں رکھا۔ گاڑی چل دی۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

پتھر کے دیوتا

ستمبر کی ایک خوش گوار شام کو وہ گھر سے باہر نکل گیا۔

شام خوش گوار تھی۔ لیکن اُس کا دل اُداس تھا۔ اداس بھی کیا بہت ملول تھا۔ وہ اس وقت ساری دنیا سے روٹھا ہوا تھا۔ جیسا سبھی کے ساتھ ہوتا ہے کہ بعض اوقات دل اس دنیا سے اُکتا جاتا ہے۔ ہر شے بے کار، بے معنی اور خشک نظر آنے لگتی ہے۔ زندگی اس قابل معلوم ہی نہیں ہوتی کہ اسے بسر کیا جائے۔ اس وقت انسان زندگی، زندگی کے مسائل یا دنیا کی ناپائداری کی بابت سوچنے میں مصروف نہیں ہوتا۔ بلکہ یوں ہی ایک تھکن سی، یا کوئی تاریک بادل سا روح پر چھا جاتا ہے۔ نہ کسی بات پر حیرت ہوتی ہے نہ کسی بات پر شرم محسوس ہوتی ہے۔ نہ کسی چیز پر فخر کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نہ بیٹھا جاتا ہے نہ چلا جاتا ہے، نہ رکا جاتا ہے۔ اس وقت یہی جی چاہتا ہے کہ انسان پٹاخے کی طرح پھٹ کر فضا میں غائب ہوجائے۔ بڑے آرام سے کوئی تکلیف محسوس نہ ہو۔ انسان سو بھی تو جاتا ہے۔ کسی شخص کو مرے ہوئے دیکھتے ہیں تو دل پر خوف طاری ہونے لگتا ہے۔ لیکن جب انسان سو جاتا ہے اُس وقت بھی تو اُدھ مرا ہی سا دکھائی دیتا ہے۔ کم از کم انسان کو اپنے اِرد گرد کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ نہ وہ سنتا ہے۔ نہ دیکھتا ہے نہ بولتا ہے۔ بس اس حالت سے ایک ہی قدم اور آگے بڑھ جائے تو اگلے جہان میں پہنچ جائے۔

کئی دنوں سے اس کی یہی کیفیت تھی۔ اور پھر اس کیفیت میں اگر واقعی کسی تکلیف دہ بات کا اضافہ بھی ہوجائے تو پھر انسان کی حالت مکمل طور پر خراب ہوجاتی ہے۔ یہی اس کا حال تھا— وہ ہر شے سے بے خبر آگے بڑھتا جا رہا تھا لیکن جب منزلِ مقصود سامنے نہ ہو تو پھر قدم بھی عجیب بے ڈھنگے طور پر اٹھتے ہیں۔ وہ اپنے قدموں کے بے ڈھنگے پن سے بے خبر چلا جارہا تھا۔

کہتے ہیں وینس خوب صورت شہر ہے۔ ضرور ہوگا۔ خشکی پر رہنے والوں کے لیے یہ حقیقت از بس خیال انگیز ہے کہ وینس کی گلیوں اور بازاروں میں پانی ہی پانی ہے وہ لوگ ہماری طرح گھر سے نکلتے ہیں تو خشکی پر نہیں چلتے۔ بلکہ وہاں ہر گھر کے آگے دو تین چھوٹے چھوٹے ڈونگے بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب گھر کے کسی فرد کو باہر کسی کام سے جانا ہوتا ہے وہ اپنے دروازے ہی سے ڈونگے پر بیٹھ جاتا ہے اور اسے کھیتا ہوا منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوجاتا ہے۔ ایسے شہر کی خوب صورتی سے کسی کو انکار کب ہوسکتا ہے۔ لیکن ناسک بھی کچھ کم خوب صورت شہر نہ تھا۔ اگر چہ اُس کی خوب صورتی کسی اور پہلو سے تھی۔ یہ شہر نہ چھوٹا نہ بڑا۔ صاف ستھری گلیاں، خوب صورت لال پیلی عمارتیں، نواح میں ہر طرف ہرے بھرے کھیت اور چھوٹی چھوٹی بہت ہی حسین پہاڑیاں اور پھر شہر کے بیچوں بیچ گوداوری ندی۔ شاید دنیا میں اور شہر بھی ہوں۔ لیکن جس طرح گوداوری ندی اس شہر میں بہتی تھی وہ کچھ اسی کا حصہ تھا۔ دوسرے شہروں کے دریا۔ مثلاً سری نگر کا جہلم شہر میں سے ہو کر بہتے ہوئے بھی شہر والوں سے کچھ تعلق نہیں پیدا کرتا۔ وہ ان سے علاحدہ رہتا ہے۔ وہ اپنے کناروں پر بنے ہوئے مکانات کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔ لیکن گوداوری ندی میں یہ بات نہ تھی۔ وہ شہر کی عمارتوں اور عمارتوں کے دروازوں اور دروازوں کے آگے بنے ہوئے چبوتروں سے کچھ اس طرح گھل مل گئی تھی کہ وہ بھی شہر کا ایک حصہ ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی برسات میں یہ چھوٹی سی ندی بھی کسی چڑھتی آندھی کی طرح بال بکھرا لیتی تھی۔ ورنہ عام طور پر وہ غضب میں کبھی نہ آتی تھی۔ شہر کے لڑکے بالے اُس کی گود میں کھیلتے پھرتے تھے۔ اس کا پانی گہرا اور خوف ناک نہ تھا۔ بلکہ اُتھلا، سرد اور دل کش تھا۔ اس ندی کے درشن کر کے شہر کے لوگوں کی طبیعت

ایک مرتبہ تو جھوم اٹھتی تھی...... خود اُسی پر یہ ردِعمل ہوا کرتا تھا۔ لیکن آج جب وہ ندی کے کنارے پر ایک چٹان سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوا تو وہ ندی کی طرف ایسی کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ اُسے پہچانتا ہی نہ ہو۔ یہ کتنی بری بات ہے کہ انسان جس شخص کو اچھی طرح جانتا پہچانتا ہو اس کی طرف کبھی ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے وہ اس کے لیے پردیسی ہو۔ شہر کے لوگوں کی اس مانوس ندی کو اس نے کئی مرتبہ ہم راز بنایا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اس کے صاف اور شفاف پانی کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور اُسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ بھی اکثر اسی طرح مسکرائی تھی۔ یہ تو محض انسان کی حماقت تھی کہ اس نے بے جاں چیزوں سے ہر قسم کا ناتا توڑ لیا تھا۔ جنگل میں کھلے ہوئے پھولوں سے چراگاہوں میں اُگی ہوئی گھاس سے، ڈھلواں زمینوں پر کھڑے ہوئے درختوں سے، برف کے تاج پہنے ہوئے پہاڑوں سے، چٹانوں کی دراڑوں میں سے پھوٹتے ہوئے سوتوں سے، نشیب و فراز پر چمکتی ہوئی دھوپ سے، ویران جگہوں میں آوارہ پھرتی ہوئی عجیب سی خوش بو سے...... یہ سب چیزیں انسان سے باتیں کرتی ہیں۔ اگر اُن کی طرف رجوع کیا جائے تو وہ مسکراتی ہیں۔ شرارتیں کرتی ہیں، روٹھتی ہیں، بسورتی ہیں اور دوستی اور رفاقت کا دم بھرتی ہیں۔ ان کی قربت میں کیسا دائمی سرور محسوس ہوتا ہے۔ وہ صرف محسوس کرنے والی چیزیں ہیں۔ الفاظ اس قدر کثیف ہیں کہ ان کی لطافت کو بیان کر ہی نہیں سکتے...... ان سب چیزوں کو چھوڑ کر انسان کیا لے بیٹھا۔ معاشیات، سیاسیات، نفسیات، نہ معلوم کیا اَلم غلم۔ یوں انسان کا جی چاہے تو کسی قسم کی بھی زنجیروں میں اپنے ہاتھ پاؤں جکڑ کر خود اپنی زندگی مصیبت میں ڈال لے اُسے کون منع کرسکتا ہے۔ لیکن زندگی کے اصول چند ہی ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورتیں انگلیوں پر گنی جاسکتی ہیں۔ انسان کے لیے دنیا کے کھیتوں میں کھانے کے لیے ضرورت سے زیادہ اناج پیدا ہوتا ہے۔ اور اگر اُسے تن ڈھانکنے کی واقعی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو اس کی بھی کوئی کمی نہیں۔ دور دراز علاقوں میں پہاڑیاں چنچل چھوکریوں کی طرح پنجوں کے بل کھڑی انسان کی راہ تک رہی ہیں۔ درخت، دریا، پہاڑ، کھلی ہوا، وسعت، لامحدود مسرت، مکمل اطمینان یہ سب انسانوں ہی کے منتظر ہیں۔ لیکن انسان ضدی اور لڑاکا بچوں کی طرح

یوں ہی لٹوؤں پر ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹول کر رہے ہیں۔ کپڑے کی گڑیوں کے لیے ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچے ڈالتے ہیں۔ بھدی آواز سے بجنے والے جھنجھنوں کے لیے ایک دوسرے کے ٹینٹوے دبا رہے ہیں۔ خود اُس نے ان حقائق کو محسوس کیا تھا۔ وہ گھنٹوں اس ندی کے کنارے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ پانی کی طرف تاکتا رہتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پانی میں بھی زندگی کی تڑپ ہے۔ وہ بھی محسوس کرتا ہے۔ وہ خوش بھی ہوتا ہے۔ ہنستا ہے۔ بلکتا ہے...... اگر انسان بہت دیر تک ان سے لو لگائے رکھے تو اُسے ایک جہان نظر آنے لگتا ہے۔ محبت، یکجہتی، یگانگت کی نئی پریت لڑی دکھائی دیتی ہے جس میں ہر شے پروئی نظر آنے لگتی ہے۔ اس رشتے سے کوئی چیز غیر یا اجنبی دکھائی نہیں دیتی۔ سب کا کوئی ایک ہی رکھوالا نظر آنے لگتا ہے۔ جو صبحِ ازل سے قدم اٹھاتا ہوا اس دھرتی اور بے شمار دھرتیوں پر چل رہا ہے۔ اس قسم کی باتیں سوچتے سوچتے اُسے سوامی رام تیرتھ کا خیال آجاتا ہے۔ لوگ اُس کی موت کو ایک راز سمجھتے ہیں۔ لیکن سمجھنے والوں کے لیے اُس کی موت کس قدر کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

شام کے وقت ندی پر سیر کرنے والوں کے گروہ کے گروہ اِدھر اُدھر مٹر گشت کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں شہر کے سبھی لوگ شامل ہوتے تھے۔ امیر، غریب، بچے، بوڑھے، عورتیں، مرد اور گوداوری ندی ہر ایک سے بات کرنے کو تیار تھی۔ ہر ایک کے ساتھ گھل مل کر بیٹھنے پر آمادہ تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ برے معنوں میں ہر جائی تھی۔ بلکہ اُس کی محبت اس قدر بے کراں اور اس کا دامن اس قدر وسیع تھا۔

جب لوگ تفریح کے لیے وہاں جمع ہوتے تھے تو پھر کچھ جھابڑی والوں کا وہاں آنا لازمی تھا۔ چاٹ، دہی بڑے، پکوڑی، گول گپے، چنے، کچالو۔ سب ہی کچھ بکتا تھا۔ لوگ چٹانوں پر بیٹھے ٹانگیں۔ ہلا ہلا کر مزے مزے میں دہی بڑے کھایا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ پھولوں کے گجرے بیچنے والے بھی آیا کرتے تھے۔ چنبیلی کی ادھ کھلی کلیوں یا پھولوں کے خوب صورت ہار ہوا میں لہراتے تھے۔ نوجوان مرد ایک آدھ ہار خرید کر کانوں میں لپیٹ لیتے اور اور انکھیوں سے اپنی ہم عمر معشوقاؤں کی طرف دیکھتے۔ چاندی کے

اوراق میں لپٹے ہوئے پانوں کی تھالیاں پنوازی ہتھیلیوں پر دھرے اِدھر اُدھر گماتے پھرتے تھے۔

وہ زیادہ بھیڑ بھاڑ سے بچ کر ایک جانب ایک چھوٹے سے پتھر پر بیٹھا تھا۔ ندی کا پانی تلملاتا اور گاتا ہوا اُس کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اتنے میں اُس کے قریب ایک خوب صورت لڑکی آن کھڑی ہوئی۔ وہ پھولوں کے ہار بیچنے والی تھی۔

اُس نے نظر اٹھا کر لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ اکہرے بدن کی کم سن لڑکی تھی۔ کم سن سے مراد یہ کہ پورے جو بن پر نہ آئی تھی۔ شباب کی طرف قدم بڑھا چکی تھی۔ بیضوی چہرہ تھا۔ بڑی خوب صورت رنگت تھی۔ بڑی بڑی متجسس آنکھیں خم دار لچکتے ہوئے ابرو، پھڑکتے ہوئے نتھنے، نازک مخملیں لب، میگوں ہونٹ، اس نے ناسک کی عورتوں کے رواج کے مطابق باریک کپڑے کا ایک شلوکا پہن رکھا تھا۔ جس میں سے اُس کی بہت چھوٹی چھوٹی چھاتیوں کے اُبھار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اُس کے پیٹ ناف اور کمر پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ اُس کے بدن سے عجب تازگی اور اچھوتا پن ٹپکتا تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ ان سب ہاروں میں آدھے ہار اپنے گلے میں پہن لے اور آدھے اُس کے گلے میں پہنادے اور پھر اس کی ننگی کمر بازوؤں میں اس طرح لے لے کہ اس کا ہاتھ اس کے پیٹ کو چھو رہا ہو۔ اور وہ اس طرح باتیں کرتے ایک دوسرے کا منہ چومتے ہوئے دور کھیتوں، جنگلوں، پہاڑوں کی طرف نکل جائیں اور پھر کھلے آسمان کے تلے نم دار زمین پر وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹ کر لیٹ جائیں...... لیکن یہ سب کچھ ممکن نہیں تھا۔ کیوں؟

اس لیے کہ وہاں جنگلوں میں پکی پکائی روٹیاں نہیں مل سکتی تھیں۔ وہ لڑکی روٹی کے بغیر ایک رات بھی اس سے لپٹ کر سونا پسند نہ کرے۔ اور روٹیوں کے بغیر دوسرے روز ہی وہ خود یہ رومان اور عشق بھول جائے۔ روٹیوں کے لیے گیہوں کی ضرورت تھی۔ گیہوں جبھی مل سکتا تھا کہ انسان کے جیب میں پیسے ہوں اور پیسے؟...... پیسے دفتر میں

کلرکی ہی کرنے سے مل سکتے تھے۔ اور کلرکی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ کہاں ملتی ہے؟ کیسے ملتی ہے؟ کیا بھاؤ بکتی ہے۔

کلرکی نبھانے کے لیے اُسے اپنے خون سے تو سینچنا ہی پڑتا ہے لیکن ان سب باتوں سے پہلے اُسے حاصل کرنا ایک معمہ تھا۔ اس معمہ کا ایک ہی حل تھا۔ وہ یہ کہ اپنی خود داری کو دفن کر ڈالے عزت بیچ کر وہ خاک میں مل جائے۔ اتنی قربانی اور انکساری کی کسی بڑی سے بڑی تپسیا میں بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ لیکن پیٹ کے لیے ایندھن — دنیا میں سب سے بڑی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو پورا کرنا دنیا کی بڑی سے بڑی تپسیا سے بھی تپسیا۔ دوسری تپسیاؤں کی اس کے سامنے وقعت ہی کیا تھی پر ماتما کے لیے۔ اور اگر پرماتما نہ بھی ملا تو کیا بگڑ جائے گا انسان کا۔ کیوں نہ پرماتما کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ اپنے حال میں مست ہے تو انسان اپنی کھال میں مست رہے، مکتی کے لیے؟ مکتی بھی نہ ہو تو کیا ہرج ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انسان واقعی مکت ہوجائے گا۔ لیکن سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ اگر پرماتما کو حاصل کرنے یا مکتی حاصل کرنے کی تپسیا مکمل ہونے سے پہلے ہی جسم اور روح کا ناتا ٹوٹ جائے...... صرف روٹی کے ایک ٹکڑے کے نہ ملنے کی وجہ سے مرجانا۔ انسانیت کی توہین نہیں تو پھر کیا ہے۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی بھوکا ہے، ان بڑے بڑے آرٹسٹوں اور مفکروں، سیاست دانوں، مہاتماؤں، لیڈروں، مہاپرشوں اور سائنس دانوں کا فائدہ ہی کیا ہے؟ کیوں نہ ان سب کی گردنوں میں چکیوں کے پاٹ باندھ کر انہیں سمندر میں پھینک دیا جائے۔

اب وہ بے کاری سے تنگ آچکا تھا۔ اس مرض سے دنیا میں کوئی دوست، کوئی ہمدرد، کوئی سوسائٹی یا سبھا، کوئی حکومت، کوئی پرماتما نجات نہ دلوا سکتا تھا۔ وہ اس پردیس میں بھاگا بھاگا کیوں آیا۔ کیوں بیٹھے بٹھائے اس کی پر امن زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آگیا۔ یہ اُس کا گھریلو معاملہ تھا۔ ابھی تک یہ سب صیغۂ راز میں تھا۔ یہ ایک قابلِ شرم

اور قابلِ افسوس بات تھی۔ یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ وہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ کرسکتا تھا۔ اس کے گھر والے ایک ہی روز میں تقریباً کنگال ہوگئے وہ کسی کو کیوں کر بتا سکتا تھا۔ وہ اس پردیس میں نوکری کی تلاش میں آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر کچھ عارضی کام کیا بھی۔ لیکن چوں کہ یہ اسامیاں عارضی ہوتی تھیں۔ اس لیے مقررہ زمانہ ختم ہوجانے کے بعد اُسے پھر بے کار گھومنا پڑتا تھا۔ وہ گھر پر اپنی ماں کو روپیہ بھیجتا رہا تھا۔ یوں ہی کچھ تھوڑا بہت روپیہ اس کی ماں کے پاس بھی تھا۔ گھر کے اخراجات چلتے رہے۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے نہ اُسے کسی قسم کے کام کی کوئی صورت نظر آئی نہ گھر سے بار بار تاکید کی چٹھیاں ہی آنا بند ہوئیں۔ یہاں اس کا ایک ہی دوست تھا جو اگرچہ اُسی جگہ اُس کا نیا ہی دوست بنا تھا۔ لیکن اُسے اس پر پورا پورا اعتماد تھا۔ وہ اس پر بھروسہ کرسکتا تھا۔ یہی اس کے ضمیر کی آواز تھی۔ اس لیے وہ اس سے کھل کر باتیں بھی کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اُسے اپنا راز داں بھی بنا لیا۔ اپنا سارا حال کہہ سنایا کہ اس کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بیوہ ماں تھی—— اور وہ حادثہ؟

اس کی نوجوان بہن جو اس سے دو ہی برس چھوٹی تھی نہ معلوم کس بدمعاش کے پھندے میں پھنس کر گھر سے بھاگ نکلی۔ اس لڑکی کو فلمی رسالے پڑھ پڑھ کر فلموں میں کام کرنے کا شوق چرایا۔ اور ایسی بے وقوف چڑیا کو پھانسنے والا کوئی چڑی مار بھی اُدھر آنکلا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اس نے ایسی الٹی پٹی پڑھائی کہ شریف زادی ایک رات چپکے سے اُس کے ساتھ کسی طرف کو کھسک گئی اور پھر جاتے جاتے گھر کے سب زیورات اور نقدی بھی سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ کیا دنیا میں اس قسم کی باتیں بھی ممکن ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ اس قسم کی خبریں آئے دن اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کلموئی سے کوئی پوچھے کہ اگر تجھے ضرور ہی جھک مارنے تھی تو خود دفع ہوجاتی۔ لیکن گھر میں جھاڑو کیوں پھیر گئی۔ ڈائن تجھے اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں کا خیال نہ آیا۔ اس بیوہ ماں پر بھی ترس نہ آیا جس نے پال پوس کر تجھ رانڈ کو اتنا بڑا کیا

کلرکی ہی کرنے سے مل سکتے تھے۔ اور کلرکی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ کہاں ملتی ہے؟ کیسے ملتی ہے؟ کیا بھاؤ بکتی ہے۔

کلرکی نبھانے کے لیے اُسے اپنے خون سے تو سینچنا ہی پڑتا ہے لیکن ان سب باتوں سے پہلے اُسے حاصل کرنا ایک معمہ تھا۔ اس معمہ کا ایک ہی حل تھا۔ وہ یہ کہ اپنی خود داری کو دفن کر ڈالے عزت بیچ کر وہ خاک میں مل جائے۔ اتنی قربانی اور انکساری کی کسی بڑی سے بڑی تپسیا میں بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ لیکن پیٹ کے لیے ایندھن—— دنیا میں سب سے بڑی ضرورت تھی اور اس ضرورت کو پورا کرنا دنیا کی بڑی سے بڑی تپسیا سے بھی تپسیا۔ دوسری تپسیاؤں کی اس کے سامنے وقعت ہی کیا تھی پرماتما کے لیے۔ اور اگر پرماتما نہ بھی ملا تو کیا بگڑ جائے گا انسان کا۔ کیوں نہ پرماتما کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر وہ اپنے حال میں مست ہے تو انسان اپنی کھال میں مست رہے، مکتی کے لیے؟ مکتی بھی نہ ہو تو کیا ہرج ہے۔ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انسان واقعی مکت ہوجائے گا۔ لیکن سب سے بڑا سوال تو یہ تھا کہ اگر پرماتما کو حاصل کرنے یا مکتی حاصل کرنے کی تپسیا مکمل ہونے سے پہلے ہی جسم اور روح کا ناتا ٹوٹ جائے...... صرف روٹی کے ایک ٹکڑے کے نہ ملنے کی وجہ سے مرجانا۔ انسانیت کی توہین نہیں تو پھر کیا ہے۔ جب تک دنیا میں ایک آدمی بھی بھوکا ہے، ان بڑے بڑے آرٹسٹوں اور مفکروں، سیاست دانوں، مہاتماؤں، لیڈروں، مہارشوں اور سائنس دانوں کا فائدہ ہی کیا ہے؟ کیوں نہ ان سب کی گردنوں میں چکیوں کے پاٹ باندھ کر انہیں سمندر میں پھینک دیا جائے۔

اب وہ بے کاری سے تنگ آچکا تھا۔ اس مرض سے دنیا میں کوئی دوست، کوئی ہمدرد، کوئی سوسائٹی یا سبھا، کوئی حکومت، کوئی پرماتما نجات نہ دلوا سکتا تھا۔ وہ اس پردیس میں بھاگا بھاگا کیوں آیا۔ کیوں بیٹھے بٹھائے اس کی پرامن زندگی میں اتنا بڑا انقلاب آگیا۔ یہ اُس کا گھریلو معاملہ تھا۔ ابھی تک یہ سب صیغۂ راز میں تھا۔ یہ ایک قابلِ شرم

اور قابلِ افسوس بات تھی۔ یہ ایک بہت بڑا حادثہ تھا۔ وہ یہ راز کسی پر ظاہر نہ کرسکتا تھا۔ اس کے گھر والے ایک ہی روز میں تقریباً کنگال ہوگئے وہ کسی کو کیوں کر بتا سکتا تھا۔ وہ اس پردیس میں نوکری کی تلاش میں آیا۔ اس نے اِدھر اُدھر کچھ عارضی کام کیا بھی۔ لیکن چوں کہ یہ اسامیاں عارضی ہوتی تھیں۔ اس لیے مقررہ زمانہ ختم ہوجانے کے بعد اُسے پھر بے کار گھومنا پڑتا تھا۔ وہ گھر پر اپنی ماں کو روپیہ بھیجتا رہا تھا۔ یوں ہی کچھ تھوڑا بہت روپیہ اس کی ماں کے پاس بھی تھا۔ گھر کے اخراجات چلتے رہے۔ لیکن اب کچھ عرصہ سے نہ اُسے کسی قسم کے کام کی کوئی صورت نظر آئی نہ گھر سے بار بار تاکید کی چٹھیاں ہی آنا بند ہوئیں۔ یہاں اس کا ایک ہی دوست تھا جو اگرچہ اُسی جگہ اُس کا نیا ہی دوست بنا تھا۔ لیکن اُسے اس پر پورا پورا اعتماد تھا۔ وہ اس پر بھروسہ کرسکتا تھا۔ یہی اس کے ضمیر کی آواز تھی۔ اس لیے وہ اس سے کھل کر باتیں بھی کر لیا کرتا تھا۔ اس نے اُسے اپنا راز داں بھی بنا لیا۔ اپنا سارا حال کہہ سنایا کہ اس کے دو بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ بیوہ ماں تھی—— اور وہ حادثہ؟

اس کی نوجوان بہن جو اس سے دو ہی برس چھوٹی تھی نہ معلوم کس بدمعاش کے پھندے میں پھنس کر گھر سے بھاگ نکلی۔ اس لڑکی کو فلمی رسالے پڑھ پڑھ کر فلموں میں کام کرنے کا شوق چرایا۔ اور ایسی بے وقوف چڑیا کو پھانسنے والا کوئی چڑی مار بھی اُدھر آنکلا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ اس نے ایسی الٹی پٹی پڑھائی کہ شریف زادی ایک رات چپکے سے اُس کے ساتھ کسی طرف کو کھسک گئی اور پھر جاتے جاتے گھر کے سب زیورات اور نقدی بھی سمیٹ کر اپنے ساتھ لے گئی۔ کیا دنیا میں اس قسم کی باتیں بھی ممکن ہیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت تھی۔ اس قسم کی خبریں آئے دن اخباروں میں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ اس کلموئی سے کوئی پوچھے کہ اگر تجھے ضرور ہی جھک مارنے تھی تو خود دفع ہوجاتی۔ لیکن گھر میں جھاڑو کیوں پھیر گئی۔ ڈائن تجھے اپنے چھوٹے بھائی اور بہنوں کا خیال نہ آیا۔ اس بیوہ ماں پر بھی ترس نہ آیا جس نے پال پوس کر تجھ رانڈ کو اتنا بڑا کیا

کہ اب تو نصیبوں پھوٹی ایکٹریس بننے چلی...... بہت بڑی رقم تھی جو وہ اپنے ساتھ لے کر چلتی بنی۔ اس کے چلے جانے کے بعد ایک تو بدنامی کا ڈر۔ دوسرے روپے کی تنگی۔ گھر میں اور بچے ابھی چھوٹے تھے۔ ان میں سے دو اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان سب کے اخراجات کے لیے یوں ہی گھر میں کوئی گری پڑی چیز باقی رہ گئی۔ ورنہ اس کوکھ جلی بہن نے تو خوب ہاتھ صاف کیا۔ کس پچھلے جنم کا بیر نکالا چڑیل نے؟ ......سو بھائی کو اپنی تعلیم بھی ادھوری چھوڑ کر پردیس کو بھاگنا پڑا۔ شہر میں گھر بدل کر دوسرے مکان میں چلے گئے تاکہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ تم کو دوست سمجھ کر سب حال بتا دیا۔ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ یہ کس قدر نازک معاملہ ہے۔ بھائی میرے! یہ بات بس کسی اور کے کان تک نہ پہنچے۔ حد سے زیادہ تاکید ہے۔ یہاں پردیس میں اور کون تھا جسے یہ بتلا کر دل کی بھڑاس نکالتا۔ اب ہمارا تمہارا زیادہ فرق نہیں رہا۔ پھر سے تاکید ہے کہ یہ بات کہیں ظاہر نہ ہونے پائے— اُس کے دوست کی صورت سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ باتیں سن کر اُس کے دل کو بہت دکھ پہنچا ہے۔ وہ اس کی مصیبت کو خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی ملازمت ڈھونڈ نکالے گا— اور واقعی چند روز بعد اُسے یہ خوش خبری ملی کہ اُسے ایک ہندوستانی فرم میں کلرکی کی اسامی پر مقرر کر دیا جائے گا۔ سرکاری نوکری ہوتی تو بہتر تھی۔ لیکن خیر اس میں کیا مضائقہ ہے۔ بعض اوقات دیسی مالکوں سے بھی انسان کی پٹ جاتی ہے تو پھر پو بارہ ہوجاتے ہیں۔

وہ مقررہ دن کو منیجر سے ملنے کے لیے اُس کے دفتر میں پہنچا۔ وہ سفارشی آدمی تھا۔ منیجر نے بڑی رعونت سے اُس کو سر سے پاؤں تک دیکھا...... تمہارا ہی نام......؟''

''جی ہاں''

''کہیں اور کام بھی کیا ہے؟''

اُس نے ذرا تفصیل کے ساتھ سب باتیں بتلائیں۔ منیجر نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا'' اچھا تو تم عرضی لکھ کر ہمیں دے دو۔ درحقیقت ہمیں زیادہ تجربہ کار شخص کی

ضرورت ہے۔ لیکن چوں کہ تمہاری سفارش زبردست ہے مجھے خود مسٹر تیواری نے آ کر کہا ہے۔ اور پھر تم مصیبت زدہ ہو......"

"مصیبت زدہ؟"

"......... میرا خیال یہی ہے کہ تم بڑے بھائی تھے تم ذرا ہوش سے......"

وہ پتھر کی طرح جامد کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ اُسے نہیں معلوم کہ اس نے کیا کیا باتیں کہہ ڈالیں۔ اس کی روح پر ایک بادل سا چھا گیا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکا' کچھ سن نہ سکا' کچھ بول نہ سکا...... وہ وہاں سے چپ چاپ واپس چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے تکیہ میں منہ چھپا لیا۔ وہ رو نہ سکا۔ لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکلتے تھے۔ اتنی دور غریب الوطنی میں اُسے یہ دکھ سہنا پڑے گا؟ وہ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ یہ اس کے دوست نے کیا کیا۔ شاید وہ یہ سمجھا کہ اُسے نوکری چاہیئے ہر ممکن قیمت پر۔ خاندان کی بے عزتی کا بھانڈا پھوڑ کر...... کیا اس افسوس ناک واقعہ کو حیلہ بنائے بغیر ملازمت تک نہ مل سکتی تھی۔ در اصل سمجھ دار دشمن اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جس قدر احمق دوست۔ وہ منصور اور شبلی والا قصہ ہوا۔ منصور کو سنگسار کیے جانے کا حکم صادر ہوا۔ سرِ بازار اُن پر پتھر پھینکے گئے۔ اُن کا جسم لہولہان ہوگیا۔ لیکن وہ قہقہے لگاتے رہے۔ پتھر مارنے والوں کی نفرت اور ان کے پتھر اُن پر کچھ بھی اثر نہ کر سکے۔ وہ اُن سے بے پروا رہے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں لاعلمی کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی بے عقلی کے سبب ان پر خفا ہونا عبث تھا۔ لیکن جب وہاں اُن کے جگری دوست شبلی آ نکلے تو وہ حکم شریعت کے خلاف بھی قدم نہ اٹھا سکے اور وہ اپنے دوست کو پتھر بھی نہ مارنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک پھول پھینک دیا۔ پھول کا منصور کے جسم کو چھونا تھا کہ وہ چیخ اٹھے...... یہی حرکت اس کے دوست نے اس کے ساتھ کی۔ لیکن کیا واقعی اس نے یہ راز منیجر کو صرف اس لیے بتایا کہ اُسے ملازمت مل سکے یا معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین تھا......؟"

کہ اب تو نصیبوں پھوٹی ایکٹریس بننے چلی...... بہت بڑی رقم تھی جو وہ اپنے ساتھ لے کر چلتی بنی۔ اس کے چلے جانے کے بعد ایک تو بدنامی کا ڈر۔ دوسرے روپے کی تنگی۔ گھر میں اور بچے ابھی چھوٹے تھے۔ ان میں سے دو اسکول میں پڑھتے تھے۔ ان سب کے اخراجات کے لیے یوں ہی گھر میں کوئی گری پڑی چیز باقی رہ گئی۔ ورنہ اس کوکھ جلی بہن نے تو خوب ہاتھ صاف کیا۔ کس پچھلے جنم کا بیر نکالا چڑیل نے؟ ......سو بھائی کو اپنی تعلیم بھی ادھوری چھوڑ کر پردیس کو بھاگنا پڑا۔ شہر میں گھر بدل کر دوسرے مکان میں چلے گئے تاکہ راز افشا نہ ہونے پائے۔ تم کو دوست سمجھ کر سب حال بتا دیا۔ تم خود ہی سمجھ سکتے ہو کہ یہ کس قدر نازک معاملہ ہے۔ بھائی میرے! یہ بات بس کسی اور کے کان تک نہ پہنچے۔ حد سے زیادہ تاکید ہے۔ یہاں پردیس میں اور کون تھا جسے یہ بتلا کر دل کی بھڑاس نکالتا۔ اب ہمارا تمہارا زیادہ فرق نہیں رہا۔ پھر سے تاکید ہے کہ یہ بات کہیں ظاہر نہ ہونے پائے— اُس کے دوست کی صورت سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ باتیں سن کر اُس کے دل کو بہت دکھ پہنچا ہے۔ وہ اس کی مصیبت کو خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی نہ کوئی ملازمت ڈھونڈ نکالے گا— اور واقعی چند روز بعد اُسے یہ خوش خبری ملی کہ اُسے ایک ہندوستانی فرم میں کلرکی کی اسامی پر مقرر کر دیا جائے گا۔ سرکاری نوکری ہوتی تو بہتر تھی۔ لیکن خیر اس میں کیا مضائقہ ہے۔ بعض اوقات دیسی مالکوں سے بھی انسان کی پٹ جاتی ہے تو پھر پو بارہ ہوجاتے ہیں۔

وہ مقررہ دن کو منیجر سے ملنے کے لیے اُس کے دفتر میں پہنچا۔ وہ سفارشی آدمی تھا۔ منیجر نے بڑی رعونت سے اُس کو سر سے پاؤں تک دیکھا......تمہارا ہی نام......؟"

"جی ہاں"

"کہیں اور کام بھی کیا ہے؟"

اُس نے ذرا تفصیل کے ساتھ سب باتیں بتلائیں۔ منیجر نے سب کچھ سن لینے کے بعد کہا "اچھا تو تم عرضی لکھ کر ہمیں دے دو۔ درحقیقت ہمیں زیادہ تجربہ کار شخص کی

ضرورت ہے۔ لیکن چوں کہ تمہاری سفارش زبردست ہے مجھے خود مسٹر تیواری نے آ کر کہا ہے۔ اور پھر تم مصیبت زدہ ہو......''

''مصیبت زدہ؟''

''........... میرا خیال یہی ہے کہ تم بڑے بھائی تھے تم ذرا ہوش سے......''

وہ پتھر کی طرح جامد کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ اُسے نہیں معلوم کہ اس نے کیا کیا باتیں کہہ ڈالیں۔ اس کی روح پر ایک بادل سا چھا گیا۔ وہ کچھ سوچ نہ سکا' کچھ سن نہ سکا' کچھ بول نہ سکا...... وہ وہاں سے چپ چاپ واپس چلا آیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے تکیہ میں منہ چھپا لیا۔ وہ رو نہ سکا۔ لیکن اُس کی آنکھوں سے آنسو بھی نہ نکلتے تھے۔ اتنی دور غریب الوطنی میں اُسے یہ دکھ سہنا پڑے گا؟ وہ اس کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ یہ اس کے دوست نے کیا کیا۔ شاید وہ یہ سمجھا کہ اُسے نوکری چاہئے ہر ممکن قیمت پر۔ خاندان کی بے عزتی کا بھانڈا پھوڑ کر...... کیا اس افسوس ناک واقعہ کو حیلہ بنائے بغیر ملازمت تک نہ مل سکتی تھی۔ در اصل سمجھ دار دشمن اتنا نقصان نہیں پہنچاتے جس قدر احمق دوست۔ وہ منصور اور شبلی والا قصہ ہوا۔ منصور کو سنگسار کیے جانے کا حکم صادر ہوا۔ سرِ بازار اُن پر پتھر پھینکے گئے۔ اُن کا جسم لہولہان ہو گیا۔ لیکن وہ قہقہے لگاتے رہے۔ پتھر مارنے والوں کی نفرت اور ان کے پتھر اُن پر کچھ بھی اثر نہ کر سکے۔ وہ اُن سے بے پروا رہے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ لوگ جو کچھ کر رہے ہیں لاعلمی کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ ان لوگوں کی بے عقلی کے سبب ان پر خفا ہونا عبث تھا۔ لیکن جب وہاں اُن کے جگری دوست شبلی آ نکلے تو وہ حکم شریعت کے خلاف بھی قدم نہ اٹھا سکے اور وہ اپنے دوست کو پتھر بھی نہ مارنا چاہتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک پھول پھینک دیا۔ پھول کا منصور کے جسم کو چھونا تھا کہ وہ چیخ اٹھے...... یہی حرکت اس کے دوست نے اس کے ساتھ کی۔ لیکن کیا واقعی اس نے یہ راز منیجر کو صرف اس لیے بتایا کہ اُسے ملازمت مل سکے یا معاملہ اس سے بھی زیادہ سنگین تھا......؟''

وہ دیر تک اسی طرح کمرے میں پڑا رہا جب شام ہوگئی تو وہ اٹھ بیٹھا۔ دنیا بے کیف سی نظر آ رہی تھی۔ وہ اس لنگڑے کے مانند تھا جس کی کھوکھلی بیساکھیاں دفعتاً ٹوٹ کر گر پڑیں۔ وہ از حد پریشان تھا۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کیا کرے؟ کدھر جائے؟ کس سے کہے؟

وہ دروازے میں سے نکل کر گوداوری کے کنارے جا پہنچا۔ لیکن اس کا دھیان کسی اور ہی طرف تھا۔ چھا بڑی والوں کی صدائیں۔ عورتوں کے دل کش قہقہے۔ ہجوم کی ملی جلی اڑتی ہوئی صدائیں...... تنگ شلو کے پہنے ہوئے بانکی عورتیں ...... سب کچھ اس کے لیے نہ صرف بے معنی تھا بلکہ بے حقیقت بھی۔ وہ اس چھوٹے سے پتھر پر بیٹھا ہوا چمیلی کے ہار بیچنے والی لڑکی کی طرف اس طرح کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھنے لگا کہ لڑکی پریشان سی ہو کر پرے چلی گئی۔ اور وہ اُسی جگہ بیٹھا رہا......

آج اُسے پانی کی روانی، بنسریوں کی تانوں، پھولوں کی آوارہ خوشبو جوبن کی متوالیوں کی اٹکھیلیوں غرض کسی شے سے کوئی دلچسپی محسوس نہ ہو رہی تھی۔ دراصل وہ گھر سے اس نیت سے چلا بھی نہیں تھا۔ وہ یوں ہی بے خیالی میں اس طرف چلا آیا۔ وہ عادتاً یہاں آیا تھا۔ اس کا دماغ اور خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ پاؤں ندی کی طرف اٹھنے لگے...... یہاں پہنچ کر وہ بے چین سا ہوگیا وہ پتھر سے اٹھا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ایک سڑک پر ہولیا۔

سڑک کے دونوں کناروں پر پام کے درخت کھڑے تھے۔ صاف ستھری سڑکوں کے ساتھ ساتھ اُگے ہوئے یہ درخت بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن اس کا ان کی طرف دھیان ہی نہیں تھا......

اس کے دوست نے یہ حرکت کیوں کی؟ بظاہر اس نے اسی کی بھلائی کے لیے یہ راز کھول دیا۔ حالانکہ اگر اس نے اس سے دریافت کیا ہوتا تو وہ کسی بڑی سے بڑی نوکری کے لیے اس راز کا کھلنا پسند نہ کرتا۔ اس مسئلہ کو فلسفیانہ نقطۂ نظر سے سوچنے کا نہ

کوئی محل نہ تھا۔ اُسے تو دنیاوی نقطۂ نگاہ ہی سے سوچا جاسکتا تھا۔ دنیاوی لحاظ سے کسی کی بہن کا اس طرح گھر کی صفائی کر کے کسی غیر مرد کے ساتھ بھاگ جانا یقیناً ایک بھائی کے لیے بڑی بے غیرتی کی بات تھی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کی یہ حماقت ضرور تھی کہ اُسے اپنی بہن کے اس یارانے کا کچھ پتہ ہی نہ چلا— وہ اُسے ایک ذمہ دار لڑکی سمجھتا تھا۔ وہ کب جانتا تھا کہ وہ اس قسم کے لچر خیالات میں کھوئی رہتی تھی۔ خیر وہ تو سب کچھ ہوا۔ لیکن اس نے دوست کو راز داں اس غرض سے بنایا تھا کہ جب وہ ایک مرتبہ ان کے گھر کے حالات سے واقف ہوجائے گا تو پھر آیندہ گفتگو کرنے میں کوئی جھجک نہ رہے گی۔ اس دنیا میں انسان کو ہمیشہ ایک نہ ایک رازداں اور ہمدرد کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر اس نے اس بات کے لیے اپنے دوست کو چن لیا تو کیا برا کیا۔ اس میں تو اس کی کوئی غلطی نہ تھی......

...... اور وہ اس کا دوست کس قدر سنجیدہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ دنیا کے نشیب و فراز سے آگاہ، انسان کی بے بضاعتی اور اس کی کمزوریوں سے واقف اس کے خیالات کس قدر بلند تھے۔ وہ بولتا تھا تو اس کے الفاظ سے خلوص کی بو آتی تھی۔ وہ وجدانی طور پر محسوس کرتا تھا کہ اس کا دوست ایک قابلِ اعتماد شخص تھا۔ لیکن باوجود اتنی تاکید کے وہ اس قدر غیر ذمہ دار اور احمق کیوں ثابت ہوا...... محض اسے ملازمت دلانے کے لیے اس نے اس کی بنی بنائی عزت پر بٹہ لگا دیا۔ اب منیجر کے منہ میں لگام کون دے سکتا تھا؟ کیا وہ کسی اور کو اس بات سے آگاہ کرنے سے پرہیز کرے گا۔ ناممکن اور پھر کیا ایسے دفتر میں کام کیا جاسکتا تھا جہاں سب جانتے ہوں کہ فلاں شخص کی بہن...... اگر اس کے دوست کا منیجر کو واقعی کچھ لحاظ تھا اور وہ اپنا کچھ رسوخ استعمال کرسکتا تھا تو پھر اس بات کا ذکر چھیڑنے ہی کی کیا ضرورت تھی...... لیکن یہ سب کچھ غلط تھا۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ در اصل یہاں انسان کا فطری کمینہ پن کام کر رہا تھا۔ دنیا میں ہر شخص بیمار تھا۔ ہر شخص میں عیب تھے۔ کمزوریاں تھیں۔ اسے ان باتوں کا شدید احساس تھا۔ اس لیے جب اُسے

اپنے کسی ہم جنس کی کسی مصیبت کا پتہ چل جائے تو پھر آپس میں کانا پھوسی کر کے اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے کہ اس دنیا میں اسی میں برائیاں نہیں دوسروں میں بھی ہیں۔ انسان اپنی کمزوریوں کو دور کرنے سے ہمیشہ قاصر رہتا ہے۔ لیکن وہ اپنی تسکین کا پہلو اسی قسم کی عیب جوئی اور غیر کے معائب کا ذکر کر کے ہی پیدا کر لیتا ہے...... وہ ازل ہی سے کمینہ ہے۔ اس کی انسانیت کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی درندگی بھی لپٹی ہوئی ہے۔ جب کبھی یہ درندگی ابھر آتی ہے تو پھر انسان سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہے۔ ہر انسان بہت ہی احمقانہ طور پر یا احمقانہ حد تک عقل مند ہے۔ اس کی یہ گراوٹ شاید ابد تک دور نہ ہو۔ اگر یہ ابد تک دور نہ ہوسکی تو دنیا میں دکھوں کا خاتمہ ہونا معلوم...... بدی انسان کی ہڈیوں میں کچھ اس طرح رچ گئی ہے کہ اس کے جسم سے اسے دور کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ یہاں تک کہ کسی عزیز سے عزیز دوست پر بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ جب بھروسہ نہ ہو تو کوئی انسان کسی کو اپنا ہمراز نہیں بنا سکتا۔ کسی کو بھی اپنا ہمراز نہ بنا سکنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان دنیا میں اکیلا رہا کرے...... تنہا...... تنہا...... ازل سے ابد تک تنہا...... اس قدر وسیع دنیا میں، ان بے شمار دکھوں کا مارا ہوا انسان اور پھر تنہائی کی شدت کا احساس ...... یہ اذیت تو کسی دوزخ کی بڑی سے بڑی سزا سے بھی بڑھ کر ہے۔ کیا دنیا میں انسان کو کبھی کوئی ساتھی نہ مل سکے گا۔ کیا وہ کبھی کسی راز داں کو نہ پا سکے گا۔ کیا کبھی کوئی ایسی ہستی وجود میں نہ آئے گی جس کے کان میں وہ دل کی بات اس یقین پر کہہ سکے کہ وہ یہ بات اور کسی سے نہ کہے گا۔ وہ اسے دل ہی میں رکھے گا......

چلتے چلتے وہ بے خبری کے عالم میں شہر سے بہت دور نکل آیا۔ وہ اس قدر کھویا کھویا سا تھا کہ اُسے اپنے قریب سے گزر جانے والے لوگوں کا بھی کچھ احساس نہ تھا۔ اُسے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ معمولی چڑھائی کی سڑک طے کرتا ہوا اب کافی بلندی پر آ پہنچا ہے۔ اُس نے پیچھے گھوم کر دیکھا۔ شہر کی رنگ برنگی عمارتیں سرمئی رنگ کے غبار میں دھندلی سی نظر آ رہی تھیں۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ خم کھاتی ہوئی

سڑکوں پر قطار در قطار کھڑے ہوئے درخت بہت بھلے دکھائی دے رہے تھے۔ سڑک کے ارد گرد کھیتوں میں پانی بھرا تھا اور بڑھتی ہوئی تاریکی میں وہ پانی ایک بہت بڑی جھیل کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اس میں بجلی کے قمقموں کی روشنی متحرک تھی۔

اس کے آگے ایک خاصی بلند سرسبز پہاڑی تھی۔ دور پہاڑی کے اندر کھدے ہوئے بہت بڑے مندر کے آگے وسیع سیڑھیوں سے عورتیں اور مرد چڑھ اُتر رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ مندر کی طرف بڑھا۔ قریب پہنچ کر وہ سیڑھیوں کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ اس نے جوتوں کے تسمے کھولے۔ چند کنکر جوتوں کے اندر کے اندر چلے گئے تھے اُس نے انہیں جھاڑ کر باہر نکالا اور پھر وہ وہیں لیٹ گیا۔ سیڑھیوں کے پتھر بہت سرد تھے۔ اس کے تکان زدہ جسم کو ان کی ٹھنڈک سے راحت کا احساس ہوا۔

سامنے کچھ فاصلہ پر مندر کا دروازہ نظر آرہا تھا۔ یہ بہت ہی بڑا دروازہ یوں ہی پہاڑ کو کھود کر بنا دیا گیا تھا۔ اس میں تختے نہیں لگے ہوئے تھے۔ اس لیے چوبیس گھنٹوں میں جب کسی کا جی چاہے وہ اس کے اندر جاسکتا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ آنے جانے والی عورتوں اور مردوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اٹھا اور آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھا۔ اُس نے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا تو سامنے پہاڑ کو اندر سے کھود کر بہت وسیع ہال بنایا گیا تھا۔ پرلے سرے پر پتھر کے تین بڑے بڑے دیوتا آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان میں سے درمیان والا بت سب سے اونچا تھا۔ وہ تقریباً ساٹھ فٹ بلند ہوگا۔ اس کے دائیں بائیں دوسرے دیوتا جو جسامت میں اس سے کم تھے اسی کی طرح آلتی پالتی مارے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے سیدھے بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ فن سنگ تراشی کے اعلا نمونے تھے۔ ان کے چہروں کے خد و خال صاف طور پر عیاں تھے۔ ان کے لبوں پر ایک دائمی مسکراہٹ ثبت ہوچکی تھی۔ وہ ابد تک اسی طرح چپ چاپ مسکرائے جائیں گے۔ بہت دور دور سے لوگ وہاں جمع ہوتے تھے۔ ہر انسان کے دل میں کوئی نہ کوئی تمنا اور کوئی نہ کوئی بھید ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ باندھے ننگے

پاؤں ان دیوتاؤں کی خدمت میں آتے ہیں۔ دل ہی دل میں اپنی بات دہرا دیتے ہیں۔ دیوتا اپنے پرستاروں کے دلوں کا حال پا لیتے ہیں۔ وہ مسکراتے ہیں منہ سے کچھ نہیں کہتے۔ یہاں تک کہ دن رات اُن کی خدمت میں رہنے والے پجاری بھی نہیں جانتے کہ دیوتا سے کون شخص کیا بات کہہ گیا......

رفتہ رفتہ بھیڑ کم ہو رہی تھی۔ ہال کے اندر شمعیں روشن تھیں۔ کسی تیز خوشبو سے سارا مندر مہکا ہوا تھا۔ پتھریلے فرش پر پانی پھیلا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر گیلے فرش پر سرخ نیلے اور سپید پھول بکھرے ہوئے تھے......

کوئی نہ کوئی شخص مندر کے بیچوں بیچ لٹکا ہوا کانسے کا گھڑیال بجا دیتا تھا۔ اور اس پر اسرار خاموشی میں کتنی ہی دیر تک گھڑیال کی سمجھ میں نہ آنے والی آواز پر معنی انداز میں لرزتی رہتی تھی......

وہ ان بے جان پتھر کے مسکراتے ہوئے دیوتاؤں کو قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے جوتے اُتار دیئے اور قدم بڑھا کر پاؤں نم دار فرش پر رکھ دیا۔ وہ ایک مسرور کر دینے والی خوش بو میں لپٹ گیا۔ مدھم روشنی میں دیوتا بدستور مسکرائے جا رہے تھے اور وہ لحظہ بہ لحظہ...... قدم بہ قدم...... آگے بڑھتا جارہا تھا............

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'ہندوستان ہمارا' میں شامل ہے۔ یہ افسانوی مجموعہ پہلی بار سنگم پبلی کیشنگ ہاؤس' الٰہ آباد سے جون 1947 میں شائع ہوا۔ اس میں کل بارہ افسانے شامل ہیں۔ جو یقیناً جون 1947 سے قبل لکھے گئے۔

بھک منگے

اگرچہ سورج طلوع ہو چکا تھا لیکن ابھی سڑکوں، بازاروں اور گلیوں میں وہ چہل پہل شروع نہ ہوئی تھی۔

اس بھک منگے کا کوئی گھر گھاٹ نہ تھا۔ محلے میں کسی نے یوں ہی ٹوٹا پھوٹا چھکڑا ایک طرف پھینک دیا تھا۔ بھکاری نے اُس پر ٹاٹ وغیرہ ڈال کر ایک اوٹ سی بنالی تھی۔ وہ اسی کے اندر زندگی بسر کرتا تھا۔ اندر جگہ بہت تنگ تھی لیکن اُسے زیادہ جگہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیوں کہ اس کی ٹانگیں گھٹنوں کے اوپر سے کٹی ہوئی تھیں۔ بچپن ہی سے اس کی ٹانگیں ایسی تھیں۔ اُسے کچھ یاد نہیں کہ اُس کی ٹانگیں کسی حادثے میں کٹ گئی تھیں یا وہ اسی طرح پیدا ہی ہوا تھا۔ اب وہ پاؤں کے بل پر آگے گھسٹ گھسٹ کر بڑھتا تھا۔ بانہوں کے بل پر وہ زمین سے زیادہ اونچا نہ اٹھ سکتا تھا۔ اس لیے جب وہ گھسٹتا ہوا چلتا تھا تو اس کی کمر سے بندھا ہوا کپڑا سڑک کی ساری غلاظت سمیٹتا جاتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر لوگوں کے دلوں میں سخت گھن پیدا ہوئی تھی۔

بظاہر اس کی صورت میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اس کی شکل ایسی ہی تھی جیسی عام ہندوستانیوں کی ہوتی ہے۔ ناک، آنکھ، ہونٹ، دانت ہر چیز صحیح وسالم تھی۔ اس کے بازو مضبوط، ہاتھ چوڑے چکلے، اور جسم کا باقی ڈھانچہ بھی درست تھا لیکن ٹانگوں کی وجہ سے وہ بے چارا بے کار تھا۔

اس کی صورت سے متانت اور غربت اسی طرح ہویدا تھی جیسی کہ بھکاریوں کے چہرے سے ہونی چاہئے۔ ہر وقت ہاتھ پھیلائے رہنے کے سبب اس کے چہرے کے مردانہ تیور غائب ہو چکے تھے۔ ہر آنے جانے والے کی طرف اس کی بھو کی آنکھیں گھور گھور کر دیکھا کرتی تھیں۔ اِدھر کسی بابو کی صورت نظر آئی اُدھر اُس نے گھگھیا کر دانت نکال دیئے۔ بڑے لجاجت آمیز لہجے اور مسکین آواز میں وہ دعاؤں کا تانتا باندھ دیتا۔ بھوک ، بے آرامی اور تفکرات کی وجہ سے اُس کے جسم کے ڈھانچے پر گوشت بس برائے نام ہی تھا۔

اِدھر صبح ہوئی۔ غلاظت کی گاڑی کے آگے بیٹھے ہوئے بھنگی نے تان اڑائی اُدھر بھکاری کی آنکھ کھلی۔ لوگ اپنے اپنے کاموں پر جانے کی تیاریاں کرنے لگے تو اس نے بھی باہر جانے کی ٹھانی۔ اُسے تیاری تو کچھ کرنی نہیں تھی۔ البتہ وہ ناریل پی لیا کرتا تھا۔ اُس اُپلے کا ایک ٹکڑا چلم پر رکھا اور اس میں ایک چیتھڑا اٹھونس کر آگ لگا دی...... پھر وہ اطمینان سے بیٹھا دم لگاتا رہا۔ وہ کنکھیوں سے سڑک کی طرف بھی دیکھ رہا تھا کہ ذرا لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو تو وہ بھی اپنے اڈے پر جا پہنچے۔

رفتہ رفتہ لوگ اپنے اپنے گھروں سے نکلنے لگے۔ سڑک پر سائیکلیں اور تانگے بھی چلنے لگے۔ بھکاری نے بھی اپنا کٹورا جھولی میں ڈالا اور گھسٹتا ہوا سڑک کی طرف بڑھا۔ وہ اس جگہ بیٹھا کرتا تھا جہاں میونسپلٹی کا گندگی کا بہت بڑا ڈھول پڑا تھا۔ وہاں بیٹھنے میں بھی ایک مصلحت تھی۔ وہ یہ کہ ڈھول کے سائے میں وہ دھوپ کی گرمی سے بچا رہتا تھا۔ غلاظت سے لبریز ڈھول کے قریب بیٹھا ہوا وہ خود بھی ایک چھوٹا سا گندگی کا ڈھول دکھائی دیتا تھا۔ کچھ مکھیاں تو یوں ہی اُس پر منڈلاتی رہتی تھیں اور کچھ اس ڈھول کی صحبت کی وجہ سے اُس کے حصے میں آتی تھیں۔

جھولی سے کٹورا نکال کر اُس نے آگے بڑھا دیا۔ اس نے کٹورے میں چند پیسے بھی ڈال دیئے۔ پیسے کو پیسہ کماتا ہے۔ اس کے کٹورے میں دو تین پیسے دیکھ کر کوئی راہ گیر اپنا پیسہ بھی اُس میں پھینک دیتا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے دھوپ کی تمازت بڑھتی جارہی تھی۔ لوگ جلد سے جلد اپنے اپنے دفتروں، مکانوں، اسکولوں یا دکانوں میں پہنچ جانا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے لیے جلدی کی کوئی بات نہ تھی۔ ابھی اسے ڈیڑھ دو بجے تک اسی جگہ بیٹھنا تھا۔ پھر وہاں سے دو گھنٹے کے لیے چلے جانے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے گرمی محسوس ہوتی تھی۔ بلکہ یہ کہ اُس وقت گلی کا ایک کتا تک سڑک پر گھومتا نظر نہ آتا اور آدم زاد کا خیر ذکر ہی کیا۔

ہر آنے والا دور سے بڑا سخی دکھائی دیتا تھا۔ لیکن قریب پہنچ کر اُس کی صورت ایسی دکھائی دینے لگتی تھی جیسے وہ خود اس کے جسم کے چیتھڑے تک اتار لینے سے دریغ نہ کرے گا۔ انسانوں کے اس ہجوم میں اگر کسی شخص پر کسی دعا کا نشانہ ٹھیک جگہ جا لگا تو پھر اس کی جیب میں سے ایک پیسے کا نکل آنا کچھ ایسا مشکل بھی نہ تھا۔

وہ اپنے کٹورے میں دو چار پیسوں سے زیادہ نہ رہنے دیتا تھا۔ جہاں کچھ پیسے جمع ہوئے اس نے اُنہیں اٹھا کر اپنی پھٹی قمیص کے اندر پہنی ہوئی بنڈی کی اندر کی چھوٹی سی چور جیب میں ٹھونس لیا۔

جب اِدھر سے گزرنے والوں کا پہلا ریلا ختم ہوگیا تو پھر آمد و رفت کم ہوگئی۔

نو بجے سے دس بجے تک آمد و رفت بہت بڑھ جاتی تھی۔ کیوں کہ اس وقت دفتر اور اسکول کھلتے تھے۔ بابوؤں، لڑکوں اور لڑکیوں کی ٹولیاں شور مچاتی خاک اڑاتی اس کے پاس سے گزر جاتی تھیں۔ سائیکلوں اور تانگوں کی بھی بھرمار ہوتی تھی۔ لیکن دس بجے کے بعد سڑک پر وہ چہل پہل نہ رہی تھی۔ اب کاروباری، بے کار یا آوارہ گرد لوگ رہ جاتے تھے۔ جو محلے کے کتوں پر ڈھیلے پھینکتے یا اُن کو دھتکارتے ہوئے اِدھر اُدھر مٹر گشت کرتے تھے۔

چہل پہل ختم ہوجانے کے بعد بھکاری بھی ذرا آرام سے بیٹھ جاتا تھا۔ پہلے تو پیسے چھنا چھن اُس کے کٹورے میں گرتے ہیں اور پھر کبھی کبھار کوئی شخص اُدھر سے گزرا، سخاوت کے جذبہ نے زور مارا تو اس کے کٹورے میں بھی ایک آدھ پیسہ آن گرا۔ لیکن

جس کسی سے اُسے ذرہ برابر بھی یہ امید ہوتی اس کے آگے ہاتھ پھیلانے سے ہرگز نہ چوکتا تھا۔

سر پر کپڑا ڈالے وہ چلچلاتی دھوپ میں اڑتے ہوئے ذروں کو دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں اُسے دور سے ایک اچھے خاصے لالہ آتے دکھائی دیئے۔ اس نے فوراً کٹورے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ جب وہ کچھ نزدیک آئے تو معلوم ہوا کہ وہ اپنے محلے ہی کے لالہ ہیں۔ ہاں آج ذرا معمول کے خلاف چکنے چپڑے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ اپنے لالہ پیسہ کہاں دینے والے تھے۔ لیکن اب ایک مرتبہ کٹورا اٹھا ہی لیا تھا اُسے بڑھا دینے میں ہرج ہی کیا تھا۔ بھگوان تمہارے دل کی منشا پوری کریں گے۔

پہلے تو لالہ ایک زناٹے کے ساتھ اس کے قریب سے گزرنے لگے تھے پھر نہ معلوم کیا خیال آیا۔ وہیں رُک گئے۔ ان کی جھاگ سی پھولی ہوئی دھوتی ہوا میں لہرانے لگی۔ اُنہوں نے اپنے گول مٹول ہاتھوں سے اپنی اُجلی قمیص کی جیبوں کو ٹٹولا لیکن ادھنی سے کم کا کوئی سکہ ہی نہ تھا۔ پُن کرنے کا خیال ترک کرنے ہی لگے تھے کہ یکا یک کچھ خیال آیا۔ فوراً اپنے سر سے گاندھی ٹوپی اُتاری اور اس کے ایک سرے کو ہٹا کر اندر سے دو پیسے اور ایک دھیلا نکالا۔ پہلے تو دھیلے والا ہاتھ آگے کو بڑھایا پھر نہ معلوم کیا سوچ کر ٹن سے ایک عدد نقد پیسہ اس کے کٹورے میں پھینک کر سینہ تانے آگے بڑھ گئے۔

وہ لالہ لیکھ رام جی تھے۔ محلے کے بڑے پرانے دکاندار تھے۔ عمر گزری تھی اسی دشت کی سیاحی میں...... اُن کے باپ دادا بھی یہیں دکان کرتے آئے تھے۔ انہوں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو لوہے کی چھوٹی سی الماری کے قریب سانپ کی طرح بیٹھے پایا اور پھر اُنہوں نے گدی کو نہیں چھوڑا۔

یہ ایک تعجب انگیز بات تھی کہ آج انہوں نے بھکاری کو دھیلا نہ پائی اکٹھا۔ ایک پیسہ دے ڈالا تھا۔ جب سے جنگ چھڑی تھی اُن کا حال پتلا ہو رہا تھا۔ نہ دکان میں مال تھا نہ کہیں سے آنے کی امید تھی۔ جو مال تہ خانوں میں چھپا رکھا تھا وہ پولس والوں کے

ڈر سے باہر نہ نکالتے تھے۔ خصوصاً یہ دن اُن کے لیے بہت سخت آن پڑے تھے۔ اِدھر گورنمنٹ نے راشننگ کا طریقہ جاری کر دیا۔ لالہ پرانے گھاگ تھے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر انہیں ڈپو کھولنے کی اجازت مل جائے تو سمجھو پو بارہ ہیں۔ دکان میں گیہوں اور آٹے کا سرکاری اسٹاک تو رہے گا ہی، اس کے ساتھ اپنا مال بھی کھپا ڈالیں گے۔ راز دانوں نے لقمہ دیا اجی لالہ کون دیکھتا ہے۔ کسی کی مجال بھی ہے۔ آنکھوں میں ایسی صفائی سے دھول ڈالو کہ بس......

لالہ سچ مچ آنکھوں میں دھول ڈالنے پر آمادہ ہوگئے۔ اُنہوں نے اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ شروع کی۔ ایک لمبی چوڑی عرضی راشننگ کنٹرولر کے نام لکھوائی۔ ایک شخص سے لکھوائی تو دس اشخاص سے پڑھوائی۔ ہر نئے دیکھنے والے نے اس میں کچھ ترمیم کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرضی بہت شان دار اور پُراثر ہوگئی۔ گورنمنٹ کو اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے اُنہوں نے مختلف دلائل سے اپنے آپ کو اس خدمت کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مثلاً اُن کا یہ آبائی پیشہ تھا اور اس محلّہ میں وہ عرصۂ دراز سے دکان کر رہے تھے— یہ تو ان کے پھولے ہوئے پلپلے پیٹ ہی سے ظاہر تھا۔ یا وہ بڑے ایمان دار شخص تھے۔ واہ لالہ جی! بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی۔ ایمان داری اور حلال کی روٹی تو آپ کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں...... محلے کے سب باعزت لوگ اس بات کے خواہش مند تھے کہ ڈپو کی ذمہ داری اُنہیں کو سونپ دی جائے اور اپنی اس دلیل کے ثبوت میں وہ اس عرضی کو ٹائپ کروا کر خود بہ نفسِ نفیس لوگوں کے گھروں میں پہنچے۔ خوب گھگھیا کر دانت نکال نکال کر اپنا مدعا بیان کیا۔ اس طرح سارا دن مارے مارے پھرنے کے بعد شام تک اُن کا حلیہ بگڑ گیا۔ چہرہ گرد میں اٹ گیا۔ بالآخر عرضی روانہ کردی گئی۔

اب لالہ جی عرضی کے جواب کے منتظر تھے۔ اسی لیے جب بھکاری نے کہا کہ بھگوان تمہارے دل کی منشا پوری کریں گے۔ تو انہوں نے اُسے ایک پیسہ دے دینے

میں کوئی ہرج نہیں سمجھا۔ لالہ بھی جانتے تھے جنت کی حقیقت لیکن...... ہرج ہی کیا تھا اگر کوئی ایک پیسہ لے کر نیک خواہشات کا اظہار ہی کر دے...... چلو یوں ہی سہی۔

بھگوان اور محلے کے لوگوں کی پوری قوت اپنی پشت پر ہونے کے باوجود لالہ سمجھتے تھے کہ ابھی راہ میں اور رکاوٹیں بھی ہیں۔ ان میں سے ایک خاص رکاوٹ تو راشننگ کے انسپکٹر تھے۔ جنہیں خوش رکھنا نہ صرف اب ضروری تھا بلکہ عرضی منظور ہوجانے کے بعد بھی ان کی نظر عنایت کی ضرورت تھی۔ اگر ان سے بگڑ گئی تو سمجھو دنیا میں ہر شخص سے بگڑ گئی۔ اور پھر تو ایسی حالت پیدا ہوسکتی تھی کہ اگر خود بھگوان دھرتی پر اُتر آئیں تو بگڑے کام کو سنوار نہ سکیں۔ یہ انسپکٹر صاحب بھی بڑے ظالم تھے اس لیے لالہ ان کی بڑی خوشامد کرتے تھے۔ اگر انسپکٹر کی صورت دور ہی سے دکھائی دیتی تو آپ فوراً دکان سے اُتر کر سڑک پر ننگے سر ننگے پاؤں جا کھڑے ہوتے۔ دور ہی سے دانت نکال نکال کر اظہار مسرت کرنے لگتے۔ انسپکٹر کے قدموں میں نگاہیں بچھا دیتے۔ ان کا ہر قدم اپنی پلکوں کے زور سے اٹھاتے۔ اپنے ہاتھوں کو آپس میں ملے جاتے۔ جب دکان کے قریب آ پہنچتا تو بڑے خوشامدانہ لہجہ میں کہتے '' آیئے آیئے انسپکٹر صاحب! اجی میں تو آپ کو دور ہی سے دیکھ لیتا ہوں۔ ان کم بختوں کو میں ہی تو بتاتا ہوں کہ ہمارے انسپکٹر صاحب چلے آرہے ہیں...... آیئے تشریف لایئے...... اِدھر ہوبے۔ انسپکٹر صاحب کو...... کرسی لابے جلدی۔ کہاں مرگیا؟......'

انسپکٹر صاحب رومال سے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے بیٹھ جاتے لالہ پوچھتے ہیں'' کہیۓ کیسے آنا ہوا حضور کا۔''

انسپکٹر صاحب بے پروائی سے کہتے ہیں'' ارے بھئی یوں ہی اِدھر چلا آیا...... کوئی کام دام ہوتا نہیں......'' انسپکٹر صاحب یہ بات ضرور کہتے تھے کہ اُنہیں کوئی کام نہیں کرنا پڑتا۔ سرکار اُنہیں بس مفت ہی کی تنخواہ دیتی ہے— لالہ بے چارے کو کیا پتہ کہ انسپکٹر صاحب کو باولے کتے کی طرح صبح سے شام تک گلی کوچوں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔

تب کہیں ان کا پنڈ چھوٹتا ہے۔

لالہ زمین پر بچھے جاتے ہیں۔" ہی ہی..... ٹھیک ہے صاحب!" پھر وہ ارد گرد کھڑے ہوئے چار پانچ آوارہ مزاج نوجوانوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے" ارے کہیں افسروں سے بھی کام لیتی ہے سرکار..... افسر کا کام ہے 'بس' دس خط' کرنا۔ دو لکیریں ادھر دو لکیریں اُدھر۔ کیوں بھئی بولو نا کہیں سرکار افسروں......

انسپکٹر صاحب ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہیں۔ لالہ جھک کر کہتے ہیں" جی پانی وانی پئیں گے کیا؟"

لالہ تو پانی وانی کہتے ہیں۔ انسپکٹر صاحب کو ذرا دور کی سوجھتی ہے۔ منہ بگاڑ کر کہتے ہیں" اجی جانے دو لالہ تمہارے محلے میں یہ سوڈے وڈے کی بوتلیں بہت ہی رذی ہوتی ہیں۔ میں ان کی رپورٹ بھی کرنے والا ہی ہوں ......" جیسے سچ مچ رپورٹ کر ہی تو دیں گے۔

" ارے صاحب" لالہ جی منہ پھیلا کر کہتے ہیں۔" بڑا شان دار سوڈا ہوتا ہے چندن والوں...... ابے لائیو...... پکڑیو ایک بوتل 'لیم لسٹ' کی...... انسپکٹر صاحب بھی کیا یاد کریں گے......"

انسپکٹر صاحب بوتل تو مزے کے ساتھ حلق میں اُتار لیتے ہیں۔ لیکن لالہ کو یاد نہیں کرتے کبھی......

لالہ جی بھکاری کو ایک پیسہ دے کر اپنی دوکان میں داخل ہوئے۔ ایک روز پہلے انسپکٹر نے کہا تھا کہ وہ اس کی دکان پر آئیں گے۔

لالہ جی نے گدی پر بیٹھتے ہی ہر چیز کو جھاڑ پونچھ کر صفائی کروا دی۔ آج وہ خود بھی ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ در اصل انسپکٹر صاحب نے اُنہیں بتا دیا تھا کہ ان کے ساتھ وارڈ افسر بھی ہوگا۔ لالہ جی نے دوچار اچھی اچھی کرسیوں کا انتظام بھی کر لیا۔ پنواڑی کو اچھے اچھے پان چاندی کے ورق میں لپیٹ کر پیش کرنے کے لیے کہہ دیا۔

چندن والوں کی آٹھ تیار کردہ بوتلوں اور برف کا انتظام بھی کر دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد شور اٹھا کہ آ گئے انسپکٹر صاحب اور ان کے ساتھ وارڈ افسر بھی تھا۔

بس پھر کیا تھا لالہ کو پسینہ چھوٹنے لگا۔ پنکھیا جھلتے ہوئے دکان سے باہر نکل آئے اور حسب معمول لگے مسکرانے اور پیٹ مٹکانے...... جب وہ دونوں آ کر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ لیم لیسٹ'' کی بوتلیں پلائی گئیں۔ وارڈ افسر نے اُچک اُچک کر دکان کا جائزہ لیا۔ لالہ جی ہاتھ باندھے اُن کی نظروں کے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ بات بات میں جھک جھک کر آداب بجا لاتے تھے ان کی ناک زمین کو چھو چھو جاتی تھی۔ آخر کار دوکان کا معائنہ ختم ہوا۔ اتنی خاطر تواضع کرنے کے بعد وارڈ افسر نے اظہار پسندیدگی کرنے میں چنداں ہرج نہ سمجھا۔

وارڈ افسر صاحب ذرا ٹہلتے ہوئے پرے ہٹے تو انسپکٹر صاحب نے چپکے سے فرمایا ''میں نے آپ کی بڑے زور کی سفارش کردی ہے کل تک آپ کو اجازت مل جائے گی۔

''وہ مارا'' لالہ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا۔ اُن کا چہرہ سرخ ٹماٹر ہوگیا۔ فوراً انسپکٹر صاحب کی ٹانگیں دبانے لگے۔

انسپکٹر صاحب اس طرح رعب جما کر وارڈ افسر کے پیچھے پالتو کتے کی طرح بھاگ نکلے۔ اُنہیں ڈر تھا کہ کہیں وارڈ افسر ناخوش نہ ہوجائے۔ وارڈ افسر بہت سخت قسم کا انسان تھا۔ بات بات پر بگڑ جاتا تھا۔ انسپکٹر صاحب کا نام تھا رام جی داس...... جنگ چھڑنے سے پہلے وہ ایک آوارہ گرد شخص تھا۔ دسویں پاس کو لڑائی سے پہلے پوچھتا ہی کون تھا۔ بے چارے ایم۔ اے پاس مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ بی۔اے۔ پاس بوٹ پالش کرتے اور چارپائیاں بنا کرتے تھے۔ اور دسویں پاس بے چاروں کے لیے اس سے ذلیل تر کوئی کام باقی نہ بچا تھا۔ لیکن جنگ چھڑی اور یاروں کی بھی سنی گئی۔ اب رام جی داس انسپکٹر کہلانے لگے۔ انہوں نے بڑی خوشامد اور چاپلوسی کے بعد کہیں جا کر یہ ملازمت

حاصل کی تھی، اکیلی جان، چند بندھے ٹکے ہر مہینے ہاتھ لگنے لگے تو انسپکٹر رام جی داس بھی خوب بن ٹھن کر رہنے لگے۔ تنخواہ بھتہ وغیرہ ملا کر سو سے اوپر جا پہنچتی تھی۔ ان کے لیے یہی کیا کم تھی۔ اور پھر اس کے علاوہ بالائی آمدنی بھی تھی۔ یہ بالائی آمدنی تو بس دودھ کے کڑاہ پر جمی ہوئی موٹی ملائی کی تہ تھی ان کے لیے۔ بس یوں ہی پکڑ کر گانٹھ دیا کسی کو۔ ڈرا دیا کہ بس اب ڈیفنس آف انڈیا میں دھروا دوں گا وہ بے چارا ڈرا اور اُنہوں نے اس کے پلّے سے کچھ جھاڑ لیا۔ ابھی چند ہی روز پہلے کی بات تھی کہ اسی محلے کے ایک ناریل سے سر والے احمق سکھ کو انہوں نے دھر لیا۔ وہ بے چارا کہیں غلطی سے زائد راشن لے بیٹھا۔ یہ اُس کے سر پر سوار ہوگئے۔ اس سکھ نے اپنے پلپلے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گڑگڑا کر معافی مانگی۔ لیکن یہاں ان کی لغت میں معافی کا لفظ ایک سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ ''یہ چاہتے تھے کہ کچھ نہ کچھ جھاڑ لیا جائے۔ لیکن پہلے وہ حضرت بھی شہر بھر کے کنگالوں کے'' سچے بادشاہ'' تھے۔ بھلا چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں۔ انسپکٹر صاحب نے پھر جرح کی اُلٹ پلٹ اور ہیر پھیر کے سوالات کیے۔ آخر معلوم ہوا کہ حضرت آرٹسٹ ہیں۔ چناں چہ رام جی داس نے کہا لاؤ بھائی ہمارا ایک پورٹریٹ ہی بنا ڈالو۔ وہ جھٹ اس پر آمادہ ہوگئے۔ چناں چہ جناب انسپکٹر صاحب چند روز آرٹسٹ کے یہاں جاکر کرسی پر بیٹھے رہے۔ تصویر تیار ہوگئی اور اُنہوں نے بلا دستخط کے اُسے لے کر چوکھٹے میں جڑا کر اپنے کمرے میں لٹکا دیا۔ کوئی پوچھتا تو کہتے ''بھائی! یہ میرے ایک دوست کی بنائی ہوئی تصویر ہے۔'' ورلڈ فیم'' World Fame کے آرٹسٹ ہیں...... ان کا نام سنا نہیں تم نے؟...... ارے واہ بھئی واہ......

رام جی داس کو اس بات کا خیال نہ تھا کہ یہ جنگ عارضی ہے۔ اور راشننگ محکمے جنگ سے بھی عارضی محکمے ہیں۔ اس لیے یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کر مفت میں بدنامی مول لے۔

ابھی اُس کے خیالات بہت بلند تھے۔ اس کی دلی خواہش یہ تھی کہ وہ کسی نہ کسی

طرح کپڑوں کے انسپکٹر کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ لیکن رستے میں بہت سی دقتیں حائل تھیں۔ وہ ان کو رفتہ رفتہ دور کر رہا تھا۔ آہا کاش وہ ایک مرتبہ کپڑے کا انسپکٹر بن جائے تو پھر چاندی ہی چاندی ہے۔ گیہوں وغیرہ لینے والی ''مرغیاں'' اول تو زیادہ انڈے ہی نہیں دیتی ہیں اور اگر کبھی ایک آدھ انڈا دے بھی دیا تو یوں ہی چھوٹا اور بے کار سا...... اور اُدھر کے کیا کہنے۔ ایک مرتبہ کوئی لکھ پتی مرغی پھنس جائے تو بس پھر جنم جنم کی کسریں پوری ہوجائیں۔ اسی لیے وہ اسسٹنٹ کنٹرولر سے تعلقات بنائے ہوئے تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کی کوٹھی پر جایا کرتا تھا۔ کبھی پھلوں کی ٹوکری لے جاتا، کبھی بچوں کے خوبانیاں، اخروٹ اور چلغوزے وغیرہ لے جاتا...... یہ درست ہے کہ اُسے وہاں جاکر آدھ یا پون گھنٹہ برآمدے میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ اسسٹنٹ کنٹرولر صاحب کو ان کے وہاں جانے کی کچھ ایسی پروا بھی نہیں تھی۔ بڑی دیر کے بعد کہیں نکلتے۔ یہ سلام کے وقت دہرے ہو ہوجاتے وہ یوں ذرا سر کو حرکت دے کر اظہار خوشنودی کرتے۔ یہ پھلوں کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے'' جی یہ الٰہ آباد کے امرود ہیں۔ ہمارے ایک عزیز وہاں رہتے ہیں۔ انہوں نے ایک بڑا سا ٹوکرا لیا تھا۔ چند اچھے اچھے دانے لے کر حاضر ہوا ہوں مجھے امید ہے کہ......

اسسٹنٹ کنٹرولر اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ امرود حضرت کو کسی نے نہیں بھیجے سیدھے بازار سے اٹھائے لیے آرہے ہیں...... وہ نوکر کو اشارہ کرتے اور وہ ٹوکری لے کر اندر چلا جاتا۔ اس کے بعد یہ سلام کر کے واپس لوٹ آتے۔

اسی طرح روز روز کی چاپلوسی سے خوش ہو کر ایک روز اسسٹنٹ کنٹرولر نے ان پر بہت عنایت کی۔ انسپکٹر رام جی داس ان سے ملنے گئے وہ برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ پی چکے تھے۔ یہ پہنچے تو انہوں نے انہیں بھی شامل کر لیا۔ یہ ان کی اس بندہ پروری پر بہت خوش ہوئے وہ تو دو منٹ بعد اندر چلے گئے۔ یہ اسسٹنٹ کنٹرولر کے خاص برآمدے میں بیٹھے خاص ان کے دعوت دینے پر چائے پیتے رہے اور بچے کھچے

نوٹ بھی اڑا گئے۔

اس طرح اسسٹنٹ کنٹرولر سے ان کے مراسم بڑھتے جا رہے تھے۔ ایک روز اسی محلے میں نئے راشن کارڈ بننے والے تھے۔ علاحدہ علاحدہ گلیوں میں ہر انسپکٹر کو ایک ایک بیٹھک بٹھا دیا گیا۔ ان کی مدد کے لیے تین تین چار چار کلرک بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انسپکٹر رام جی داس کو جو جگہ ملی وہ اسسٹنٹ کنٹرولر کی کوٹھی کے عین قریب تھی۔ یہ وہاں بڑے زور شور سے کارڈ بانٹتے رہے۔ چلاّتے چلاّتے گلا بیٹھ گیا۔ دم پھولنے لگا...... اتنے میں اسسٹنٹ کنٹرولر کا نوکر آیا اور کہا صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔

یہ سن کر انسپکٹر رام جی داس ہکا بکا رہ گئے۔ ''ارے مجھے ......؟ واقعی؟''

''ہاں جی انسپکٹر رام جی داس کو۔''

وہ فوراً بھاگا بھاگا وارڈ افسر کی اجازت لینے گیا۔ اور جب اُس نے بتایا کہ اسے اسسٹنٹ کنٹرولر نے بلایا ہے تو فخر سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

وارڈ افسر کو اجازت دیئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا...... یہ فوراً بھاگم بھاگ بڑے صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ بڑے صاحب اس وقت کار پر کہیں جا رہے تھے۔ رام جی داس نے قریب پہنچ کر بڑے سعادت مندانہ طریقہ سے خوب جھک کر سلام کیا۔ اسسٹنٹ کنٹرولر نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور فرمایا'' دیکھو رام جی داس! میں نے دلکشا سے مختلف قسم کے پھولوں کے چند گملے منگوائے ہیں' ذرا ٹھیلے والوں کے ساتھ جا کر اس پرچے کے مطابق سب گملے ٹھیلے پر لدوا کر احتیاط سے ہمارے ہاں پہنچا دینا۔ ہم ذرا باہر جا رہے ہیں......''

انسپکٹر رام جی داس نے خوب گھگھیا کر دانت دیئے اور ممیا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسسٹنٹ کنٹرولر کار میں بیٹھ کر چل دیئے۔

اسسٹنٹ کنٹرولر کی عمر اس وقت پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے سے خشونت اور لالچ کے آثار ہویدا تھے۔ اس وقت خوب اچھی طرح شیو کر چکے تھے۔ پوڈر ملا ہوا

تھا۔ ناک کے نیچے بزعمِ خود بڑ فلائی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ بے ڈھب مونچھیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے گندگی پر منڈلانے والی بڑی مکھی انہوں نے پائپ منہ میں دبا رکھا تھا۔

اس وقت وہ اسسٹنٹ کنٹرولر تھے۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ راشننگ کنٹرولر سمندر پار جارہا تھا۔ اور وہ اس بات کے لیے جان توڑ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی جگہ اُسے مل جائے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے چیدہ چیدہ ذمہ دار ہستیوں کو ایک پارٹی بھی دی تھی اور اسے امید تھی کہ اس کا کام بن جائے گا۔ وزیرِ مالیات سے اس کی معمولی علیک سلیک تھی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

کار اڑاتا ہوا وہ وزیر مالیات کی کوٹھی پر پہنچا۔ اپنے نام کا کارڈ اندر بھجوا کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پھر سے پائپ سلگایا اور دھواں اڑانے لگا۔ معاً اس نے دیکھا کہ سامنے ایک بڑی سی کار میں سامان لد رہا ہے۔ اس نے ایک نوکر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وزیر صاحب شملہ کوتشریف لے جارہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اب ملاقات نہ ہوسکے گی۔ لیکن کارڈ بھجوا چکا تھا انتظار لازمی تھا۔ وہ برآمدے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

دس پندرہ منٹ بعد وزیر باہر نکلا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے مسکرا کر جلدی سے مصافحہ کیا۔ اسسٹنٹ کنٹرولر نے لپک کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ جیسے یہ نادر موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ ''آیم ویری سوری...... ویری سوری...... آئی ایم آل ریڈی لیٹ......''

یہ کہتے ہوئے وزیر مالیات کار کی طرف بڑھے۔ اسسٹنٹ کنٹرولر نے گھگیا کر دانت نکال دیئے اور ممیا کر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ کار یہ جا وہ جا......

وزیر مالیات نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گاڑی چھوٹنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ وہ سیٹیں پہلے ہی سے ریزرو کرا چکا تھا۔

جب سے اس نے دیول پلین کی بابت اخبارات میں پڑھا تھا۔ اس کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند غائب ہوچکی تھی۔ وہ ایک چلتا پرزہ شخص تھا۔ اب تک وہ ترقی کی منزلوں پر منزلیں صرف اپنی چرب زبانی اور چال بازی کی بدولت طے کیے جارہا تھا۔ دیول اسکیم کی بابت اس نے غور کیا تو خیال آیا کہ وہ کیوں نہ کوئی داؤ پیچ لڑائے۔ شاید وہ بھی کسی پارٹی کی طرف ایکزیکیوٹیو کونسل میں آجائے۔ آہا کیسا لطف ہو۔

خدا خدا کر کے وہ اسٹیشن پر پہنچا۔ اِدھر اُس نے ڈبے میں قدم رکھا اُدھر گاڑی چل دی۔

وہ راستے میں نئی سے نئی ترکیبیں سوچتا چلا گیا۔ کن کن اشخاص سے ملنا چاہیے۔ اس کا کون سا دوست یا واقف کار اس کی کیا مدد کرسکتا تھا۔ کن کن لوگوں پر ڈورے ڈالنے ہوں گے۔ کیا کیا ہتھکنڈے کھیلنے ہوں گے؟

وہ وہاں وائسرائے کی دعوت پر تو گیا ہی نہیں تھا۔ نہ اس کا کسی خاص پارٹی سے کچھ تعلق ہی تھا۔ اور نہ کسی سے ہمدردی۔ اُسے اپنا الو سیدھا کرنا تھا۔ وہ ہر شخص سے ملنے پر آمادہ تھا کسی بھی سیاسی نظریئے کی حمایت کرنے کے لیے تیار تھا۔

پہلے اس نے اس بات کی کوشش کی کہ وائسرائے سے ملاقات ہوسکے۔ اُس نے ادھر اُدھر کافی دوڑ دھوپ کی۔ لیکن دال نہ گلی۔

اس کے بعد اُس نے ہر قسم کے لیڈروں سے مراسم پیدا کرنے کی کوشش کی اُس نے چند اہم ہستیوں کو چائے پر بھی مدعو کیا۔ چائے پارٹی کے موقع پر وہ بڑی چرب زبانی سے باتیں کرتا رہا۔ حاضرین کے مزاج اور ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے ہنسی مذاق کر کے مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ باتوں باتوں میں ان کے خیالات کی حمایت بھی کرتا رہا۔

کانفرنس ہوتی رہی۔ وزیر صاحب بھی تھالی کے بیگن کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتے رہے۔ کبھی خوش ہوجاتے اور کبھی مایوس۔

طرح کپڑوں کے انسپکٹر کی حیثیت سے لے لیا جائے۔ لیکن رستے میں بہت سی دقتیں حائل تھیں۔ وہ ان کو رفتہ رفتہ دور کر رہا تھا۔ آہا کاش وہ ایک مرتبہ کپڑے کا انسپکٹر بن جائے تو پھر چاندی ہی چاندی ہے۔ گیہوں وغیرہ لینے والی ''مرغیاں'' اول تو زیادہ انڈے ہی نہیں دیتی ہیں اور اگر کبھی ایک آدھ انڈا دے بھی دیا تو یوں ہی چھوٹا اور بے کار سا...... اور اُدھر کے کیا کہنے۔ ایک مرتبہ کوئی لکھ پتی مرغی پھنس جائے تو بس پھر جنم جنم کی کسریں پوری ہوجائیں۔ اسی لیے وہ اسسٹنٹ کنٹرولر سے تعلقات بنائے ہوئے تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً اس کی کوٹھی پر جایا کرتا تھا۔ کبھی پھلوں کی ٹوکری لے جاتا، کبھی بچوں کے خوبانیاں، اخروٹ اور چلغوزے وغیرہ لے جاتا...... یہ درست ہے کہ اُسے وہاں جاکر آدھ یا پون گھنٹہ برآمدے میں کھڑے رہنا پڑتا تھا۔ اسسٹنٹ کنٹرولر صاحب کو ان کے وہاں جانے کی کچھ ایسی پروا بھی نہیں تھی۔ بڑی دیر کے بعد کہیں نکلتے۔ یہ سلام کے وقت دہرے ہو ہوجاتے وہ یوں ذرا سر کو حرکت دے کر اظہارِ خوشنودی کرتے۔ یہ پھلوں کی ٹوکری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے '' جی یہ الٰہ آباد کے امرود ہیں۔ ہمارے ایک عزیز وہاں رہتے ہیں۔ انہوں نے ایک بڑا سا ٹوکرا لیا تھا۔ چند اچھے اچھے دانے لے کر حاضر ہوا ہوں مجھے امید ہے کہ......

اسسٹنٹ کنٹرولر اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ امرود حضرت کو کسی نے نہیں بھیجے سیدھے بازار سے اٹھائے لیے آرہے ہیں...... وہ نوکر کو اشارہ کرتے اور وہ ٹوکری لے کر اندر چلا جاتا۔ اس کے بعد یہ سلام کر کے واپس لوٹ آتے۔

اسی طرح روز روز کی چاپلوسی سے خوش ہوکر ایک روز اسسٹنٹ کنٹرولر نے ان پر بہت عنایت کی۔ انسپکٹر رام جی داس ان سے ملنے گئے وہ برآمدے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ پی چکے تھے۔ یہ پہنچے تو انہوں نے انہیں بھی شامل کر لیا۔ یہ ان کی اس بندہ پروری پر بہت خوش ہوئے وہ تو دو منٹ بعد اندر چلے گئے۔ یہ اسسٹنٹ کنٹرولر کے خاص برآمدے میں بیٹھے خاص ان کے دعوت دینے پر چائے پیتے رہے اور بچے کھچے

نوٹ بھی اڑا گئے۔

اس طرح اسسٹنٹ کنٹرولر سے ان کے مراسم بڑھتے جارہے تھے۔ ایک روز اسی محلے میں نئے راشن کارڈ بننے والے تھے۔ علاحدہ علاحدہ گلیوں میں ہر انسپکٹر کو ایک ایک بیٹھک بٹھا دیا گیا۔ ان کی مدد کے لیے تین تین چار چار کلرک بھی ان کے ہمراہ تھے۔ انسپکٹر رام جی داس کو جو جگہ ملی وہ اسسٹنٹ کنٹرولر کی کوٹھی کے عین قریب تھی۔ یہ وہاں بڑے زور شور سے کارڈ بانٹتے رہے۔ چلاتے چلاتے گلا بیٹھ گیا۔ دم پھولنے لگا...... اتنے میں اسسٹنٹ کنٹرولر کا نوکر آیا اور کہا صاحب آپ کو بلاتے ہیں۔

یہ سن کر انسپکٹر رام جی داس ہکا بکا رہ گئے۔ ''ارے مجھے......؟ واقعی؟''

''ہاں جی انسپکٹر رام جی داس کو۔''

وہ فوراً بھاگا بھاگا وارڈ افسر کی اجازت لینے گیا۔ اور جب اُس نے بتایا کہ اسے اسسٹنٹ کنٹرولر نے بلایا ہے تو فخر سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

وارڈ افسر کو اجازت دیئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا...... یہ فوراً بھاگم بھاگ بڑے صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ بڑے صاحب اس وقت کار پر کہیں جارہے تھے۔ رام جی داس نے قریب پہنچ کر بڑے سعادت مندانہ طریقہ سے خوب جھک کر سلام کیا۔ اسسٹنٹ کنٹرولر نے سر کے اشارے سے جواب دیا اور فرمایا ''دیکھو رام جی داس! میں نے دلکشا سے مختلف قسم کے پھولوں کے چند گملے منگوائے ہیں' ذرا ٹھیلے والوں کے ساتھ جاکر اس پرچے کے مطابق سب گملے ٹھیلے پر لدوا کر احتیاط سے ہمارے ہاں پہنچا دینا۔ ہم ذرا باہر جارہے ہیں......''

انسپکٹر رام جی داس نے خوب گھگھیا کر دانت دیئے اور ممیا کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسسٹنٹ کنٹرولر کار میں بیٹھ کر چل دیئے۔

اسسٹنٹ کنٹرولر کی عمر اس وقت پچاس کے لگ بھگ ہوگی۔ چہرے سے خشونت اور لالچ کے آثار ہویدا تھے۔ اس وقت خوب اچھی طرح شیو کرچکے تھے۔ پوڈر ملا ہوا

تھا۔ ناک کے نیچے بزعم خود بڑ فلائی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن وہ بے ڈھب مونچھیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے گندگی پر منڈلانے والی بڑی مکھی انہوں نے پائپ منہ میں دبا رکھا تھا۔

اس وقت وہ اسسٹنٹ کنٹرولر تھے۔ انہیں معلوم ہوا تھا کہ راشننگ کنٹرولر سمندر پار جارہا تھا۔ اور وہ اس بات کے لیے جان توڑ کوشش کر رہا تھا کہ اس کی جگہ اُسے مل جائے۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے چیدہ چیدہ ذمہ دار ہستیوں کو ایک پارٹی بھی دی تھی اور اسے امید تھی کہ اس کا کام بن جائے گا۔ وزیرِ مالیات سے اس کی معمولی علیک سلیک تھی۔ وہ اس سے ملنا چاہتا تھا۔

کار اڑاتا ہوا وہ وزیر مالیات کی کوٹھی پر پہنچا۔ اپنے نام کا کارڈ اندر بھجوا کر وہ آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے پھر سے پائپ سلگایا اور دھواں اڑانے لگا۔ معاً اس نے دیکھا کہ سامنے ایک بڑی سی کار میں سامان لد رہا ہے۔ اس نے ایک نوکر سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وزیر صاحب شملہ کو تشریف لے جارہے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اب ملاقات نہ ہو سکے گی۔ لیکن کارڈ بھجوا چکا تھا انتظار لازمی تھا۔ وہ برآمدے میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

دس پندرہ منٹ بعد وزیر باہر نکلا۔ وہ بہت جلدی میں تھا۔ اس نے مسکرا کر جلدی سے مصافحہ کیا۔ اسسٹنٹ کنٹرولر نے لپک کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ جیسے یہ نادر موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آئے گا۔ ''آیم ویری سوری...... ویری سوری...... آئی ایم آل ریڈی لیٹ......''

یہ کہتے ہوئے وزیر مالیات کار کی طرف بڑھے۔ اسسٹنٹ کنٹرولر نے گھگیا کر دانت نکال دیئے اور ممیا کر کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ کار یہ جا وہ جا......

وزیر مالیات نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ گاڑی چھوٹنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔ وہ سیٹیں پہلے ہی سے ریزرو کرا چکا تھا۔

جب سے اس نے ڈیول پلین کی بابت اخبارات میں پڑھا تھا۔ اس کے دنوں کا چین اور راتوں کی نیند غائب ہوچکی تھی۔ وہ ایک چتا پرزہ شخص تھا۔ اب تک وہ ترقی کی منزلوں پر منزلیں صرف اپنی چرب زبانی اور چال بازی کی بدولت طے کیے جارہا تھا۔ ڈیول اسکیم کی بابت اس نے غور کیا تو خیال آیا کہ وہ کیوں نہ کوئی داؤ پیچ لڑائے۔ شاید وہ بھی کسی پارٹی کی طرف ایکزیکیوٹیو کونسل میں آجائے۔ آہا کیسا لطف ہو۔

خدا خدا کر کے وہ اسٹیشن پر پہنچا۔ اِدھر اُس نے ڈبے میں قدم رکھا اُدھر گاڑی چل دی۔

وہ راستے میں نئی سے نئی ترکیبیں سوچتا چلا گیا۔ کن کن اشخاص سے ملنا چاہیے۔ اس کا کون سا دوست یا واقف کار اس کی کیا مدد کرسکتا تھا۔ کن کن لوگوں پر ڈورے ڈالنے ہوں گے۔ کیا کیا ہتھکنڈے کھیلنے ہوں گے؟

وہ وہاں وائسرائے کی دعوت پر تو گیا ہی نہیں تھا۔ نہ اس کا کسی خاص پارٹی سے کچھ تعلق ہی تھا۔ اور نہ کسی سے ہمدردی۔ اُسے اپنا الو سیدھا کرنا تھا۔ وہ ہر شخص سے ملنے پر آمادہ تھا کسی بھی سیاسی نظریے کی حمایت کرنے کے لیے تیار تھا۔

پہلے اس نے اس بات کی کوشش کی کہ وائسرائے سے ملاقات ہوسکے۔ اُس نے اِدھر اُدھر کافی دوڑ دھوپ کی۔ لیکن دال نہ گلی۔

اس کے بعد اُس نے ہر قسم کے لیڈروں سے مراسم پیدا کرنے کی کوشش کی اُس نے چند اہم ہستیوں کو چائے پر بھی مدعو کیا۔ چائے پارٹی کے موقع پر وہ بڑی چرب زبانی سے باتیں کرتا رہا۔ حاضرین کے مزاج اور ذوق کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے ہنسی مذاق کر کے مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ باتوں باتوں میں ان کے خیالات کی حمایت بھی کرتا رہا۔

کانفرنس ہوتی رہی۔ وزیر صاحب بھی تھالی کے بینگن کی طرح اِدھر اُدھر لڑھکتے رہے۔ کبھی خوش ہوجاتے اور کبھی مایوس۔

اُنہوں نے کانگریس پارٹی کا زور دیکھا تو ان کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ آخر اس میں ہرج بھی کیا تھا۔

کانگریس کے ایک بڑے لیڈر کی پریس کانفرنس میں یہ بھی جا دھمکے۔ یہ ذرا ایک طرف کو کھڑے ہوئے تھے۔ جب وہ لیڈر بات کہتا کہتا ان کی طرف رخ کرتا یہ کھکھیا کر دانت دکھا دیتے اور پھر جوں ہی میا کر کچھ کہنے لگتے اتفاق سے بے خیالی میں لیڈر دوسری طرف رخ پھیر لیتا۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

کسک

دس برس ڈاک خانے کی نوکری کرنے کے بعد تنگ آ کر اس نے ملازمت کو خیر باد کہہ دیا......اُسے ان دنوں ایک خواب دکھائی دیا کہ وہ کسی طرف چلا جارہا ہے۔ چلتے چلتے اس کی نظر اپنے بوٹوں پر جا پڑی۔ دیکھتا کیا ہے کہ اس کے بوٹوں پر لگی ہوئی کیچڑ خود بخود جھڑ کر پرے جا گرتی ہے اور اس کے بوٹ خوب چمکنے لگتے ہیں...... اس نے اِسے اچھا شگون سمجھا۔ اور پھر پرماتما کا کرنا دیکھئے کہ اس واقعہ کے بعد تین سال کے اندر اندر اس کی مالی حالت مستحکم ہوگئی۔ پہلے وہ شہر میں رہتا تھا۔ وہاں اس کا آبائی مکان تھا۔ لیکن نہ وہ مکان اچھا تھا نہ وہ محلّہ ہی اُسے پسند تھا۔ اب چوں کہ وہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ اخراجات کا متحمل ہوسکتا تھا اس نے سوچا کہ آبائی مکان کو کرایہ پر اٹھا دے ماہانہ کرایہ میں اپنی جیب سے کچھ روپیہ ملا کر اس قدر رقم ہوسکتی تھی کہ وہ سول لائنز میں بہتر مکان لے سکے۔

جب پرماتما کام سنوارنے پر آئے تو پھر اِدھر انسان کوئی اسکیم سوچتا ہے اور اُدھر اس کا کام بننے لگتا ہے۔ انہیں دنوں اُسے ایک چھوٹا بنگلہ بھی مل گیا۔ اگرچہ یہ سول لائنز کے سرے پر تھا۔ لیکن رہائش کے لیے اچھی خوب صورت اور پر فضا جگہ تھی۔

غرض اب وہ زندگی کی اس قسم کی چھوٹی موٹی سہولتیں حاصل کرنے کے قابل

ہوگیا تھا۔ یہ درست ہے کہ وہ اب تک روپیہ جمع نہ کر پایا تھا۔ لیکن پہلے کی بہ نسبت اب آرام سے کٹ رہی تھی۔ رہنے کے لیے اچھی جگہ حاصل ہوگئی تھی۔ روپیہ کمانے کے لیے پہلے کی طرح کولھو کا بیل بن کر صبح سے شام تک قلم گھسنے کی اور افسروں کی جھڑکیاں سہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اس کا بنگلہ چھوٹا سہی لیکن خوب صورت ضرور تھا۔ نیا ہی بنا تھا۔ بنگلے کے اردگرد باڑ تھی اور یوکلپٹس کے پیڑ۔ بنگلے میں وہ اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ زندگی کے دن آرام سے کاٹ رہا تھا۔ یوں تو انسان کی حرص کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ لیکن بظاہر کوئی ایسی بات نہ تھی جو اس کے لیے پریشان کن ثابت ہوتی۔

اٹھائیس برس کی عمر میں اُس نے نوکری چھوڑ دی۔ چار برس اوپر گزر گئے تھے— اس کی شادی سولہ برس کی عمر ہی میں ہوگئی تھی۔ بیوی دو ڈھائی برس چھوٹی تھی۔ اس وقت اُسے عورت کی خوب صورتی، رعنائی اور عشق وغیرہ کا خیال نہ تھا۔ بس عورت تھی یہ بات اس کے لیے کافی تھی۔ جوں ہی اس نے ہوش سنبھالا اُسے ایک عورت مل گئی۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اگرچہ وہ حسین تھی لیکن اس نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ حسین تھی یا بدصورت اُس کے لیے صرف ایک ہی بات کی اہمیت تھی۔ وہ جوان تھا اور اس کی بیوی ایک عورت تھی۔ اس نے داد عیش دی۔ دن ہو یا رات جب وقت ملتا وہ اپنی بیوی کو دبوچ لیتا۔ بس زندگی میں یہی دو کام تھے نوکری اور بیوی۔

عورت نے بچے دینے شروع کیے کوئی زندہ رہتا کوئی مرجاتا۔ اُسے اس بات کی کوئی فکر نہ تھی۔ بچہ مرتا ہے مرے جیتا ہے تو جئے۔ لیکن اس کی بیوی سلامت رہنی چاہئے۔ اب تو خیر اُسے اپنے بچوں سے محبت ہوگئی تھی۔ لیکن ان دنوں اُسے یہ بچے عجیب مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ وہ سوچا کرتا تھا کہ نہ معلوم یہ نیلے پیلے گلگلے بچے کہاں سے ٹپک پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُسے اپنی بیوی کی زرخیزی پر غصہ آتا تھا۔ ہر سال ایک بچہ کم بخت بھری بیٹھی رہتی ہے۔ بس ذرا ہاتھ سے چھو دو جھٹ ایک جیتا جاگتا' روتا ہنستا' پلپلا' لجلجا بچہ اُگل دیتی ہے۔ کبھی کبھار وہ کسی بے تکلف دوست سے کہتا یار! قدرت کے لیے یہ بات ناممکن تو نہ تھی اگر عورتیں بھی بچوں کے بجائے انڈے دینے لگتیں۔

سوچو اُستاد۔ ہوتی نہ مزے کی بات۔ اگر حمل قرار پا جاتا عورت مزے میں ایک انڈا دے دیتی۔ ناحق کی پریشانی سے تو بچے رہتے میاں بیوی۔

دیکھنے میں وہ دبلا پتلا شخص تھا۔ لیکن عورت کی بھوک اس قدر زیادہ تھی کہ مٹائے نہ مٹتی تھی۔ وہ شاعروں کی طرح عورت کی نزاکت اور رعنائی کا قائل نہ تھا۔ اس کے نزدیک عورت ایک ٹھوس شے تھی۔ وہ ایسی عورت چاہتا تھا جس کے جسم پر مضبوط اور ٹھوس گوشت ہو۔ کس بل ہو اور حیوانیت ہو' جو مرد سے ٹکرا جائے...... اُسے جھینپتی' شرماتی' لچکتی' بل کھاتی' نازک اندام عورتیں پسند نہیں تھیں۔

اس نے اپنا نفسیاتی تجزیہ کبھی نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ باتیں وہ وجدانی طور پر محسوس کرتا تھا۔ اب جوں جوں اس کی زندگی آرام دہ ہوتی جارہی تھی توں توں اُس کا یہ احساس واضح ہوتا جارہا تھا۔ وہ جس طرح پیاس محسوس کرتا تھا۔ جس طرح اُس کے پیٹ کو روٹی کی طلب ہوتی تھی یا جس طرح اور قدرتی اشیاء کی انسان کو احتیاج ہوتی ہے اسی طرح اُسے عورت کی بھوک تھی۔ وہ حیران تھا کہ اب تک اپنی ازدواجی زندگی میں بھی وہ زیادہ محتاط نہ رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کی یہ اشتہا روز اول کی طرح باقی تھی۔

ہر چند اس نے اپنی بیوی کے جسم کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ لیکن جس طرح برف کا پانی خواہ کتنا بھی کیوں نہ پیا جائے تشنگی دور نہیں ہوتی۔ اُسی طرح وہ انجانے طور پر بے چین سا رہتا تھا۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک جلا کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کے حوالے کر دینا چاہتا تھا تاکہ آگ میں آگ مل جائے۔

بنگلے کا ایک کمرہ اُس نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔ یہ کمرہ ایک کنارے پر تھا۔ سجاوٹ کا کوئی خاص سامان اس کے اندر موجود نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود کمرے کی اپنی خوبیاں بھی تھیں۔ ایک تو یہ بہت کشادہ تھا۔ اور پھر ہوا دار تھا۔ صوفوں کا ایک سیٹ۔ ایک گوشہ میں میز۔ دوسرے کونے میں کتابوں کی دو الماریاں، فرش پر دری۔ بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشوں پر ہلکے سبز رنگ کی جالی۔ بس اس کے علاوہ وہاں کچھ نہ تھا۔

کمرے کے آگے گھاس کا ایک پلاٹ تھا۔ اس کے آگے باڑ اور یوکلپٹس کے پیڑ۔ باڑ کے آگے سے ایک سڑک گزرتی تھی جو چکر کھا کر سول لائنز کی گھنی آبادی میں داخل ہوجاتی تھی۔ سڑک کے آگے ایک میدان تھا۔ میدان کے پرلی طرف زمین میں طویل و عریض گڑھے کھدے ہوئے تھے۔ وہاں کمہار مٹی لینے کے لیے جایا کرتے تھے۔ ان گڑھوں سے بھی پڑے کھیتوں کے سلسلے شروع ہوجاتے تھے۔

دوپہر کے وقت وہ آرام کرسی پر پاؤں پھیلا کر نیم دراز ہوجاتا اور سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے نیم باز آنکھوں سے میدان کی طرف دیکھا کرتا جہاں چلچلاتی دھوپ میں بھنگے سے اڑتے دکھائی دیا کرتے تھے۔ اندر کے کمروں سے بچوں کا شور اور اس کی بیوی کی جھڑکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ اگر ایک بجے کا وقت ہوتا تو ریڈیو پر رکارڈ بجنے لگتے۔

اسی طرح ایک دن دوپہر کے وقت وہ آرام کر رہا تھا۔ کھڑکی میں سے چلچلاتی دھوپ میں اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جہاں اُفق کی لکیر سطح آب کی طرح متحرک سی نظر آتی تھی۔۔۔ اتنے میں اس کی بیوی اندر داخل ہوئی...... ''اجی!...... اجی کہاں ہو؟''

اس نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ بیوی نے دور ہی ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔'' ادھر آیئے جی...... آپ کو ایک چیز دکھائیں۔'' اس وقت اس کی بیوی کسی پانچ سالہ بچی کی طرح معصوم نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تجسس اور لبوں پر بچپن کی شوخی جھلکتی نظر آتی تھی۔ سر پر کپڑا تک نہ تھا۔ دوپٹہ کندھوں پر لٹک رہا تھا۔ قمیض کا باریک کپڑا پسینہ کی وجہ سے جسم سے چپک گیا تھا۔ اس نے اٹھ کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈالے اور ہونٹ چوم کر پوچھا۔'' کیا دکھایئے گا؟''

شرم کے مارے بیوی کے چہرے پر سرخی آگئی۔ وہ اب بھی شرما جاتی تھی۔ بھلا اب جبکہ شادی کو سولہ برس ہوچکے تھے۔ شرمانے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ دیہات کی رہنے والی تھی۔ وہ ان باتوں کو بے شرمی ہی سے تعبیر کرتی تھی۔ جاہل! لیکن

یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ یہ اُسی عورت کا دم تھا کہ اتنے بچے دینے کے بعد بھی اس میں دل کشی باقی تھی۔

بعض حقیر ترین واقعات سے ہمارے جذبات کچھ اس طرح وابستہ ہوتے ہیں کہ ہم ان واقعات کو حد سے بڑھ کر اہمیت دے دیتے ہیں۔ اُسے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب اس کی بیوی اُسے "ایک چیز" دکھانے کے لیے بلا کر لے گئی تھی اور وہ "ایک چیز" کیا تھی؟— ایک کتا، کوئی مہتر لایا تھا۔ چھوٹا سا فاکس ٹیریر کی نسل کا یہ خوب صورت کتا دیکھ کر اس کے بچے مچل گئے تھے۔ اور بیوی کہتی تھی کہ شوہر رات کو دیر دیر سے گھر آتے ہیں تنہا بنگلہ ہے کتا ہوگا تو رکھوالی ہی کرے گا۔

وہ اُکڑو بیٹھ کر کتے کو بغور دیکھنے لگا۔ یہ چھوٹا سا کتا جس کی چار انگل لمبی زبان منہ سے باہر لٹک رہی تھی۔ گھر کی کیا رکھوالی کرے گا۔ وہ مہتر نہ معلوم اسے کہاں سے اڑا لایا تھا۔ بہت زیادہ دام مانگتا تھا۔ لیکن جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔ یہ فضول خرچی بھی اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی...... وہ جانتا تھا کہ چوں کہ ان کے دوست مچندہ کے یہاں کتا ہے۔ اس لیے اس کی بیوی بھی امارت کی اس علامت کو ظاہر کرنا چاہتی تھی...... حالانکہ یہ فضول خرچی تھی۔ اسی طرح کی فضول خرچی جیسی اُنہوں نے کوچ کا سیٹ خریدتے وقت کی تھی۔

یہی وہ کتا تھا جسے اپنے ہمراہ لے کر وہ کھیتوں کی طرف نکل جاتا تھا...... ایک مرتبہ جب وہ شام کے وقت حسب معمول سیر پر جانے لگا۔ تو باڑ پھاندتے ہوئے اس کی پتلون کا پائنچہ کانٹوں میں پھنس گیا۔ وہ اُسے چھڑانے لگا اور کتا پاس کھڑا دم ہلا ہلا کر بھونکنے لگا۔ جب اس نے پائنچہ کانٹوں کی گرفت سے آزاد کرلیا تو دیکھا کہ سڑک پر ایک عورت کھڑی ہے۔

وہ اس کے کتے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اُسے یہ کتا پسند تھا۔ اُس نے پوچھا "یہ کتا آپ کا ہے؟"

"جی ہاں۔"

اس نے عورت کی طرف نظر بھر کر دیکھا۔ وہ کالج کی چنچل لڑکی نہ تھی۔ نہ وہ نازک اندام اور محشر خرام تھی۔ نہ وہ شرمیلی تھی اور نہ اس کی جھکی جھکی نظریں تھیں۔ نہ وہ بے حیا تھی نہ وہ بے باک تھی۔ بس وہ ایک عورت تھی سنجھی ہوئی۔ ٹھہری ہوئی۔۔۔ اس کے گورے بھرپور ہاتھوں کو دیکھ کر وہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ اس کی شوخ رنگ کی شلوار کے اندر اس کی ٹانگیں کیسی ہوں گی۔ اس کی عمر پچیس چھبیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ آنکھیں مدبھری۔ اس کے چہرے پر اُس کی بیوی کی طرح احمقانہ بھولا پن نہ تھا۔ اس کا جسم تازہ سجے ہوئے دسترخوان کی طرح تھا جس کی خوشبو سونگھ کر انسان کی اشتہا تیز ہوجاتی ہے۔ وہ اچھی طرح پکے ہوئے پراٹھے کی طرح تھی۔ جو نہ جلا ہوا تھا نہ نیم پختہ تھا۔ جس ٹھوس گوشت کی اُسے بھوک محسوس ہوا کرتی تھی وہ اس کے سامنے تھا۔

عورت نے اُس سے آنکھیں ملا کر کہا۔ "بڑا پیارا کتا ہے...... میں چھولوں؟ کاٹے گا تو نہیں؟"

"جی نہیں۔" اُس نے ہنس کر کہا۔ "گھر میں چور یا ڈاکو بھی آن گھسیں تو یہ اُنہیں نہ کاٹ سکے......"

وہ ہنس پڑی...... یہ شرمیلی ہنسی نہ تھی۔ نہ بے باک ہنسی تھی۔

جب تک وہ کتے کے جسم پر اپنا خوب صورت ہاتھ پھیرتی رہی وہ اس کے جسم کی طرف دیکھ دیکھ کر اس کا جائزہ لیتا رہا۔ عورت باتیں بھی کرتی رہی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ وہ اس کی طرف تعریف کی بلکہ حریص نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن وہ بالکل پریشان نہیں ہوئی نہ جھینپی نہ خفا ہوئی...... اور جب وہ کھڑی ہوکر پیچھے کی طرف سر گھما کر دوپٹے کے گرد آلود کونے کو جھاڑنے لگی تو اس کی کمر میں ایک دل نشین خم پیدا ہوگیا تھا۔ چھاتیاں اور بھی آگے کو ابھر آئیں شلوار کے بل نیچے کو گر گئے اور کپڑا جلد کو جالگا اور اس کی ایک ران کی گولائی اور متناسب بناوٹ عیاں ہوگئی...... پھر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی۔ اس

نے دوپٹہ کو معمولی طور پر سنوارا...... اور ہنستے ہوئے بولی۔ ''اچھا..... شکریہ!''

عورت چل دی اور وہ کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ افق میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ داہنے ہاتھ کی طرف وسیع پھیلے ہوئے کھیت پیلے رنگ میں رنگے گئے۔ اور وہ عورت اس نسبتاً سنسان سڑک پر چلی جارہی تھی۔ کبھی کبھار بائیں ہاتھ کو بنی ہوئی کوٹھیوں میں سے کتے باہر نکل کر یوں ہی بلا کسی مقصد کے بھونکنے لگتے۔ سورج کی روشنی میں اس کی زعفرانی رنگ کی گھٹنوں تک لٹکتی ہوئی قمیص اور بھڑک دار دوپٹہ جگمگا اٹھا۔ دور سے وہ ایک لپکتے ہوئے شعلے کی طرح نظر آرہی تھی۔

اس کے دل میں ہل چل پیدا ہوگئی۔ اس دن وہ بہت دور تک سیر کرتا ہوا چلا گیا۔

زندگی میں ایک نیا تجربہ تھا۔ نیا خیال اور نیا ہی سرور تھا۔ آج تک اس نے کبھی کسی غیر عورت کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ لیکن آج اس نے اس عورت کو جی بھر کر دیکھا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ اس کا دل بھر گیا تھا۔ اب تو اس کے دل میں ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔ دل کرب و مسرت کے ملے جلے جذبات کے بحران میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اس کے دل میں اس عورت کے لیے بے پناہ چاہت پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اس عورت سے انجانے طور پر روزِ ازل سے محبت کرتا چلا آرہا تھا اور ابد تک کرتا چلا جائے گا۔ ایک نیا سورج طلوع ہونے کو تھا۔ امنگوں اور ترنگوں کی نئی صبح کا نور دکھائی دے رہا تھا۔

وہ گھر واپس آیا تو یوں ہی خوش خوش نظر آرہا تھا۔ بیوی بھی اسے دیکھ کر حیران ہو رہی تھی کہ آخر وہ اس قدر خوش کیوں تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ ریڈیو کے پاس بیٹھا بچوں سے ہنستا کھیلتا رہا۔

دوسرے دن اس کا اِدھر اُدھر کے کاموں میں دل ہی نہ لگا۔ وہ کھلنڈرے بچے کی طرح اِدھر اُدھر لا پروائی سے گھومتا رہا۔ پھر اس نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ وہ خوش کیوں تھا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ اُس اجنبی عورت سے راہ و رسم پیدا ہوجائے۔ کیا وہ پھر کبھی آئے

گی۔ اس خیال سے اُس کا دل اُداس ہوگیا۔ اس بات کی کیا گارنٹی تھی کہ وہ عورت آج پھر ادھر سے گزرے گی...... لیکن وہ سرِ شام ہی اس کی راہ دیکھنے لگا۔ وہ باڑ کے قریب کتے کو پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ یہاں سے وہ اس عورت کو دور ہی سے دیکھ سکتا تھا...... اس کی آنکھیں سڑک پر بچھی ہوئی تھیں۔ لیکن کمہاروں کے گدھوں کے سوا سڑک پر کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ امید و بیم کی حالت میں وہ جگر تھامے بیٹھا رہا...... معاً اس نے اُنہیں کپڑوں کی جھلک دیکھی...... کیا وہ تھی؟...... وہی تھی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ ذرا پرے ہٹ کر کتے کو ساتھ لیے ہوئے اُسی انداز سے عین موقع پر اس کے سامنے پہنچ گیا۔

عورت نے پھر کتے کی طرف دیکھا۔ سیٹی بجا کر اُسے بلایا۔ وہ بھی قریب جا کھڑا ہوا۔ پہلے روز کی طرح وہ اس کی طرف دیکھتا رہا...... کتا عورت کے ہاتھوں سے کھیلتا رہا۔ عورت ہنستی رہی۔ پھر اس نے اُس کی طرف دیکھ کر دل فریب ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ کا یہ کتا تو واقعی بہت پیارا جانور ہے۔

''جی ہاں، اتفاق سے ہاتھ لگ گیا۔ ورنہ آپ جانتی ہیں اچھی نسل کا جانور بڑی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔''

عورت نے اپنے بندوں کو چھو کر کہا۔ اس کا شجرۂ نسب آپ کے پاس موجود ہے؟......''

''جی ہاں! میرے پاس موجود ہے۔ یہ خالص فاکس ٹیریر...... دراصل اسی قسم کی ہے۔ بس ذرا پیار کرنے کے لیے رکھ لیا جاتا ہے......''

عورت نے جواب میں اس طرح سر ہلایا جیسے وہ اس کی نسبت ان معاملات کو زیادہ اچھی طرح سمجھتی ہو۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ آگے روانہ ہوگئی۔

وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اُس نے پہلے روز والے بھڑک دار کپڑے پہن رکھے تھے۔ دوڑ دھوپ میں اس کا لباس پہلے روز کی طرح جگمگا رہا تھا۔

وہ آئی اور گزر بھی گئی۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کا دل سینے کی قید سے آزاد ہوجانا چاہتا تھا۔ آج وہ کل سے بھی زیادہ دل فریب نظر آرہی تھی۔ بعض عورتوں کی آنکھیں خوب صورت ہوتی ہیں۔ بعض کے ہاتھ۔ بعض کے ہونٹ۔ بعض کی ادائیں۔ لیکن اس کے لیے اس عورت کا پورے کا پورا جسم سر سے پاؤں تک کشش کا باعث تھا۔ وہ اس مکمل جسم کے لمس کا خواہاں تھا۔ اُسے وہ صحیح قسم کی عورت دکھائی دی۔ جس کے لیے اس کا دل ہمیشہ تڑپا کرتا تھا۔ اس کی اشتہا اس قدر سچی اور قدرتی تھی کہ اُسے لمحہ بھر کے لیے بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ ایک غلط راستے پر چل رہا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ یہ راستہ پر خار ہے۔ لیکن یہ کہ اس رستے پر چلنا اخلاقی اور سماجی نقطۂ نظر سے معیوب تھا وہ نہیں جانتا تھا۔ بلکہ وہ اس طرف متوجہ ہی نہیں ہوا۔

حالانکہ اب اس کی عمر بتیس برس سے تجاوز کر چکی تھی، لیکن وہ عورتوں کے معاملے میں ہمیشہ شرمیلا ہی رہا۔ صرف اس کی بیوی ہی وہ عورت تھی جس سے وہ بے باکی سے پیش آتا تھا۔ لیکن غیر عورت کے سامنے وہ آنکھ نہ اٹھا سکتا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز بات تھی کہ جو شخص اپنے دل میں بھڑکتی ہوئی آگ لیے پھرتا تھا اُس کے سامنے جب کبھی کوئی نوجوان لڑکی یا عورت آجاتی تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ زبان لڑکھڑانے لگتی۔ شاید اُسے یہ خیال تھا کہ کہیں کوئی عورت اس کے دل کی کیفیت کو بھانپ نہ لے۔ اور شاید اُسے اپنے آپ پر بھروسہ نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اُس کا راز اس کی صورت ہی سے افشا ہوجائے گا۔ فلاں اس کی سالی تھی۔ پرماتما نہ کرے اگر وہ دیکھ پائے تو کیا کہے۔ فلاں اس کی بیوی کی سہیلی یا اس کے دوست کی بیوی تھی اگر وہ اس کے دل کا حال جان جائے تو نہ معلوم کیا ہو۔ اگر کبھی عورت کے جمگھٹے میں بیٹھ جاتا تو نئی نویلی دلہن کی طرح زمین کی طرف ہی دیکھتا رہتا۔ وہ دل میں کئی عورتوں کی قدر کرتا تھا اُنہیں پسند کرتا تھا۔ وہ اُن کے حسن کا معترف تھا لیکن وہ یہ راز ظاہر کرنے سے ڈرتا تھا اور یہ راز ظاہر کرنے کے لیے اُسے منہ کھولنے کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی بس اس کی

آنکھیں اور اس کے دیکھنے کا انداز ہی کافی تھا......

یہ پہلی عورت تھی جس کے سامنے وہ نہیں شرمایا۔ اُسے یہ سب کچھ اس قدر قدرتی نظر آنے لگا۔ وہ عورت اس قدر مکمل عورت تھی۔ اس کا عورت پن اس قدر ہمہ گیر تھا۔ وہ اپنے عورت ہونے سے اس قدر مکمل طور پر آگاہ تھی۔ مرد کا اس کے جسم کے نظارے یا لمس سے لطف اندوز ہونا اس کے لیے ایک فطری بات تھی۔ مرد کا اس پر نچھاور ہونے پر آمادگی ظاہر کرنا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ جس طرح سڑک کو اپنے سینے پر قدم جما جما کر چلنے والوں سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اسی طرح اس عورت کو بحیثیت عورت کے کسی مرد سے بحیثیت ایک مرد کے کوئی شکایت نہ تھی۔ وہ مرد کے لیے پیدا ہوئی تھی۔ اس نے مرد کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر چلنے کے لیے جنم لیا تھا۔

دنیا میں قدرت نے صرف ایک عورت کیوں پیدا کی تھی۔ باقی نام نہاد عورتیں' عورتوں کے روپ میں درحقیقت کیا تھیں؟

وہ اس عورت کی عظمت کا اسی طرح قائل تھا جس طرح آسمان میں چمکنے والے سورج کا۔ جس طرح آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ستاروں میں مسکرانے والے چاند کا' جس طرح روح کو تازگی بخشنے والی فرانٹے بھرتی ہوئی ہوا کا۔ جس طرح ہر اونچے نیچے ٹیلے' محل اور جھونپڑے پر برسنے والی بارش کا وہی اصلی عورت تھی جو صبحِ ازل سے خراماں تھی۔ وہی اس کی بیوی تھی جسے وہ اپنی رانوں پر بٹھا کر اس کے جسم سے بے پناہ لذت حاصل کرسکتا تھا۔ وہی اس کی ماں تھی جس کی گود میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو سکتا تھا۔ وہی اس کی بہن تھی جس کی انگلیوں کے لمس سے ابدی مسرت اور سکون کا احساس اس کے جسم کے روئیں روئیں کو محسوس ہونے لگتا تھا۔ وہی اس کی بیٹی تھی جس کی پیشانی پر ہونٹ رکھ کر وہ شفقت پدری کے مزے لوٹ سکتا تھا...... وہ عورت اس کے لیے سب کچھ تھی۔ انسانی وجود میں سمٹ کر بھی وہ کائناتِ عالم میں پھیلی ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس عورت کو پالینا اس کے بس کی بات نہیں جس طرح قطرے کے لیے سمندر

کو اپنے اندر کھپا لینا ناممکن تھا۔ وہ کبھی بھی اس عورت کو تھام نہ سکتا تھا۔ وہ کبھی اسے اپنے بازوؤں میں نہ جکڑ سکتا تھا۔ البتہ وہ خود اس میں گم ہوسکتا تھا۔ اس کے دل میں ایسی جلن اور دماغ میں ایسی بھڑک تھی کہ وہ اپنے آپ کو مٹا دینا چاہتا تھا۔ اس عورت کو دیکھ کر وہ اپنے جذبات کا جائزہ لے سکتا تھا۔ کیا وہ اسے زبردستی اٹھا کر کھیت میں جا گھسے اور اُسے کھردری زمین پر لٹا دے۔ یا آنکھوں میں آنسو بھر کر اُس کے پاؤں چھولے۔ یا اس کا ہاتھ تھام کر وہ دونوں اکٹھے نہر پر چلے جائیں جہاں وہ ریت کے گھروندے بنا بنا کر کھیلیں یا وہ اس کی پیشانی چوم کر اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرے۔

اس کا دماغ اس ذہنی کش مکش کا حل سوچنے سے بالکل قاصر تھا۔ وہ کیچڑ میں دبے ہوئے مینڈک کی طرح اتنے عرصہ تک بالکل خاموش رہا۔ لاوا اندر ہی اندر اُبال کھاتا رہا۔ اب وہ بہہ نکلا۔ کیا سورج مکھی پہاڑ کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اس کے اندر سے اُبل اُبل کر باہر آنے والے لاوے کو روکا جاسکتا ہے۔ اجنبی عورت نے گویا ایک نشتر سے اس پکے ہوئے پھوڑے کو چیر ڈالا تھا۔ وہ درد کے مارے چیخ اٹھا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک ناقابلِ بیان راحت بھی نس نس میں سرایت کرتی جارہی تھی۔ کھنچے اور دکھے ہوئے اعصاب کو سکون حاصل ہو رہا تھا۔ نشتر کے مس پر مارے کرب کے وہ تڑپ بھی اٹھتا تھا۔ لیکن وہ اس کی زد سے باہر بھی نہیں رہنا چاہتا تھا...... اُسے اس قدر تسکین ہو رہی تھی۔

اُسے آج واضح طور پر معلوم ہوگیا کہ وہ کیوں اس وسیع دنیا میں کھویا کھویا سا گھوما کرتا تھا۔ وہ کون سی پکار تھی جو اسے شور دغل میں سنائی دیا کرتی تھی۔ وہ کیوں ہر راہ رو کے ساتھ کچھ دور تک بے اختیار بھاگا چلا جایا کرتا تھا— لیکن یہ حالت بے چینی اور کرب کی تھی۔ سکون ایسا ہی تھا جیسے گرمیوں کے دنوں میں تیز و تند جھلس دینے والی لو میں سرد ہوا کا کوئی جھونکا انسان کی تپتی ہوئی پیشانی اور کانوں کو چھو کر نکل جائے۔

ہر روز شام کے وقت وہ خط بنا کر صاف ستھرے کپڑے پہن لیتا اور پھر کتے کو

ساتھ لے کر باہر نکل جاتا۔ کبھی سڑک پر گھومتا۔ کبھی ذرا کھیتوں کی طرف نکل جاتا۔ کبھی اپنی باڑ کے اسی طرف ٹہلتا...... لیکن اس کی نگاہیں اُسی طرف جمی رہتیں جس طرف سے وہ عورت آیا کرتی تھی۔ وہ نت نئے کپڑے پہنتی۔ ایک تو اُسے کپڑے پہننے کا سلیقہ تھا اور پھر وہ غضب کی جامہ زیب عورت تھی۔ اس کے جسم پر ہر قسم کا لباس کھل جاتا تھا۔ جو لباس اس کے جسم کو چھو لیتا اس کی خوب صورتی اور کشش دُگنی ہوجاتی۔

وہ ہر روز اُسے دیکھا کرتا تھا۔ ہر مرتبہ وہ تہیا کرتا تھا کہ وہ اس سے بات چیت کرے گا۔ لیکن جب وہ سامنے آتی تو وہ کچھ نہ کہہ پاتا۔ اس کی وجہ رعبِ حسن نہ تھا بلکہ کچھ اور ہی کیفیت تھی جسے وہ خود نہ سمجھتا تھا۔ مثلاً وہ اس سے کیا بات کہے۔ کیا وہ یہ کہے کہ اگر اُسے کتا پسند ہو تو وہ لے لے۔ لیکن اس کی کوئی وجہ ہونی چاہئے۔ آخر ایک عورت اس طرح بلا کسی تعلق کے کتے لینا پسند نہ کرے گی۔ وہ خواہ مخواہ نہ معلوم اُسے کیا سمجھ بیٹھے۔ اس نے سوچا کہ عورت کو کتوں سے بہت دل چسپی ہے۔ اس لیے اس نے کتوں پر چند کتابیں پڑھ ڈالیں تاکہ اگر گفتگو ہو تو وہ اسے اپنے وسیع علم کا گرویدہ بنا سکے۔ لیکن پھر کبھی اس موضوع پر بات ہی نہیں ہوئی۔

وہ خود حیران تھا کہ وہ اس سے تعلقات پیدا کرنے سے قاصر کیوں تھا؟ عورت کا رویہ دل شکن ہرگز نہ تھا۔ اس قدر بے باکی سے اُس نے آج تک کسی عورت کی طرف نہ دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود عورت کے ماتھے پر کبھی کوئی شکن نہ دکھائی دی۔ اگر وہ اس سے کوئی بات کہتا تو ہنس کر جواب دیتی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک گفتگو کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکتا تھا۔ چناں چہ ان دونوں کے درمیان ایک بے معنی سی خاموشی طاری ہوجاتی تو عورت چپ چاپ آگے بڑھ جاتی۔ وہ اسے دیکھتا رہ جاتا۔ یہاں تک کہ وہ موڑ پر گھوم کر غائب ہوجاتی۔

اس کا پہلا شدید احساس زائل ہوتا جارہا تھا۔ اس عورت کی طرف دیکھنا، اس کے دل کش جسم پر نظریں دوڑانا اُسے اس قدر فطری معلوم ہوتا تھا جیسے یہ اس کا دائمی حق

تھا۔ جسے عورت کی خفگی بھی نہیں چھین سکتی تھی۔ بلکہ اُسے یوں محسوس ہوا تھا کہ اگر وہ اُسے سڑک پر کھڑے کھڑے اپنی چھاتی سے لپٹا کر اس کے بوسے بھی لے لے تو یہ بھی ایک قدرتی بات ہوتی۔ یہ ایک عجیب جذبہ تھا جو کسی عورت کو دیکھ کر اُس کے دل میں پیدا نہ ہوا تھا صرف یہی ایک عورت تھی جسے دیکھ کر اس کے ذہن میں اس قدر صحت ور جنسی جذبہ پیدا ہوا۔ بلکہ اس عورت نے بوتل کے جن کی طرح پھیل کر اس کے خیالات کو پر لگا دیئے تھے اور وہ چشم زدن میں انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ شاید یہ پہلی اڑان سالہا سال کی پابندیوں سے نجات کے موقع پر اس قدر رفعتوں پر پہنچ گئی تھی اور پھر خود ہی خوف زدہ ہوگیا۔ جیسے ایک بچہ اپنی دھن میں کسی اونچے مینار پر چڑھ جائے اور پھر نیچے کی جانب دیکھے اور ڈر کے مارے رونے لگے۔ اس طرح وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگا۔ پہلے اس نے اپنے آپ کو لعنت ملامت کی۔ اس پر اُس کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی۔ لیکن وہ جوش پھر عارضی ثابت ہوا۔ وہ دن بدن کمزور ہوتا جارہا تھا۔ وہ اپنی نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ وہ سنبھلنے کی انتہائی کوشش کر رہا تھا لیکن اُسے احساس ہوا کہ وہ اب پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس احساس کے ساتھ ہی اُس کی روح پر بادل سے جمع ہونے لگے۔

اس نے عورت کی طرف دیکھا کہ شاید اُسے دھوکا ہوا ہو۔ شاید وہ درحقیقت وہ عورت نہ ہو جو اس کو سمجھے بیٹھا تھا۔ وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ سر سے پاؤں تک۔ اس کے جسم کا ہر عضو اس کی حرکات و سکنات...... لیکن وہ کوئی ایسی بات نہ ڈھونڈ سکا جس کی وجہ سے اُسے اپنا پہلا خیال بدلنا پڑے۔

عورت وہی تھی۔ اُس کی عظمت بھی وہی تھی۔ اس کا رتبہ بھی وہی تھا۔ لیکن وہ اس قابل نہ تھا۔ وہ عورت کے قابل نہ تھا۔ وہ صرف اِنہیں صورتوں کے قابل رہ گیا تھا جنہیں غلطی سے عورتیں کہا جاتا تھا...... اس خیال کے ساتھ اُس کے دل پر اور بھی گہری تاریکی چھا گئی۔ لیکن اُس نے اپنی شکست قبول کر لی تھی۔

جب وہ اپنی شکست قبول کر چکا تو عورت نے اس راستہ سے آنا چھوڑ دیا۔

اس کے دل میں عجیب قسم کی خلش پیدا ہوئی۔ اس کی خوراک کم ہوگئی۔ دنیا کی چیزوں سے دلچسپی نہ رہی۔ وہ کھویا کھویا سا سڑک پر جا کھڑا ہوتا اور اس طرف دیکھنے لگتا جدھر سے وہ عورت آتی تھی دور کیلے کے جھنڈ کے قریب کسی بنگلے کی باڑ کے قریب سے ہو کر وہ اس طرف آیا کرتی تھی۔ قدم بہ قدم چلتی ہوئی اس کے قریب پہنچ جاتی۔ اور پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دوسرے موڑ سے گھوم کر غائب ہو جاتی تھی۔

پہلے چند روز بہت بے قراری میں گزرے۔ وہ حسب معمول سڑک پر کھڑا ہو کر اس کی راہ دیکھا کرتا۔ پھر وہ سڑک کے پتھروں کو ٹھوکریں لگاتا ہوا اس طرف روانہ ہو جاتا جدھر سے وہ آیا کرتی تھی۔ وہ کیلوں کے جھنڈ تک پہنچ کر شش و پنج میں گرفتار ہو جاتا کہ اب وہ کدھر جائے مایوس ہو کر واپس لوٹ آیا۔ اور پھر اس موڑ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتا جہاں پہنچ کر وہ غائب ہو جاتی تھی۔

وہ کہاں سے آتی تھی، کدھر کو جاتی تھی— کبھی کبھی اُسے اس موڑ پر ایک شعلہ سا لپکتا ہوا دکھائی دیتا۔ جو چند لمحوں میں غائب ہو جاتا۔

اب اس نے سڑک پر جا کر اس کا انتظار کرنا چھوڑ دیا— وہ اپنے کمرے کے اندر پلنگ پر پیٹ کے بل لیٹے لیٹے گاؤ تکیہ اپنے سینے کے نیچے رکھ لیتا اور کھوئی کھوئی نظروں سے سڑک کی طرف دیکھا کرتا۔

بیوی پاس بیٹھی باتیں کرتیں۔ بچے شور مچاتے چیختے اور چلاتے، ریڈیو ستار اور بنسری کی تانیں اڑاتا...... اُن کے پچھواڑے ویران جگہ میں ایک بڑے درخت کے ساتھ لٹکی ہوئی چمگادڑیں تاریکی بڑھتے ہی آسمان میں پرواز کر جاتیں۔ جب سورج نکلتا تو وہ دبک کر اپنی کمین گاہ میں چھپ جاتیں۔

اس کے دل میں میٹھا میٹھا درد کچھ اس طرح بیٹھ گیا تھا جیسے پاؤں میں کانٹا چبھ

کر ٹوٹ جائے اور وہ جگہ پک جائے۔ پیپ نکلے لیکن کانٹا جیوں کا تیوں رہے.....؛ اور پھر کبھی کوئی دکھ نہ دے جسم کا حصہ بن کر رہ جائے..... کبھی کبھار جب کھٹکے تو بہت خفیف اور میٹھا سا درد محسوس ہو۔

یہ افسانہ، افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

ڈاکو

گاؤں ایک اونچی پہاڑی پر واقع تھا۔ اس کے بیچوں بیچ موجو کا گھر تھا۔ وہ گاؤں کا چودھری تھا۔

نئی دنیا کے شور و غل سے بہت دور، پہاڑوں سے گھرا ہوا یہ چھوٹا سا گاؤں ایک جنگلی پھول کی مانند تھا، یا مکروہات دنیا سے تنگ آیا ہوا کوئی سادھو کہ تنہا اور سنسان مقام پر پرماتما سے لو لگائے بیٹھا تھا — اگر انسان کہیں دور سے پہاڑوں کی طرف نظر دوڑا کر دیکھے تو سوائے اونچی نیچی چوٹیوں کے اور کچھ نظر نہ آئے — گاؤں کے سوموا سو کچے مکان مہذب دنیا کو اپنی جھلک دکھانے سے بھی کتراتے تھے۔

گاؤں کے لوگ بھی اپنی دھن میں مست تھے۔ اُن کو زندگی میں کسی کمی کا احساس نہ ہوتا تھا۔ کچھ باتوں پر اُن کا ایمان تھا، کچھ باتوں کو وہ جانتے ہی نہ تھے، اور کچھ چیزوں کی اُنہیں خواہش ہی نہ تھی۔

صحت کا معیار یہ ہے کہ انسان کو اپنے اعضا کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ ہر عضو مرغی کے پر کی طرح ہلکا ہو۔ دکھتی ہوئی ٹانگ یا بھاری سر یا کمزور معدہ فوراً اپنی موجودگی کا احساس کروا دیتا ہے۔ عام حالات میں ہر انسان پر ایک زمانہ ایسا بھی گزرتا ہے جب اسے ان باتوں کا بالکل احساس نہیں ہوتا — اسی طرح نوعِ انسانی پر وہ وقت

بھی آ چکا ہے جب اگر چہ انسان نام نہاد ترقی کی ابتدائی منزل تک نہ پہنچا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ اُسے زندگی کے اس قدر بوجھل اور بے کیف ہونے کا احساس تک نہ تھا۔

یہ گاؤں اسی زمانہ کی یادگار تھا۔ سیکڑوں برس پہلے جب انسان نے دفعتاً بلا منزل مقرر کیے اندھا دھند دوڑنا شروع کیا تو اس گاؤں کے بے وقوف لوگ اس دوڑ میں شامل نہ ہوئے۔ چناں چہ اس کا نتیجہ؟

گاؤں کے لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے۔ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر میڑھیوں کی طرح بنی ہوئی ہری بھری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ پہاڑوں کے دامن سرسبز گھاس سے اٹے پڑے تھے۔ اس لیے ان کے مویشیوں کے لیے خوراک کی کمی نہ تھی۔

انسان کہیں سے کہیں پہنچ جائے اُسے دو چیزوں کی ہمیشہ ضرورت ہوگی جن کے بغیر ان کے پرمیشور کی بھگتی بھی نہ ہو سکے گی۔ اناج اور افزائش نسل— گاؤں کے مردوں نے آئین سٹائین کا نام نہیں سنا تھا۔ لیکن اُنہیں کھانے کے لیے اناج مل جاتا تھا۔ اور پیٹ بھر لینے کے بعد ایسی عورتیں میسر ہوتی تھیں جن کے جسموں پر چڑھا ہوا صحت ور خوش رنگ مضبوط گوشت کیا بہ لحاظ بو اور کیا بہ لحاظ لمس ان لذیذ روٹیوں سے بھی لذیذ تر معلوم ہوتا تھا جنہیں کھا کر ہی ان کے دلوں میں عورت کے جسم کی سچی بھوک پیدا ہوتی تھی۔ یہ فلسفہ اور شاعرانہ قلابازیاں اُس انسان کو بالکل بے معنی معلوم ہونے لگتی ہیں۔ جسے ہر قید و بند سے آزادی کے ساتھ پیٹ بھر روٹی میسر آنے کے بعد وسیع آسمان تلے پھیلی ہوئی زمین کے کسی کھیت میں کوئی عورت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مل جاتی ہے۔

اب تک انسان نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ البتہ اپنے ہاتھوں اپنا یہ حق کھودیا ہے۔ اب اُسے ڈھونڈ نکالنے پر مصر ہے...... کیا وہ اسے پالے گا؟

حاکاں— موجو چودھری کی بیٹی تھی۔ گاؤں کے کئی نوجوانوں کو اس سے محبت تھی۔ وہ ان میں سے کسی کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھی۔ لیکن محبت ایک ہی سے کرتی تھی اور وہ تھا نواب۔

نواب اُجڈ سہی، ذرا لچا سہی، کچھ چالاک سہی— لیکن وہ ان انسانوں میں سے

تھا جو محبت کے سامنے قطعاً بے دست و پا ہو جاتے ہیں اور اُسے حاکاں سے محبت تھی۔

حاکاں اپنے عاشق کے ساتھ اِدھر اُدھر آیا کرتی تھی— ان دونوں کی شادی میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ جو کچھ وہ دونوں چاہتے تھے وہ کچھ عرصہ بعد ہونے ہی والا تھا۔ اس لیے اگر ایک طرف وہ دونوں چھپ کر ملنے کی ضرورت نہ سمجھتے تھے تو دوسری طرف ان کے آزادانہ گھومنے پر بھی کسی کو کوئی پابندی عائد کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔

اپنے عاشق کے ساتھ کبھی وہ گاؤں سے پرے نکل جاتی' اور پھر وہ کسی ٹیلے پر بیٹھ کر نیچے پہاڑ کی وادیوں پر نظر دوڑانے لگتی۔ جہاں پہاڑوں سے نکل کر بل کھاتی ہوئی ندیاں اُفق کے دھندلکے میں معدوم ہوتی دکھائی دیتی تھیں۔ ان کے نیچے کئی چھوٹی موٹی پہاڑیاں حد نگاہ تک پھیلی ہوئی نظر آتی تھیں اور پھر ان پہاڑیوں کے درمیان بڑی بڑی کم و بیش ہموار وادیاں بھی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کی طرح دکھائی دیتے تھے— حاکاں کو بتایا گیا تھا کہ آگے پھیلی ہوئی زمین پر بڑے بڑے شہر ہیں...... اور پھر اُن شہروں کے عجائبات کی مبہم تصویریں اُس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ شاید وہ زندگی بھر اِن شہروں کی سیر نہ کر سکے لیکن اس کے لیے تو پہاڑ کے عین نیچے کچھ عمارتیں معمہ سے کم نہ تھیں۔ ہرے بھرے درختوں کے بیچ میں یوں ہی بکھرے ہوئے پتھروں کی طرح...... کیا واقعی وہ مکانات تھے؟ وہاں لوگ بھی رہتے تھے؟ کیسے لوگ؟ وہ کیسے بولتے ہیں؟ کیا کھاتے ہیں؟ کیا سوچتے ہیں؟

"گریج! وہ لوگ گریج ہیں۔"

اپنے عاشق کے منہ سے گریج (انگریز) کا لفظ سن کر وہ حیرت سے اُس کا منہ تکنے لگتی۔ گریج بالکل آدمیوں کی طرح نہیں ہوتے کیا؟

اس پر نواب ہنس پڑتا...... "اور وہاں بڑے بڑے بابو رہتے ہیں۔ وہ بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں۔

''بڑے؟ ہائے اللہ! کتنے بڑے؟.....تم سے بھی بڑے؟''

'' ہاہا'' وہ اس کی باتوں کا مکمل جواب کبھی نہیں دیتا تھا۔ شاید وہ چاہتا تھا کہ حاکان کا علم ادھورا ہی رہے تا کہ وہ تعجب کے مارے طفلانہ اداؤں کے ساتھ اُس سے ہمیشہ اس قسم کے سوالات دریافت کرتی رہا کرے.....''پگلی تجھے معلوم نہیں ہمارے نالے کا پانی گھوم پھر کر اُسی جگہ تو پہنچ جاتا ہے۔ اگر تم لکڑی کا ٹکڑا پانی میں ڈال دو تو وہ بہتا ہوا اُسی جگہ پہنچ جائے گا۔''

''سچ مچ''

یہ پانی کا نالہ دور پہاڑوں سے آتا تھا۔فصلوں کے دنوں میں گاؤں والے وہ پانی اپنے کھیتوں کی سنچائی کے کام میں لاتے اور جب اس کی ضرورت نہ ہوتی تھی تو وہ لکڑی کا تختہ ہٹا کر پانی چھوڑ دیتے اور پانی شوریدہ سری کے ساتھ بہتا ہوا جب اس جگہ پہنچتا تو وہ بڑے لوگ اس سے اپنے باغوں کی کیاریوں کو سینچتے تھے۔

حاکان نے اپنے گاؤں کے لوگ دیکھتے تھے یا اسی قسم کے اشخاص لیکن نیچے کی بستی میں رہنے والے کس قسم کے انسان تھے اُسے اس بات کا کچھ بھی اندازہ نہ تھا۔ یہ اُس کی تمنا تھی کہ وہ اس کی بابت معلومات حاصل کر سکے۔ ان کی صورت دیکھ سکے۔ ان سے باتیں کر سکے۔ اس کے لیے ان کے رہنے کی وادی ایک ایسا مقام تھا جہاں شاید وہ شاہ زادے اور پریاں رہتی تھیں جن کے قصے اس نے بچپن میں اپنی دادی کی زبانی سنے تھے۔ اس کی دادی کہانی اس طرح شروع کرتی تھی ''فلاں پہاڑ کے پیچھے کئی کوس پرے.....'' یا ''فلاں ٹیلے کے اوپر کئی برس پہلے.....'' یا '' فلاں وادی میں .....'' کہیں وہ وادی یہی تو نہیں تھی؟

''اچھا مجھے یہ بتاؤ کہ وہ لوگ کرتے کیا ہیں؟''

''ہاہا! کرتے کیا ہیں؟''

حاکان کو اس کا ''ہاہا'' کر کے ہنسنا بالکل پسند نہیں تھا۔ اس ہنسی کا مطلب یہ تھا

کہ وہ بے وقوف تھی۔ اُسے کسی بات کا کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ آخر وہ عورت ذات تھی۔ اُس کی طرح دور دور کی خاک تو اس نے چھانی ہی نہ تھی پھر اُسے ہنسنے کا کیا حق تھا۔

''ہاہا تو بتادیں۔''

اب اُس کے دل میں کچھ جاننے کی ایسی شدید خواہش نہ رہتی۔ اس لیے وہ منہ سے کچھ نہ بولتی۔

''وہ لوگ کان سے نمک نکالتے ہیں۔''

اس بات پر حاکان کو ہنسی آجاتی۔ آخر وہ اس قدر بے وقوف بھی تو نہ تھی

''کان میں نمک؟'' یہ کہہ کر وہ اس کا کان پکڑ کر کھینچتی۔ ''لاؤ تو ذرا تمہارے کان میں کتنا نمک ہے؟''

''اری پگلی! تو کان کا مطلب آدمی کا کان ہی سمجھتی ہے۔ کان گدھے کا بھی ہوسکتا ہے، ہاتھی، بلی، شیر، بیل سبھی کا ہوسکتا ہے۔ اسی طرح پہاڑوں کے کان بھی ہوتے ہیں۔ ان میں سے نمک نکلتا ہے۔''

''واہ جی واہ...... جیسے میں نے تو آج تک کوئی پہاڑ دیکھا ہی نہیں—''

یہ بات حاکان کبھی نہ سمجھ سکی۔ وہ یہی سمجھتی رہی کہ وہ اس کا مذاق اڑانا چاہتا ہے...... وادی کے وہ لوگ اس کے لیے معمہ ہی بنے رہے۔

''تمہیں خدا کی قسم سچ سچ بتاؤ وہ کون لوگ ہیں مجھے ان کی بابت سب کچھ بتاؤ...... جب میں چھوٹی سی تھی تو اسی چٹان پر آکر بیٹھ جاتی تھی۔ بارش میں دھلے ہوئے درختوں اور چٹانوں کے درمیان یہ اُجلی اجلی کوٹھیاں کیسی بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ کاش میرے کندھوں پر پر لگے ہوتے تو میں چیل کی طرح منڈلاتی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان مکانوں کو نزدیک سے دیکھوں۔ وہاں کے رہنے والوں سے اچھی اچھی باتیں کروں...... ایک دھندلا سا خیال ہے کہ اس جگہ میں نے تین مرد اور دو عورتیں دیکھی تھیں۔ اوہو وہ لوگ کیسے گورے تھے۔ ان کی آنکھیں کتنی اچھی

تھیں۔ انہوں نے مجھے کھانے کی چیزیں بھی دی تھیں..... کتنے اچھے تھے وہ لوگ ہائے وہ پھر کبھی نہیں آئے۔ کیوں؟ کیا وہ لوگ ادھر آنا پسند نہیں کرتے؟''

''ہو ہو..... یہاں دھرا ہی کیا ہے؟ یعنی اتنی چڑھائی چڑھ کر بے چارے اس جگہ پہنچیں تو اُنہیں حاصل ہی کیا ہوگا؟ کیا تمہاری صورت دیکھنے آئیں گے؟''

اس بات پر حاکان جل جاتی اور غصہ میں اس کا حسین چہرہ اور بھی دل کش نظر آنے لگتا۔ لیکن اگر نواب اُسے خفا کرنا چاہتا تھا تو اسے پرچانے کے گُر سے بھی واقف تھا۔

''پھر تم کیوں تنگ کرتے ہو مجھے۔ اچھا کہو تو میں وہاں نہیں جاسکتی۔ کیا رستہ ایسا کٹھن ہے کہ میری یہ خواہش پوری ہونے سے رہ جائے گی۔ تم تو اول درجے کے..... ہاں بس اب خفا نہ ہونا۔ اور نہیں تو کیا کہوں۔ تم کیا جانو میرے دل کا حال...... نہیں اب تمہاری چھا۔'' سے نہیں لگوں گی۔ تم مجھے بے وقوف بناتے ہو..... ہٹو..... اوئی!

اس طرح وہ گھنٹوں نیم باز آنکھوں سے اس خواب ناک وادی کی طرف دیکھا کرتی۔ اس کے نوجوان دل میں دور کی چیزوں کو قریب سے دیکھنے کی خواہش اور انجانی چیزوں کو جاننے کی تمنا ایک قدرتی بات تھی۔

حاکاؔن کا باپ موجوؔ چودھری ایک با رعب شخص تھا۔ گاؤں میں وہی سب سے بڑا مانا جاتا تھا۔ پہاڑوں کے گاؤں بھی دور دور ہوتے ہیں۔ لوگ ایک دوسرے سے ناواقف ہی رہتے ہیں۔ لیکن موجوؔ کو اردگرد کی بستیوں کے لوگ خوب اچھی طرح جانتے تھے۔ کئی موقعوں پر وہ اس کی رائے کے طلب گار بھی ہوتے تھے۔ وہ اَن پڑھ تھا۔ اُجڈ تھا لیکن یہ خدا کی دین ہے۔ وہ سمجھ دار اور دور اندیش بھی تھا۔ اُسے نئی سے نئی ترکیبیں سوجھا کرتی تھیں۔ ہر تکلیف اور مصیبت میں وہی گاؤں والوں کا ہمدرد اور محافظ تھا۔ وہ لوگ جنگلی ہرنیوں کے گلہ کی طرح تھے اور اُن کا چودھری اس بارہ سنگھے کی مانند تھا جو کسی آنے والی مصیبت کو اپنی عقل حیوانی سے محسوس کر کے ہرنیوں کو پہلے ہی سے خبردار

کر دیتا ہے۔

میلوں ٹھیلوں پر اگر جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے تو موجو چودھری کے منہ سے نکلا ہوا فیصلہ اٹل سمجھا جاتا تھا۔ یہ اُس کی شخصیت اور آنکھوں کی خاص چمک ہی کا اثر تھا کہ بعض اوقات قتل ہوتے ہوتے رہ جاتے تھے۔ گھر برباد ہونے سے بچ جاتے تھے۔ یہ بھی پروردگار کا کرم ہی تو تھا کہ سبھی لوگ اس کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جو کچھ کہتا یا کرتا ہے اس سے اُنہیں کی بھلائی مقصود ہوتی ہے۔

گاؤں والوں کو کچھ آمدنی تو اپنی فصلوں کی وجہ سے ہوجاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بھیڑیں اور بکریاں بھی پالتے تھے۔ بھیڑوں کے اُون سے وہ خاصہ روپیہ پیدا کر لیتے تھے۔ اور بکریوں کے اُون سے رسیاں اور بورے تیار کیے جاتے ہیں ان سے بھی معقول آمدنی ہوجاتی تھی۔ ان ذرائع سے جو بھی آمدنی ہوتی وہ ان کی گزر کے لیے بہت کافی ہوتی تھی۔ بلکہ وہ خوش حال تھے۔ کھانے پینے اور دودھ دہی کی کچھ کمی نہ تھی، گھی، دودھ، مکھن فروخت کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اگر کسی گھر میں گائے یا بھینس نہ بھی ہوتی تو دوسرے لوگ اُسے ان چیزوں کی کوئی کمی محسوس نہ ہونے دیتے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود چودھری موجو کو کوئی نہ کوئی نئی بات سوچنے کی عادت سی تھی۔

جنگ شروع ہوچکی تھی۔ چودھری کو گاؤں سے باہر شہروں کی دنیا سے بھی کچھ نہ کچھ واقفیت تھی۔ اُس نے سنا کہ لوگ اس زمانے میں خوب روپیہ پیدا کر رہے ہیں۔ معمولی معمولی چیزیں جنہیں جنگ سے پہلے کوئی پوچھتا تک نہ تھا اب نایاب ہوچکی ہیں وہ بھی اپنے بھائی بندوں کو امیر دیکھنے کے خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ کئی دنوں تک وہ اسی اُدھیڑ بن میں رہا۔ حاکان نے باپ سے اس سوچ بچار کا مقصد پوچھا تو اُس نے بتایا۔

''اوہ میری بٹیا! جانتی ہے پھر کیا ہوگا؟— تیرے لیے بہت اچھے اچھے کپڑے خرید کر لاؤں گا۔ سونے کے گہنے بنواؤں گا ایک بہت اچھا گھوڑا خریدا جائے گا...... بس پھر جو

کچھ ہوگا تو دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔''

حاکان کو اپنا باپ جادوگر معلوم ہونے لگا۔ اللہ نے اس کے سر میں نہ معلوم اتنی عقل کہاں سے بھر دی تھی کہ اُسے کوئی نہ کوئی نئی بات ہی سوجھتی ہے۔

وہ راتوں کی خاموشی میں گھر سے باہر نکل کر کسی ڈھلوان پر جا کھڑی ہوتی۔ عظیم الشان پہاڑ چپ چاپ کھڑے کسی سوچ میں ڈوبے نظر آتے تھے۔ وہ ان کی طرف دیکھتی جیسے وہ کوئی راز کہہ ڈالیں گے لیکن وہ جامد و ساکن ہی رہتے...... وہ قدم بہ قدم چلتی ہوئی اپنی پرانی چٹان پر پہنچ جاتی۔ وہاں وہ گہری سانس لیتی۔ دماغ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگتا...... وہ خواب آور نظروں سے حسب عادت وادی کی طرف دیکھنے لگتی۔ وہ عمارت جو دن میں بکھرے ہوئے پتھروں کی طرح دکھائی دیتی تھیں رات کے دھندلکے میں بالکل نظر ہی نہ آتی تھیں...... جب وہ تھک جاتی تو اس کی نگاہیں لوٹ کر اپنے گاؤں کے دھندلے مکانوں پر منڈلانے لگتیں۔ اس وقت گاؤں سے کسی ڈھولک کے بجنے کی اڑتی ہوئی صدائیں آتیں اور اُس پر ایک نئی اور نا قابلِ فہم کیفیت طاری ہونے لگتی۔

اُس کا جی چاہتا تھا کہ کچھ ہوجائے۔ بلکہ اُسے یقین تھا کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے...... انسان جوانی کی عمر میں اپنے اپنے محدود دائرے کے اندر کچھ اس قسم کی باتیں سوچا کرتا ہے۔ یوں ہی منتظر رہا کرتا ہے۔

وہ جوشیلے باپ کی جوشیلی بیٹی تھی کوئی یوں ہی سی امنگ اُس کے دل میں ہر آن کروٹیں لیا کرتی تھی۔ لیکن اس قسم کے سوچ بچار کا نتیجہ سوائے بے چینی کے اور کچھ نہ نکلتا تھا۔

ایک روز چودھری نے گاؤں والوں کو رات کے وقت گاؤں سے باہر ایک ٹیلے پر جمع ہونے کے لیے کہا۔ جب سب لوگ اکٹھے ہوگئے تو اس نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے سب پر ایک سحر انگیز نگاہ ڈالی...... حاکان بکری کا بچہ گود میں اٹھائے عورتوں کے جھرمٹ

سے ذرا ہٹ کر چاند کی روشنی میں بیٹھی تھی۔ اس کی ماں کو اس کی یہ ڈیڑھ چاول کی علاحدہ کھچڑی پکانے کی عادت بہت بری معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت بے چاری حاکاں بھی مجبور تھی۔ نواب نے کہہ رکھا تھا کہ ''عورتوں کے جھرمٹ سے علاحدہ ہٹ کر ذرا چاندنی میں بیٹھنا تاکہ میری نظر کے سامنے رہو۔ تمہارے بغیر میرا جی نہیں لگے گا۔ اس کے دل کی خواہش کو وہ رد نہ کرسکتی تھی۔ اس کی ماں نے ایک آدھ دفعہ آنکھوں ہی آنکھوں میں سرزنش بھی کی۔ ایک مرتبہ اس کے چھوٹے بھائی کو بھی اُسے بلانے کے لیے بھیجا...... اور پھر وہ چپ ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ جانتی تھی باپ نے اپنی بیٹی کو سر چڑھا رکھا ہے۔ اس لیے لاڈلی بیٹی کو کسی کام کے لیے مجبور کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔

حاکاں اپنے غور وفکر میں ڈوبے ہوئے باپ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ کبھی وہ کسی جانے سے نواب پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال لیتی تھی...... حاضرین پر خاموشی طاری تھی وہ ہمہ تن گوش تھے۔

بالآخر چودھری نے بڑے اہتمام سے کھانس کر گلا صاف کیا۔ اور اپنا چوڑا چکلا سینہ ذرا تان کر بولا۔ '' میں بہت دنوں سے یہ بات سوچ رہا تھا۔ آج مجھے ایک ترکیب سوجھی ہے...... لیکن ترکیب بتانے سے پہلے میں تم سب لوگوں کو یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آج کل لام لگ گئی ہے۔ ہر چیز کے دام چڑھ گئے ہیں اور ابھی چڑھیں گے۔ سب لوگ دونوں ہاتھوں سے روپیہ کما رہے ہیں...... اب کے جب میں سہر گیا......'' یہ کہہ کر اس نے سب کی طرف رعب دار نظروں سے دیکھا کیوں کہ شہر جانے کی سعادت بس اسی کو نصیب تھی۔ سب جانتے تھے کہ جب وہ یہ کہے کہ ''جب میں سہر گیا تو اس فقرے کے بعد وہ کوئی بہت ہی اچنبھے کی بات سنا دیا کرتا تھا......'' سہر گیا تو میں نے بڑی اچنبھے کی باتیں سنیں...... کیوں بے جمرے! تجھے نیند آرہی ہے۔ کتنا بڑا منہ پھاڑ رہا ہے...... یوں تو ہمیں کوئی تکلیپ نہیں لیکن جندگی میں تکلیپ بھی آن ہی پڑتی ہے۔ اس کے لیے کچھ نہ کچھ بندوبست جرور ہونا چاہئے......''

سب لوگ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ تائید کرنے کی بھی در اصل کوئی ضرورت نہ تھی۔ سب کو یقین تھا کہ چودھری نے کوئی نہ کوئی گہری بات ہی سوچی ہوگی اور اس پر عمل کرنے سے کچھ نہ کچھ فائدہ ہی ہوگا نقصان نہ ہوگا۔ چودھری نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔" ...... بس میں کچھ ایسی ہی سوچ بچار میں تھا...... مجھے جو ترکیب سوجھی ہے وہ بتائے دیتا ہوں کان دھر کر سنو۔ میرا کھیال ہے کہ جن دنوں ہم کھیتی باڑی کا کام چھوڑ بیٹھتے ہیں اور جب ہم بکریوں کے بالوں کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑ جاتے ہیں تو ہمارا وکت پھجول میں کھراب ہوتا ہے۔ اگر اُنہیں دنوں میں ہم کوئی نئی پھسل بو دیا کریں تو کیا حرج ہے۔ تم پوچھو گے کون سی پھسل؟ میں کہوں گا السی— لام کے دنوں میں اس کی اتنی کھپت ہوگی کہ بس۔ دیکھتے دیکھتے سونے سے ہانڈیاں بھر لوگے...... بولو کیا کہتے ہو؟"

کوئی کیا کہتا۔ سب کو یہ بات سولہ آنے درست معلوم ہوتی تھی۔ وہ لوگ چودھری کے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرنے کے لیے تیار تھے۔ وہ کمسن بچوں کی طرح چودھری کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی مداری ہو اور اس نے واقعی مداریوں کی طرح آنکھیں گھما کر کہا۔" اور بھئی یہ بھی بتادوں کہ میں نے کل ہی ایک آڑھتی سے مل کر السی پہنچانے کا اکرار بھی کر لیا ہے۔ بس تم دیکھو کیا سے کیا ہوجاتا ہے......" پھر یکایک وہ بڑے انکسار کے ساتھ کہنے لگا...... بھئی مالک ہی کے ہاتھ میں ہے سب کچھ...... کام کرنا ہمارا دھرم ہے...... کیوں بھئی پھگّے؟"

اس کے بعد لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ انہوں نے اپنی بیویوں کو بھی یہ سب باتیں خوب اچھی طرح سمجھا دیں۔ دوسرے دن سے عورتیں بھی پھولی پھولی پھرنے لگیں۔ ایک دوسری کو مبارک باد دے رہی تھیں۔ گھر گھر چودھری کا چرچا چھڑ گیا۔ چودھری حقہ ہاتھ میں اٹھائے بنئے کی دوکان کے کچے چبوترے پر بیٹھا بڑے بوڑھوں سے کہہ رہا تھا "مالک نے چاہا تو گاؤں کا سارا نکسہ پلٹ دوں گا......" اور پھر دفعتاً پینترا بدل کر بڑے انکسار سے کہتا۔"...... بھئی اُسی مالک پر بھروسہ رکھو وہ جو چاہتا ہے وہی

ہوتا ہے.....''

پھر سب لوگ بڑی تفصیل کے ساتھ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے لگے۔ اب وہ زمانہ بھی قریب تھا جب وہ لوگ فصلوں کا کام ختم کر کے بکری کے اون کے بورے بنانا شروع کر دیتے تھے۔ لیکن اب وہ السی بونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ کھیتوں کو صاف کرنے کے بعد نئی فصل کے لیے اس میں ہل چلائے گئے۔ نالے کا وہ پانی جو ان دنوں وہ چھوڑ دیا کرتے تھے انہوں نے روکے رکھا تاکہ ان کے کام میں آئے۔

ان دنوں حاکان بھی خوش خوش گھوما کرتی تھی۔ وہ سونے کی چوڑیوں اور اپنے بھائیوں کے لیے گھوڑوں کے خواب دیکھتی تھی۔ دھوتی کا آنچل اٹھائے کھیتوں میں پھلانگتی پھرتی تھی۔ اس کا محبوب بھی اپنے کھیتوں میں خون پسینہ ایک کر رہا تھا۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کے آرام و آسایش کے لیے ایک نیا مکان بنوانا چاہتا تھا۔ ایک اچھی سی گائے خریدنا چاہتا تھا۔ وہ بڑی بڑی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُس کا دل نئی امنگوں اور ترنگوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا...... اس کے تھکے ماندے جسم پر ہونے والی بیوی کا تصور کسی جادو اثر دوا سے کم اثر نہ کرتا تھا......

ایک روز جبکہ خوش گوار دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ مرد ڈھلوانوں پر اپنے اپنے کھیتوں میں کھڑے ہوئے کام میں مصروف تھے۔ کسی طرف سے پسینے میں تر ایک خاکی پگڑی والا چھوٹے سے قد کا شخص ادھر آ نکلا۔ اُس نے آتے ہی لوگوں سے اِدھر اُدھر کے سوالات کرنے شروع کیے اتنے میں چودھری سینہ تانے ادھر آ نکلا۔ اس نے بارعب آواز میں للکار کر پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

نو وارد نے اپنی خاکی پگڑی درست کرتے ہوئے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

اس پر چودھری کو بہت طیش آیا۔ ''ابے مجھے کیا پوچھتا ہے اپنی کہو۔ تیرا مطلب کیا ہے' یوں دندناتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ کیا یہ کھیت تیرے باپ کے ہیں؟''

نو وارد کچھ مرعوب ہو کر بولا۔''میں بڑے صاحب کا چپڑاسی ہوں... نمک کی کان والے بڑے صاحب کا۔''

چودھری نے پگڑی جھاڑ کر سر پر لپیٹتے ہوئے کہا ''اچھا تو اب تجھے بتائے دیتے ہیں۔ میں چودھری ہوں گاؤں کا۔''

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد چپڑاسی نے اپنا مدعا بیان کیا '' چودھری جی اب کے آپ نے نالے کا پانی نہیں چھوڑا۔ صاحب لوگ حیران ہیں کہ آخر کیا بات ہوگئی؟''

چودھری نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے جواب دیا۔ اردلی بھائی! اب کے ہم السی بو رہے ہیں۔ ہمیں خود پانی کی ضرورت ہے اس لیے اب کے ہم پانی نہیں چھوڑیں گے......''

یہ سن کر اردلی چلا گیا اور کھیتوں میں حسب سابق کام ہونے لگا۔

تین چار روز امن و امان سے گزر گئے۔ لوگ اردلی کی بابت سب کچھ بھول گئے...... لیکن ایک روز پھر وہی اردلی دو نئے آدمیوں کو ساتھ لے کر وہاں آن دھمکا۔ اُنہوں نے ہاتھوں میں لمبی لمبی لاٹھیاں تھام رکھی تھیں۔ جب کھیت میں کام کرنے والے مزدوروں کو ان کی صورتیں نظر آئیں تو وہ بے چارے عجب کش مکش میں پڑ گئے۔ وہ نہ جانتے تھے کہ ایسے موقع پر انہیں کیا کرنا چاہئے۔ ان کا چودھری کسی کام سے دوسرے گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ اُس دن چپراسیوں کے تیور بھی بگڑے ہوئے نظر آتے تھے۔ آج وہ نالے کا تختہ ہٹا دینے کے لیے آئے تھے۔ گاؤں کے لوگوں نے اُنہیں سمجھا کر اس کام سے باز رکھا۔ اور اِدھر چودھری کو بلانے کے لیے دو آدمی دوڑا دیئے۔ جب اُن آدمیوں کو گئے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو چپراسی پھر بھڑنے لگے۔ اس پر دو تین نوجوانوں کو غصہ بھی آیا۔ لیکن بڑے بوڑھوں نے بیچ بچاؤ کر دیا۔ بارے چودھری کی گیم شحیم صورت دکھائی دی۔ اُسے دیکھ کر سب کی جان میں جان آئی۔ اگر وہ چاہتے تو ان چپراسیوں کو اچھا سبق پڑھا سکتے تھے۔ لیکن چودھری کے مشورے کے بغیر وہ کچھ نہ کرنا چاہتے تھے۔

کچھ نوجوان دوڑ کر چودھری کو رستے ہی میں جا ملے اور اُنھوں نے اُسے اردلیوں کے بڑھے ہوئے حوصلوں سے بھی خبردار کردیا۔

چودھری نے آتے ہی خشمگیں نظروں سے اُن کی طرف دیکھا ''ابے اپنی اوکات دیکھ کر بات کیا کرو۔ تم بند ہٹانے کے لیے آئے ہونا! لو، میں لٹھ لے کر اکیلا کھڑا ہوجاتا ہوں۔ تم لوگ ذرا یہ کام کر کے تو دکھاؤ...... مجھے بھی معلوم ہو کہ تم کتنے پانی میں ہو اور تم نے اپنی ماں کا کتنا دودھ پیا ہے؟......''

اردلیوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ چودھری کی گرج دار آواز پھر گونجی۔ ''یہ نالہ ہمارا ہے۔ کسی اور کا اجارہ نہیں۔ جب ہمیں پانی کی جرورت نہیں تھی۔ پانی چھوڑ دیتے تھے۔ اب ہمیں کھد جرورت ہے۔ پانی نہیں چھوڑیں گے۔ جاؤ کہہ دو اپنے بڑے صاحب کو۔ اس سے جو بن پڑے کر لے۔ لیکن یہاں سے ایک بوند پانی کی نیچے نہیں جانے پائے گی...... اگر تم نے پھر ادھر کا رخ کیا اور اپنی جان سلامت لے کر واپس بھی چلے گئے تو مجھے چودھری نہیں چمار کہنا......

وہ اردلی بکریوں کی طرح سر جھکائے آگے پیچھے پہاڑ سے نیچے اُتر گئے اور گاؤں کے لوگ ان کے پیچھے قہقہوں کے پتھر پھینکتے رہے۔ دوسرے ہی دن ایک نیا اردلی آن دھمکا کہنے لگا بڑے صاحب نے چودھری کو بلایا ہے۔''

صبح کا وقت تھا۔ چودھری بھینس کا دودھ دوہ رہا تھا۔ تو لوگوں نے اردلی کی آمد کی اطلاع دی اور مشورہ دیا کہ بڑے صاحب کے پاس نہ جائے۔ ایسا نہ ہو وہ اس سے برا سلوک کرے۔ لیکن چودھری موجوکب ماننے والا تھا۔ وہ فوراً چپراسی کے ساتھ چل دیا۔ اس نے اپنے ہمراہ بھی کسی کو نہیں آنے دیا— ڈھلوان کے نیچے پہنچ کر اس نے گاؤں والوں سے پکار کر کہا ''آج میں پورا پھیصلہ کر کے آؤں گا تم لوگ پھکر نہ کرنا۔

لیکن گاؤں کے لوگ سارا دن فکر مند رہے اور جب شام ہونے لگی تو وہ گاؤں سے آگے بڑھ کر نیچے کی طرف دیکھنے لگے۔ اب یہ مشورہ ہونے لگا کہ دوچار آدمی

چودھری کا پتہ لگانے کے لیے نیچے جائیں۔ ابھی مشورے ہو ہی رہے تھے کہ دور سے چودھری کی شکل دکھائی دی۔ بڑے ٹھاٹھ سے جھومتا جھامتا چلا آرہا تھا۔ جب وہ قریب پہنچا تو لوگوں نے دیکھا کہ اُس کی مونچھیں تنی ہوئی ہیں۔ رنگ سرخ ہو رہا ہے اور باچھیں کھلی جاتی ہیں۔

اس نے آتے ہی بغیر کسی سے کچھ کہے سنے نالے کا تختہ ہٹا دیا اور رکا ہوا پانی سر پٹختا، شور مچاتا، جھاگ اڑاتا بہہ نکلا۔

سب لوگ حیران تھے۔ چودھری نے سب کی طرف مسکرا کر دیکھا ''بھئی میں بہت تھک گیا ہوں ذرا روٹی کھا کر حقے کے دم لگا لوں پھر تم کو سب حال سناؤں گا۔

جب رات کے وقت سب لوگ کھانے پینے سے فارغ ہو کر گاؤں کے باہر ٹیلے کے پاس اکٹھے ہوئے تو چودھری نے حقے کی نے دانتوں میں دبائے دبائے اُن کی طرف سحر انگیز نظروں سے دیکھا...... میں دوپہر کے وقت صاحب کے پاس پہنچا......''

حاکان ہمہ تن گوش تھی اُسے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب بکری کا بچہ اس کی گود میں سے اُچھل کر پرے بھاگ گیا۔

''......اس وقت نوکر نے بتایا کہ صاحب آرام کر رہے ہیں...... اتنے میں دوسرا نوکر آیا اور کہنے لگا کہ بڑے صاحب نے کہا ہے کہ جوں ہی چودھری صاحب آئیں انہیں بڑی تکریم کے ساتھ اندر لے آؤ......''

یہ کہہ کر چودھری نے مداری کی طرح گاؤں والوں کی طرف دیکھا۔ ''پہلے ایک بہت بڑے کمرے میں سے گزرنا پڑا۔ گالیچے بچھے ہوئے تھے۔ میں جوتا اتارنے لگا تو نوکر نے کہا چلے آیئے— میں چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں بڑے صاحب کرسی پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر بہت کھوش ہوئے اور مجھے کرسی پر بٹھایا پھر اُنہوں نے نوکر سے کہا 'چودھری جی کے لیے چائے لانا مانگتا' جب میں چائے پی رہا تھا تو میم صاحب بھی آگئیں۔ کھوب پوڈر لگائے ہوئے تھیں۔ اُنہوں نے مجھ سے ہاتھ ملایا......''

حیرت سے سب لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ چودھری اطمینان سے
حقے کے کش لینے لگا۔

اس نے آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے کہا۔ میم صاحب کہنے لگیں۔ ول
چودھری! آپ سے مل کر دل بہوت کھوش ہونا مانگتا...... ہمارا بابو لوگ......"

اس طرح چودھری نے اپنے قصے کو خوب طول دے کر سنایا۔ لوگ کمسن بچوں کی
طرح اُس کی باتیں سنتے رہے......"

دوسرے دن یہ بات ادھر اُدھر کی بستیوں میں بھی مشہور ہوگئی۔

جب آسمان ابر آلود ہوتا تھا۔ حاکان سرد ہوا کے جھونکے کھاتی ٹیلے پر جا کھڑی
ہوتی اور وادی میں پتھروں کی طرح بکھری ہوئی اُجلی اُجلی عمارتوں کی طرف دیکھتی......
اور سوچتی نہ معلوم وہاں کون لوگ رہتے ہیں۔ وہ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کیا کھاتے ہیں؟
کیا پیتے ہیں......؟

وہ گھنٹوں نیم باز آنکھوں سے خواب ناک وادی کی طرف دیکھتی رہتی ہے۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ ''ہندوستاں ہمارا'' میں شامل ہے۔

موت

شہر کی آبادی بہت بڑھ گئی تھی۔ پرانے زمانے کا اصلی شہر تو چھوٹا سا تھا۔ لیکن نئے بازار اور جدید طرز کی عمارتوں کی وجہ سے نہ صرف شہر پھیل گیا تھا بلکہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ خوب صورت اور بارونق بھی نظر آنے لگا تھا۔ شہر کے نواحات میں لوگ مکانات بنواتے چلے جارہے تھے۔ بلکہ وہ نہر جو پہلے شہر سے تین میل پرے تھی۔ اب باہر بنے ہوئے بعض مکانات سے صرف چند فرلانگ پرے رہ گئی تھی۔ یہاں تک کہ شام کے وقت خواتین نہر کی سیر کرنے کے لیے چلی جایا کرتی تھیں۔ نہر کے دونوں طرف پہلے ہی کی طرح لمبے لمبے سرکنڈے اُگے ہوئے تھے جہاں پہلے سانپ اور بھیڑیے چھپے رہتے تھے۔ لیکن اب لوگوں کی آمدورفت کی وجہ سے کوئی جانور قریب نہ پھٹکتا تھا۔

خاص شہر سے اس قدر پرے تک پھیلی ہوئی یہ آبادیاں شہر کی گہما گہمی اور چہل پہل سے خالی تھیں۔ زمین کے پلاٹوں کی حد بندیاں قائم کی جا چکی تھیں اور بعض مکان کئی کئی خالی پلاٹوں سے بھی پرے ویرانے میں اکیلے دُکیلے کھڑے تھے۔ دراصل جس پلاٹ کا سودا ہوگیا یا جو پلاٹ کسی خریدار کو پسند آگیا اس نے وہاں مکان بنوا لیا۔

اس آبادی کا حسن کچھ علاحدہ ہی تھا۔ جدید وضعوں کے بنے ہوئے نئے نئے مکانات۔ کھلی فضا۔ دھوئیں اور گرد کا نام تک نہ تھا۔ ایک بہت پر امن خاموشی طاری

رہتی تھی۔ بعض مکان بن چکے تھے۔ بعض ادھورے ہی کھڑے تھے۔ بعض کی بنیادیں ہی رکھی جارہی تھیں۔ مکانات کے ارد گرد دور تک پکی اینٹوں کے چٹے موجود تھے۔ یا کچھ اینٹیں چونا وغیرہ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ راستوں پر بیل گاڑیوں کے پہیوں کے گہرے نشانات پڑ گئے تھے۔ اردگرد وہ پھیلے ہوئے گڑھے بھی موجود تھے جہاں سے کمہار مٹی کھود کھود کر لے جایا کرتے تھے۔ شہر کی طرف دیکھیں تو دھندلے دکھائی دینے والے کارخانوں کی چمنیوں میں دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لکیریں دکھائی دیتی تھیں۔

نہر کی جانب ایک شخص تنہا کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے کچی سڑک گزرتی تھی جو آبادی سے نہر کی طرف جاتی تھی عورتوں اور مردوں کی کوئی اکا دُکا ٹولی سیر کرتی آبادی سے نہر کی طرف یا نہر سے آبادی کی طرف جاتی دکھائی دے جاتی تھی۔ بعض منچلے کھیتوں کی طرف بھی نکل جاتے تھے۔ دور لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں میں ہوا میں اڑتے ہوئے رنگین دوپٹے بھی دکھائی دے جاتے تھے...... وہ شخص معمولی شریفانہ کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ عمر لگ بھگ تیس برس کے ہوگی۔ وہ میانے قد اور اکہرے بدن کا معمولی شکل و صورت والا شخص تھا۔ اس وقت فلالین کی پتلون اور ایک پرانا گرم کوٹ پہنے تھا۔ اس کا ہیٹ سر کی پچھلی جانب جھکا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی پیشانی کے اوپر بالوں کا گچھا ہوا میں ہلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے سگریٹ سلگا سلگا کر پیئے جارہا تھا۔ وہ بالکل بے فکر نظر آتا تھا۔ اُس کی گہرے بھورے رنگ کی پتلیاں ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ جب وہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تو اس کی ہموار پیشانی پر ہلکے خطوط نظر آنے لگتے تھے۔

وہ عام آنے جانے والوں کی نظروں سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ گھوم کر بلند قہقہہ لگانے والی کسی عورت یا مرد کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ پھر سگریٹ کے بچے کھچے ٹکڑے سے نیا سگریٹ سلگا کر اُسے چٹکی سے پرے پھینک دیتا اور وہ ٹکڑا ایک آدھ چنگاری ہوا میں چھوڑ کر سامنے والے گڑھے کے پانی میں ''شڑپ'' کی آواز کے ساتھ جا گرتا تھا۔

اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش کھینچا اور دھواں آسمان کی طرف مرغولے بنا بنا

کر چھوڑنے لگا۔ اور جب وہ اس طرح منہ اوپر اٹھائے ہوئے تھا اُسے دور سے ایک عورت بچہ گاڑی ڈھکیلتی ہوئی ایک مکان کے پھاٹک سے نکلتی دکھائی دی۔ وہ ذرا سنبھل کر ٹکٹکی باندھ کر اُس طرف دیکھنے لگا۔

دور سے تو اس عورت کی ارغوانی رنگ کی اوڑھنی ہی نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن جب وہ قریب آئی تو اُس کی صورت بھی دکھائی دینے لگی۔ وہ کشیدہ قامت مخلیں لب خوب صورت عورت تھی۔ وہ بھڑک دار ہلکے سرمئی رنگ کی شلوار پہنے تھی۔ اور ایک اچھی قطع کا زنانہ گرم کوٹ زیب تن کیے تھی جس کی تنگ گرفت میں چھاتیوں کا دم گھٹتا دکھائی دیتا تھا۔

اس شخص نے عورت کو قریب آتے دیکھا تو سگریٹ کا گہرا کش لے کر اُسے پرے پھینک دیا اور دستانے ہاتھ میں پکڑے عورت کے آگے آگے بہت آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا نہر کی طرف بڑھنے لگا۔۔ وہ عورت جو شکل وصورت سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتی تھی بچہ گاڑی کو ڈھکیلتی ہوئی اس کی نسبت قدرے تیز رفتاری سے چلی آرہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب سے گزری تو اس نے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ لیکن وہ اپنی دھن میں اپنے مسکراتے ہوئے بچے کی طرف دیکھتی ہوئی بڑھی چلی جارہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب سے گزری تو اس نے اپنے جسم کو کچھ اس طرح حرکت دی جیسے وہ عورت سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن جھجک کر رہ گیا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بچے کے ہاتھ میں جھنجھنا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلا کر ہنسے جا رہا تھے۔ سفید اونی سوئیٹر اور ٹوپی میں برف کا گالا دکھائی دیتا۔ ابھی چار پانچ قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ بچے نے جھنجھنا پرے پھینک دیا یا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مرد نے فوراً لپک کر جھنجھنا اٹھا لیا اور بڑھ کر بچے کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ننھے بچے کے رخسار کو چھو کر آہستہ سے بولا

''کیسا پیارا بچہ ہے۔''

عورت نے خوش نودی کا اظہار کیا جب دونوں کی نظریں ملیں تو مرد نے دونوں

رہتی تھی۔ بعض مکان بن چکے تھے۔ بعض ادھورے ہی کھڑے تھے۔ بعض کی بنیادیں ہی رکھی جا رہی تھیں۔ مکانات کے ارد گرد دور تک پکی اینٹوں کے چٹے موجود تھے۔ یا کچھ اینٹیں چونا وغیرہ اِدھر اُدھر بکھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ کچھ راستوں پر بیل گاڑیوں کے پہیوں کے گہرے نشانات پڑ گئے تھے۔ ارد گرد وہ پھیلے ہوئے گڑھے بھی موجود تھے جہاں سے کمہار مٹی کھود کھود کر لے جایا کرتے تھے۔ شہر کی طرف دیکھیں تو دھندلے دکھائی دینے والے کارخانوں کی چمنیوں میں دھوئیں کی بل کھاتی ہوئی لکیریں دکھائی دیتی تھیں۔

نہر کی جانب ایک شخص تنہا کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے کچی سڑک گزرتی تھی جو آبادی سے نہر کی طرف جاتی تھی عورتوں اور مردوں کی کوئی اکا دُکا ٹولی سیر کرتی آبادی سے نہر کی طرف یا نہر سے آبادی کی طرف جاتی دکھائی دے جاتی تھی۔ بعض منچلے کھیتوں کی طرف بھی نکل جاتے تھے۔ دور لہلہاتے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں میں ہوا میں اڑتے ہوئے رنگین دوپٹے بھی دکھائی دے جاتے تھے...... وہ شخص معمولی شریفانہ کپڑے پہنے کھڑا تھا۔ عمر لگ بھگ تیس برس کے ہوگی۔ وہ میانے قد اور اکہرے بدن کا معمولی شکل و صورت والا شخص تھا۔ اس وقت فلالین کی پتلون اور ایک پرانا گرم کوٹ پہنے تھا۔ اس کا ہیٹ سر کی پچھلی جانب جھکا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی پیشانی کے اوپر بالوں کا گچھا ہوا میں ہلتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے سگریٹ سلگا سلگا کر پئے جارہا تھا۔ وہ بالکل بے فکر نظر آتا تھا۔ اُس کی گہرے بھورے رنگ کی پتلیاں ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ جب وہ اوپر کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتا تو اس کی ہموار پیشانی پر ہلکے خطوط نظر آنے لگتے تھے۔

وہ عام آنے جانے والوں کی نظروں سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ گھوم کر بلند قہقہہ لگانے والی کسی عورت یا مرد کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ پھر سگریٹ کے بچے کھچے ٹکڑے سے نیا سگریٹ سلگا کر اُسے چٹکی سے پرے پھینک دیتا اور وہ ٹکڑا ایک آدھ چنگاری ہوا میں چھوڑ کر سامنے والے گڑھے کے پانی میں ''شڑپ'' کی آواز کے ساتھ جا گرتا تھا۔

اس نے سگریٹ کا ایک گہرا کش کھینچا اور دھواں آسمان کی طرف مرغولے بنا بنا

کر چھوڑنے لگا۔ اور جب وہ اس طرح منہ اوپر اٹھائے ہوئے تھا اُسے دور سے ایک عورت بچہ گاڑی ڈھکیلتی ہوئی ایک مکان کے پھاٹک سے نکلتی دکھائی دی۔ وہ ذرا سنبھل کر ٹکٹکی باندھ کر اُس طرف دیکھنے لگا۔

دور سے تو اس عورت کی ارغوانی رنگ کی اوڑھنی ہی نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ لیکن جب وہ قریب آئی تو اُس کی صورت بھی دکھائی دینے لگی۔ وہ کشیدہ قامت مخملیں لب خوب صورت عورت تھی۔ وہ بھڑک دار ہلکے سرمئی رنگ کی شلوار پہنے تھی۔ اور ایک اچھی قطع کا زنانہ گرم کوٹ زیب تن کیے تھی جس کی تنگ گرفت میں چھاتیوں کا دم گھٹتا دکھائی دیتا تھا۔

اس شخص نے عورت کو قریب آتے دیکھا تو سگریٹ کا گہرا کش لے کر اُسے پرے پھینک دیا اور دستانے ہاتھ میں پکڑے عورت کے آگے آگے بہت آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتا ہوا نہر کی طرف بڑھنے لگا۔۔۔ وہ عورت جو شکل وصورت سے تعلیم یافتہ معلوم ہوتی تھی بچہ گاڑی کو ڈھکیلتی ہوئی اس کی نسبت قدرے تیز رفتاری سے چلی آرہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب سے گزری تو اس نے ان کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ لیکن وہ اپنی دھن میں اپنے مسکراتے ہوئے بچے کی طرف دیکھتی ہوئی بڑھی چلی جارہی تھی۔ جب وہ اس کے قریب سے گزری تو اس نے اپنے جسم کو کچھ اس طرح حرکت دی جیسے وہ عورت سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن جھجک کر رہ گیا۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بچے کے ہاتھ میں جھنجھنا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلا کر ہنسے جا رہا تھے۔ سفید اونی سویٹر اور ٹوپی میں برف کا گالا دکھائی دیتا۔ ابھی چار پانچ قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ بچے نے جھنجھنا پرے پھینک دیا یا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ مرد نے فوراً لپک کر جھنجھنا اٹھا لیا اور بڑھ کر بچے کے ہاتھ میں دے دیا۔ اور ننھے بچے کے رخسار کو چھو کر آہستہ سے بولا
"کیسا پیارا بچہ ہے۔"

عورت نے خوش نودی کا اظہار کیا جب دونو ں کی نظریں ملیں تو مرد نے دونوں

ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''نمستے سرلا دیوی!.....''

عورت نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ مرد نے ہنستے ہوئے کہا ''سرلا دیوی شاید آپ نے مجھے نہیں پہچانا۔ لیکن آپ غور کیجئے اپنے ذہن پر زور دے کر سوچئے آپ نے ضرور مجھے کہیں دیکھا ہے۔''

عورت کی صورت سے سوچ بچار کے آثار نظر آنے لگے۔ حسن ہر کیفیت میں نئی کشش رکھتا ہے۔ اس وقت ایسے پر خلوص انداز سے سوچتی ہوئی وہ کیسی پیاری لگتی تھی۔ ''جی'' اس نے دانتوں میں نازک انگلی دبا کر کہا۔ '' آپ درست فرماتے ہیں۔ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ اور پھر آپ میرے نام سے بھی واقف ہیں۔ نہیں کہہ سکتی آپ کو کس جگہ دیکھا ہے..... معاف کیجئے گا.....''

.....'' دیکھئے ابھی یاد آجائے گا۔''

نوجوان مرد نے قدرے تامل کیا۔ لیجئے میں بتائے دیتا ہوں۔ آپ کو پریشان نہیں کرنا چاہتا..... یہ آپ کا دوپٹہ زمین سے چھو رہا ہے..... آپ کو یاد ہے جب آپ کرسچین کالج میں پڑھتی تھیں؟

سرلا نے آنچل اٹھا کر کہا ''جی جی یاد آیا..... کوئی پانچ چھ برس پہلے کی بات کر رہے ہیں آپ.....''

'' جی ہاں میں آپ کا ہم جماعت تھا..... شاید آپ کو یاد ہو۔ بائبل کی گھنٹی میں جب پروفیسر جیمی کی میز کے قریب داہنے ہاتھ کی طرف آپ دوسری لڑکیوں کے ساتھ بیٹھا کرتی تھیں۔ میں اُن دنوں عین آپ کے سامنے بیٹھا کرتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ نے کبھی مجھے بہت غور سے نہ دیکھا ہو۔ کیوں کہ آپ کی نظریں ہمیشہ جھکی جھکی رہتی تھیں..... لیکن اس کے باوجود میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کم از کم میری صورت سے آشنا ضرور ہوں گی.....''

'' جی اب مجھے یاد آگیا..... اب میں اچھی طرح یاد کرسکتی ہوں کہ آپ کی

صورت اس وقت کیسی تھی۔ بلا ناغہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ انسان صورت سے آشنا ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا...... لیکن اُس وقت آپ کے چہرے پر داڑھی نہیں اُگی تھی...... کیوں یہ صحیح بات ہے نا؟"

"آپ درست فرماتی ہیں مجھے داڑھی کچھ زیادہ عمر میں اُگی۔ اس وقت میری عمر اُنیس برس کے قریب تھی۔ بیسویں برس میں داڑھی اُگی۔ شاید اسی وجہ سے آپ مجھے پہچان بھی نہیں سکیں۔ اور پھر میری ان چھوٹی چھوٹی مونچھوں کی وجہ سے تو آپ اور بھی زیادہ مغالطہ میں پڑ گئی ہوں گی......"

اب وہ آہستہ آہستہ نہر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

"جی ہاں ایک تو آپ کی مونچھوں کی وجہ سے مجھے مغالطہ ہوا اور دوسری بات یہ ہے کہ اب پہلے کی بہ نسبت آپ کا بدن بھی ہلکا دکھائی دیتا ہے۔"

مرد نے قہقہہ لگایا "برعکس اس کے آپ کچھ موٹی ہوگئی ہیں۔ اس سے میری مراد یہ نہیں کہ آپ کا موٹاپا کچھ بھدا نظر آتا ہے۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ پہلے آپ ضرورت سے زیادہ دبلی تھیں۔ اب جسم بھر کر بس ایسا ہوگیا ہے جیسا کہ ہونا چاہئے۔ اور چہرے پر تو مردوں کی طرح کوئی تبدیلی پیدا ہوتی ہی نہیں۔"...... یہ کہہ کر پھر اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اُس نے محسوس کیا یہ بات کچھ بے تکی سی منہ سے نکل گئی اس نے جلدی سے عورت کے چہرے پر اس کا ردّعمل دیکھنے کے لیے اُچٹتی ہوئی سی نگاہ ڈالی۔ لیکن اس کے چہرے سے بدمزگی کے کوئی آثار ہویدا نہ تھے۔ "آپ ان دنوں بالکل خاموش رہتی تھیں۔ اگر میں غلطی نہیں کرتا تو آپ اپنی ہمجولیوں سے بھی زیادہ بے تکلف نہ تھیں۔ میں نے جب کبھی آپ کی طرف دیکھا آپ پتھر کی مورتی کی طرح چپ چاپ اور سنجیدہ دکھائی دیتی تھیں۔ لڑکوں کے دلوں میں آپ کا بہت احترام تھا۔ دوسری لڑکیاں تو بڑے طمطراق سے اِدھر اُدھر گھوما کرتی تھیں لیکن میرے خیال میں آپ بے جا حد تک شرمیلی نہیں تھیں۔ صرف سنجیدہ نظر آتی تھیں......"

ایک شرارت کا ذکر کروں گا۔ ایک روز آپ کالج لائبریری کے اندر کوئی کتاب نکلوانے کے لیے گئیں۔ آپ اپنی ایک بڑی سی نوٹ بک بھول گئیں۔ آپ کی غیر حاضری میں میں نے اٹھا کر اُس کی ورق گردانی شروع کردی۔ اس میں آپ نے بڑے بڑے لوگوں کے اقوال جمع کر رکھے تھے۔ میں اُنہیں پڑھ کر بہت محظوظ ہوا۔''

سرلا کچھ محجوب سی ہوگئی۔'' جی ہاں اس وقت شباب کا آغاز ہوتا ہے نوجوان کئی نصب العین سامنے رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے مفکروں کے اقوال پر سر دھنتے ہیں۔ لیکن آخر کار وہ گھر کے دھندوں میں پھنس کر رہ جاتے ہیں...... آخر آپ کے کیا مشاغل رہے۔ آپ کہاں کہاں گھومے۔ کیا کیا واقعات پیش آئے...... کوئی مزے دار بات سنایئے.....''

یہ سن کر مرد کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے سگریٹ کا کش لگایا اور چپ چاپ زمین کی طرف دیکھتا ہوا بھاری قدموں سے چلتا گیا۔ سرلا اس کے چہرے پر اس قسم کے جذبات دیکھ کر متعجب ہوئی۔

''سرلا دیوی! آپ یہ کیا بات پوچھ بیٹھیں۔''

سرلا نے حیرت سے کہا۔'' آخر کیا بات ہے؟ آپ کا چہرہ اس قدر پھیکا کیوں پڑ گیا؟ کیا کوئی خاص حادثہ پیش آیا ہے؟''

مرد نے ہلکی سی آہ بھر کر کہا'' سرلا دیوی! یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کو ہر طرح سے مطمئن دیکھ کر مجھے کس قدر خوشی حاصل ہوئی...... شکر ہے کہ میں بدنصیب ہی اس مصیبت میں گرفتار ہوا...... میں ...... دراصل سرلا دیوی ! میں نے ایک قتل کر دیا تھا......''

''قتل''

'' جی ہاں...... میں نے وہ قتل کیوں کیا؟...... سرلا دیوی ! مجھے خواب میں خیال نہیں تھا کہ میں کبھی کسی کو قتل کر ڈالوں گا......''

عورت کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مرد نے سگریٹ پرے پھینک

دیا اور کہا ''یہ قتل میری بہن کی وجہ سے ہوا۔ میرا بہنوئی بہت ہی بدمعاش شخص تھا۔ اخلاقی لحاظ سے حد سے گرا ہوا' سرلا دیوی! آپ اس بات کا اندازہ لگا ہی نہیں سکتیں کہ وہ کس قدر ذلیل انسان تھا۔ خیر وہ خود تو من مانی کا رول ادا کرتا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی میری بہن کی زندگی عذاب میں ڈال رکھی تھی تنگ آ کر بہن نے ایک مرتبہ مجھے چٹھی لکھی۔ میں اُن کے گھر میں پہنچا۔ بہن نے کل حالات بتائے۔ اتنے میں وہ خود آن پہنچا۔ آتے ہی بہن کو گندی گندی گالیاں دینے لگا۔ اس وقت کچھ نشہ میں بھی تھا۔ نہ اُس نے میرا خیر مقدم کیا نہ کچھ لحاظ بہن نے میرا واسطہ دے کر اُسے منہ بند کرنے کے لیے کہا تو وہ مجھ پر پل پڑا۔ مجھے از حد غصہ آ رہا تھا ٹوٹی ہوئی چارپائی کا ایک پایہ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے ایک بھرپور ہاتھ جو دیا تو بھیجا باہر نکل پڑا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اُسے فوراً ہسپتال لے گئے۔ لیکن وہ وہاں پہنچتے پہنچتے مر گیا...... سرلا دیوی! اب آپ سے کیا چھپانا۔ یہ ہمارا گھریلو معاملہ تھا...... میں گرفتار ہو گیا۔''

عورت مارے تعجب کے اسی جگہ جم کر کھڑی ہو گئی۔ ''پھر؟''

''پھر مجھے پھانسی کی سزا ہو گئی۔''

عورت کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس نے بچہ گاڑی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''پھر آپ بھاگ آئے جیل سے؟''

مرد نے کھوکھلی نظروں سے عورت کی طرف دیکھا ''جی نہیں کل مجھے پھانسی کے تختہ پر لٹکا دیا جائے گا۔''

قدرے تامل کے بعد وہ پھر کہنے لگا '' آپ کو تعجب ہو رہا ہے؟ جی ہاں، آپ کیا میں خود تعجب میں ہوں۔ میں خود اس بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے...... شاید آپ کو یاد ہو۔ ہمارے ساتھ ایک لڑکا شبھوشنکر پڑھا کرتا تھا...... جی ہاں وہی جو بائبل کے گھنٹے میں سب سے زیادہ اعتراضات کیا کرتا تھا— وہ آج کل جیلر انچارج ہے۔ وہ میرا جگری دوست تھا۔ میں نے اُس کی منت کی کہ وہ مجھے چند گھنٹوں کے لیے

آزاد کر دے...... اسی کے طفیل میں اب اس کھلی ہوا، لہلہاتے ہوئے کھیتوں' ہنستے کھیلتے لوگوں اور ان خاموش درختوں کو الوداع کہنے آیا ہوں......"

اس کے بعد سکوت طاری ہوگیا۔ عورت اپنے خیالات میں گم ہوگئی۔ اس نے ایک آدھ مرتبہ اُچٹتی نظروں سے مرد کی طرف دیکھا۔ جس کا چہرہ لاش کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اس کے بے جان سے بازو آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ اس نے کپڑے بھی بے پروائی سے پہن رکھے تھے...... اس طرح بالکل چپ چاپ وہ دس پندرہ منٹ بعد چلے گئے۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ اب پورا چاند آسمان پر جلوہ افروز ہو رہا تھا۔ اس کی صاف ستھری چاندنی بھی اُداس اُداس دکھائی دیتی تھی۔ نہر کا پانی بھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے چوروں کی طرح دبے پاؤں چلا جارہا ہو۔

معاً عورت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ مرد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا ببول کا کانٹا اس کے سینڈل کی کھلی جگہ سے اُس کی ایڑی میں جا چبھا تھا۔ اس نے بچہ گاڑی کو چھوڑ کر اُسے سہارا دیا۔ "آپ اِدھر بیٹھ جائیے اونچی جگہ پر...... ذرا صبر کیجئے۔"

عورت بیٹھ گئی مرد نے اس کا پاؤں اپنے زانو پر رکھ لیا۔ "کانٹا ٹوٹ گیا ہے۔ یہ کہہ کر وہ اپنے کوٹ کا کالر ٹٹولنے لگا۔ ایک پن نکال کر اس نے عورت کا سینڈل اُتار دیا اور کانٹے والے مقام کو چٹکی میں دبا کر اس نے اس جگہ کو پن سے کریدنا شروع کر دیا۔ عورت نے ہونٹ دانتوں تلے دبا کر اپنی پنڈلی دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لی— درد کے مارے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ مرد کی طرف دیکھتی رہی جو بڑے انہماک سے کانٹا نکالنے میں مشغول تھا۔ اس کے ہاتھوں کی انگلیاں بڑی احتیاط سے حرکت کر رہی تھیں۔ اس کی متجسس آنکھیں ایڑی پر جمی ہوئی تھیں۔ اس وقت وہ صورت سے کس قدر بے لوث اور سیدھا سادا شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کے سر کے بال بچوں کے بالوں کی طرح باریک اور ملائم نظر آتے تھے۔ وہ از حد احتیاط سے کانٹے کے

ارد گرد کا گوشت ہٹا رہا تھا۔ پھر اس نے پن ایک طرف رکھ کر کانٹے کو چٹکی میں پکڑا اور باہر کھینچ لیا۔ عورت کو درد کا ایک جھٹکا سا لگا اور پھر اُسے بے حد راحت کا احساس ہوا۔ مرد نے کانٹا ہتھیلی پر رکھ کر دکھایا۔ اس وقت اس کے اُداس چہرے پر بچوں کی سی بھولی ہنسی کس قدر بھلی دکھائی دیتی تھی۔

عورت نے ایڑی کو گھما کر دیکھا۔ خون کی ایک بوند جھلک رہی تھی مرد نے کہا'' ذرا ٹھہریئے'' یہ کہہ اس نے جیب میں سے رومال نکالا اور وہ بوند پونچھ ڈالی اور پھر رومال کی تہ بنا کر اُسے اُسی مقام پر باندھ دیا۔

سرد ہوا کے جھونکے پانی کو چھو کر آتے اور ان کے بالوں سے اٹکھیلیاں کرتے ہوئے آگے نکل جاتے۔ وہ تھوڑی دیر تک اُسی جگہ بیٹھے رہے۔ ہر طرف سکون اور خاموشی طاری تھی۔ دور چائے کی دوکان سے روشنی نظر آرہی تھی۔ اور اس روشنی میں چند متحرک سائے دکھائی دے رہے تھے۔ بچہ ہمک ہمک کر چاند کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جب وہ گردن پھیرتا تو اس کا سر جھک جاتا اور وہ پھر اپنے سر کو اٹھاتا اور چاند پر نگاہیں جما دیتا۔۔۔

اس اُداسی میں بھی بچے کی اس حرکت پر ان دونوں کے لبوں پر مبہم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی...... یکا یک مرد نے عورت کی طرف دیکھا'' سرلا دیوی!......''

''جی!''

''مجھے آپ سے ایک بات کہنی ہے۔ اب میں کہے بغیر نہیں رہ سکتا......''

عورت نے کچھ متعجب ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

مرد نے قدرے تامل کیا پھر بولا۔ ''میری جرأت کا برا نہ مانئے گا......

میں آپ سے محبت کرتا ہوں...... میں شرمسار ہوں...... لیکن میں آپ کی پوجا کرتا ہوں۔ طالب علمی کے اس زمانے سے میں...... آپ ہی کی پرستش کرتا ہوں...... کیا آپ خفا ہوگئیں......؟''

عورت کے دونوں ہاتھ سینے پر جا لگے۔ تعجب کے مارے اس کا منہ تھوڑا سا کھل گیا اور اس کے سپید دانت ہونٹوں میں سے اپنی جھلک دکھانے لگے۔

''سرلا دیوی! میں نے بہت دنوں تک یہ آگ اپنے سینے میں دبائے رکھی۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو آپ کی محبت کے قابل نہیں سمجھتا۔ اور اب جبکہ آپ شادی شدہ عورت ہیں۔ میرا یہ کہنا بالکل زیب نہیں دیتا۔ میں کبھی یہ الفاظ اپنے منہ سے نہ نکالتا۔ لیکن آج جبکہ میری زندگی کا آخری دن بھی ختم ہو چکا ہے۔ میں صرف اتنی سی بات کا اعتراف کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں...... اور فرمایئے میں لاچار تھا...... آپ سے میں نے جان بوجھ کر محبت نہیں کی...... میری داستان صرف اتنی ہی ہے کہ آپ نے جب پہلی مرتبہ میری طرف دیکھا تھا۔ میں اپنا دل کھو بیٹھا۔ میں مجبور تھا۔ مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے...... میں آپ سے یہ بات کبھی بھی نہ کہہ سکا...... میں اس قابل ہی کہاں تھا۔ مجھے یہی احساس تھا کہ میں آپ کے قابل نہیں کس منہ سے آپ کی محبت کا دم بھروں۔۔۔ بزدل کہیے۔ مجھے انکار نہیں۔۔۔ کمینہ کہیے میں برا نہیں مانوں گا...... انسان کی فکر خواہ کتنی بھی بلند کیوں نہ ہوجائے...... اور اس کے کارنامے خواہ کچھ بھی کر دکھائیں حقیقت یہ ہے کہ وہ پھر بھی بعض مقامات پر ہمیشہ کمزور رہے گا...... بیسیوں لڑکیاں آئیں اور گزر گئیں۔ انہوں نے کبھی میرے دل پر اس قسم کا اثر نہیں ڈالا۔ وہ آپ سے زیادہ خوب صورت بھی تھیں۔ زیادہ چنچل اور شاید زیادہ خوش گفتار بھی۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ مجھے آپ کی کون سی ادا بھا گئی۔ میں نہیں جانتا کہ آخر مجھے ہوا کیا۔ مجھے آپ یا کوئی شخص کچھ بھی کہے لیکن میرے لیے آپ ہی سب کچھ تھیں۔ کالج میں آپ کا یہ پرستار خاموشی سے آپ کی پوجا کرتا رہا...... آپ نے تعلیم کا سلسلہ بند کر دیا۔ میں دور ہی دور سے آپ کی زیارت کرتا رہا...... آپ کی شادی ہوگئی میں نے اُف نہیں کی...... آپ خوش ہیں۔ یہی امر میرے لیے باعثِ تسکین تھا...... مجھ میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ میں اپنا سینہ کھول کر آپ کے سامنے رکھ دوں...... آپ

مجھے خواہ کچھ بھی کہئے بس اتنی سی بات سمجھ لیجئے کہ میں آپ کا بندہ تھا۔ آپ کا زر خرید غلام تھا۔ میں آپ کا اپنا ہی تھا...... سالہا سال سے یہ روگ میری جان کو گھن کی طرح کھائے جارہا تھا...... آج کے روز میں اس بات کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکتا...... آپ نے انجانے طور پر ابرو کے ایک اشارے سے مجھے کہیں کا نہ رکھا...... شاید جان بوجھ کر آپ ایک حقیر چیونٹی کو نہ مار سکیں...... لیکن ایک آتما اتنے دنوں تک آپ ہی کی خاطر اس قدر دکھی رہی...... کیا آپ کا حساس دل اسے پورے طور پر محسوس کیے بغیر رہ سکتا ہے۔ کیا آپ مجھ مجبور کے دل کی جلن کا اندازہ لگا سکتی ہیں...... کیا آپ اس سالہا سال کے کرب اور بے چینی کا تصور کر سکتی ہیں...... آپ برا نہ مانئے گا...... میں جذبات کی رو میں نہ معلوم کیا کیا بک گیا......''

اچانک یہ معلوم اور محسوس کر کے کسی شخص کی اُس کی محبت میں کیا سے کیا حالت ہوئی عورت کے چہرے پر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوگئی وہ بت کی طرح خاموش اور جامد بیٹھی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کہے۔ مرد کی آواز شدتِ جذبات سے تھرتھرائی ہوئی تھی اور اس کے الفاظ میں کوہِ آتش فشاں کے دہانے سے نکلتی ہوئی آگ کے شعلوں کی سی گرمی اور تندی تھی ـــــ عورت کی آنکھیں جھک گئی تھیں۔ وہ ایک لفظ تک نہ کہہ سکی۔ وہ اس سے نظر تک نہ ملا سکی ـــــ کچھ دیر سکوت طاری رہا ـــــ پھر عورت نے چھپی نظروں سے اس مرد کی طرف دیکھا جس نے اُس سے اس قدر شدت سے اور اتنی خاموش محبت کی تھی ـــــ مرد کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ بھی زمین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس عورت کے روبرو کسی مرد نے آج تک اس طرح محبت کا اظہار نہ کیا تھا اور یہ سب کچھ آنکھ جھپکتے میں ہوگیا۔ وہ سنبھل ہی نہ پائی آخر اب وہ کیا کرے......؟

مرد نے تنکا توڑتے ہوئے کہا '' سرلا دیوی! اپنے اس پگلے کو معاف کر دیجئے۔ چند گھنٹوں کی بات اور ہے۔ مرنے والے کی باتوں کا غصہ نہ کیجئے گا۔ میں جانتا تھا مجھے یہ سب کچھ ہرگز نہ کہنا چاہئے تھا...... لیکن سرلا دیوی! چند گھنٹے پہلے جب شیو شنکر نے مجھ

سے کہا دوست! جاؤ چند گھنٹے دنیا کی سیر کر آؤ۔ مجھے تم پر اعتماد ہے...... مجھے یقین ہے کہ تم ہماری دوستی کی پاکیزگی کی توہین نہیں ہونے دو گے...... میں چند گھنٹوں کے لیے تمہاری غیر حاضری کا راز پوشیدہ رکھ سکتا ہوں...... میں جب باہر آیا تو وسیع دنیا میرے سامنے تھی۔ ایک بہن تھی یہاں سے بہت دور میں وہاں تک پہنچ نہ سکتا تھا۔ باقی اس دنیا میں میرا کون تھا۔ میں نے سوچا بہت سوچا...... اور پھر سرلا دیوی مجھے آپ کا خیال آیا۔ یہ درست ہے کہ آپ نے آج تک کبھی میری بابت سوچا تک نہ ہوگا۔ لیکن میری زندگی کا ہر لمحہ آپ کی یاد میں گزرا تھا۔ آپ کے لیے میں بیگانہ تھا۔ لیکن میرے لیے آپ بیگانہ نہیں تھیں۔ میں نے آپ کی تصویر کو ہمیشہ اپنے دل کے اس قدر قریب رکھا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آپ میری ہی ہیں۔ جس کی یاد میں میں نے زندگی کی ایک ایک گھڑی گزار دی۔ کیا اس پر میرا اتنا بھی حق نہ تھا...... شاید زندگی کے آخری لمحوں نے مجھے اس قدر جذباتی بنا دیا ہے— شاید دوسرے مرد اس طرح محبت نہ کرتے ہوں۔ وہ میرا مذاق اڑائیں۔ لیکن سرلا دیوی! میں تو آپ کا بندہ۔ اب خواہ اپنے اس غلام کو سزا دیجئے یا اس کی جان بخشی کر دیجئے۔ میری گستاخی معاف فرمایئے...... شاید آپ دریافت فرمائیں کہ آخر اب اس محبت کو جتانے کا مقصد کیا تھا؟ سو جواب میں عرض ہے کہ کچھ مقصد نہیں۔ کوئی غرض نہیں۔ یوں ہی دل نے چاہا کہ مرنے سے پہلے محبوبہ کے کانوں تک اپنی محبت کا پیغام پہنچا دے۔ موت کے اس قدر قریب پہنچ کر میں ضبط نہ کرسکا۔ میں محض اعتراف کرنے کے لیے چلا آیا۔ بس...... اب میں ادب کے ساتھ آپ سے درخواست کروں گا کہ اگر میرے الفاظ سے آپ کے دل کو صدمہ پہنچا ہو تو باور فرمایئے اس کے لیے تہِ دل سے شرمسار ہوں بلکہ مجھے خود اس امر کا دکھ ہے......"

عورت بے خیالی میں گھاس پر ہاتھ پھیرتی رہی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ اس کا سینہ سانس کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ نیچے اوپر ہو رہا تھا...... مرد بھی خاموشی سے دوسری طرف تکتا رہا۔ وہ خود عورت سے نظریں ملانے سے کتراتا تھا۔

خاموش لمحے گزرتے گئے...... بالآخر مرد نے کہا آیئے اب واپس چلیں۔ عورت چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی۔

بچہ گاڑی کے پہیوں میں سے چوں چوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ بچہ سو گیا تھا۔ اس ویرانے کی ہر شے پر غنودگی سی طاری ہو رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے چائے کی دوکان تک پہنچے۔ وہاں مرد سگریٹ لینے کے لیے گیا۔ عورت اُسے پیچھے سے دیکھتی رہی۔ جب وہ واپس آیا تو وہ سر جھکائے اُس کے ساتھ ہولی۔ نہر کی پٹری سے اُتر کر تھوڑی دور پہنچے تو تو مرد رُک گیا۔ اس نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اچھا سرلا دیوی! اب مجھے اجازت دیجئے۔ نہ معلوم آپ دل میں میری بابت کیا خیال کرتی ہوں گی...... کم از کم مجھے اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ مجھ سے خفا تو نہیں ہیں؟

عورت نے پاؤں سے زمین کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا......

''جی نہیں......''

''بہتر......'' مرد نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا ''نمستے''

عورت نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے رُخ پھیر لیا اور پھر آہستہ آہستہ جلدی...... مرد قدرے سکوت کے بعد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا...... کچھ دور جا کر اُس نے مڑ کر دیکھا کہ عورت چپ چاپ کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ بھی رک گیا اُسے ایسے معلوم ہوا جیسے وہ بلا رہی ہو...... وہ کچھ دیر رُکا رہا کہ شاید وہ چل دے۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ وہ پھر واپس اُس کے پاس پہنچا۔ '' آپ ...... گھر جایئے نا؟ رات ہوگئی ہے......''

وہ چپ رہی۔

'' آپ جاتی کیوں نہیں؟''

عورت نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ '' آپ کو واپس کس وقت پہنچنا ہے؟''

"صبح چار بجے سے پہلے پہلے۔"

عورت نے اُچٹتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا..... "آپ آج ہمارے ہاں آجائے نا..... سب لوگ سوجائیں تو..... ہم باتیں کریں گے۔" یہ کہتے کہتے اُس کے رخسار سرخ ہوگئے۔

— وہ چل دی۔

مرد کچھ دیر تک اُسے دیکھتا رہا۔ جب وہ کافی دور نکل گئی تو اس نے ایک نیا سگریٹ منہ میں دبا لیا۔ اس کے لبوں پر ایک شریر مسکراہٹ پیدا ہوئی..... اور اس کی بھوری آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں۔

عورت بڑی کھڑکی کے قریب بیٹھی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنے عاشق کا انتظار کرتی رہی۔ دور سے ہر پرچھائیں پر اُسے اس کا شبہ ہوتا تھا— لیکن وہ نہ آیا اور نہ پھر کبھی اس کی صورت ہی دکھائی دی۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ "ہندوستاں ہمارا" میں شامل ہے۔

اجنبی

برآمدے کے جس حصے میں وہ بیٹھا تھا وہ حصہ اس کے بنگلے کے بالکل ایک کنارے پر تھا۔

رات کا وقت تھا، بارش ہوجانے کی وجہ سے آسمان دھل دھلا کر صاف ہوگیا تھا۔ اور ستارے چھوٹے بڑے بتاشوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ درختوں کی ٹہنیاں اور پتیاں بوجھل ہو کر جھکی ہوئی اس طرح دکھائی دیتی تھیں جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہوں۔ بارش ہوجانے کے بعد اگرچہ سردی پہلے سے بھی زیادہ ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے باوجود موسم بہت خوش گوار تھا۔ ایسے اچھے موسم میں چاہئے تو یہ تھا کہ ہر شے مارے مسرت کے رقص کرتی ہوئی دکھائی دیتی۔ لیکن اس کے برعکس ہر چیز چپ چاپ تھی...... یہ خاموشی اُداسی کی خاموشی نہیں تھی بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہر چیز مسرت و شادمانی کی منزلوں سے گزر کر کامل اطمینان اور آسودگی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جیسے ہر پیڑ، ہر پودے ہر مکان، ہر اینٹ، ہر پتھر، گھاس کی ہر پتی غرض ہر شے پر غنودگی سی طاری ہے۔ جیسے وہ سب ہلکے نشے میں مبتلا ہوں۔ یا جیسے ابھی ہر چیز جاگ اٹھے گی اور ایک ہی تال پر وہ سب مل جل کر کوئی اچھوتا گیت اور کوئی نیا رقص شروع کر دیں گے۔

بیرونی دنیا پر اگر اس قدر سکون طاری تھا تو اس کے دماغ میں نیا طوفان اٹھ

رہا تھا۔

اس وقت اُس کی عمر ساٹھ برس کے قریب تھی۔ اگر چہ وہ اپنی عمر کے لحاظ سے صحت ور تھا۔ لیکن بڑھاپا پھر بڑھاپا ہے۔ وہ پہلے کی سی امنگ اور ترنگ اب کہاں۔ اس وقت وہ ایک آرام کرسی پر بیٹھا خلا میں گھور رہا تھا۔

یہ بنگلہ اسی کا بنوایا ہوا تھا۔ وہ سالہا سال سے اپنے مخصوص کمرے کے سامنے اسی برآمدے میں اسی طرح بیٹھے رہنے کا عادی تھا۔ سامنے دھندلکے میں ٹینس کورٹ پر کھنچی ہوئی چونے کی پھیکی، ٹوٹی پھوٹی اور ادھوری لکیریں نظر آرہی تھیں۔ ٹینس کورٹ کے اس طرف لوہے کی ایک بنچ پڑی تھی۔ جب اُس نے یہ بنگلہ بنوایا تھا اُسی وقت یہ بنچ بھی اس جگہ رکھی گئی تھی۔ اس وقت سے اب تک بارش دھوپ اور اوس میں یہ بنچ پڑی رہی لیکن اس کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ کس قدر مضبوط تھا یہ لوہا...... بیٹھے بیٹھے وہ فلسفیوں کی طرح اس بنچ پر غور کرنے لگا ایک بڑی سی پھیلی ہوئی گود کی طرح یہ بنچ بالکل کوئی جان دار شے معلوم ہوتی تھی۔

زندگی میں کتنی مرتبہ وہ اس بنچ پر بیٹھا تھا۔ لیٹا تھا، اس کا سہارا لے کر کھڑا ہوا تھا۔ اس کی بیوی اور اس کے بچے بھی اُس پر بیٹھے رہے تھے۔ وہ بچے جو کبھی بڑی مشکل سے اُس پر چڑھ پاتے تھے۔ اب کھڑے کھڑے اُسے پھلانگ سکتے تھے۔ ہر شے بدل گئی۔ اُس کے بچے جوان ہوگئے وہ جوان سے بوڑھا ہوگیا لیکن اس بنچ کا کچھ نہ بگڑا تھا۔ وہ کھلائی بھی جو گھر میں بچوں کے لیے مقرر کی گئی تھی اب بوڑھی ہو چکی تھی۔ حالانکہ جب وہ آئی تھی تو نہ صرف اُس کی صورت اچھی خاصی تھی بلکہ جوان بھی تھی۔ ان دنوں اُس کی پہلی بچی پیدا ہوئی تھی۔ وہ بھی جوان تھا اس کی بیوی بھی جوان تھی۔ اس لیے اس کی بیوی اُس عورت کو گھر میں ملازم رکھنے سے کچھ ہچکچائی بھی تھی۔ اُسے یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ اپنی بیوی کو چڑانے کے لیے وہ یوں ہی نئی ملازمہ کی تعریف کر دیا کرتا تھا۔ یا کوئی بھی مشکوک حرکت کر دیا کرتا تو اُس کی بیوی دل ہی دل میں جلا کرتی تھی۔

اب وہ کھلائی بھی بوڑھی ہوگئی تھی۔ بلکہ اب تو خیر سے وہ چشمہ بھی لگاتی تھی جس کے دونوں سروں پر دو موٹے موٹے سیاہ رنگ کے تاگے بندھے ہوئے تھے۔ اب اس کی

بیوی کو کوئی فکر نہ تھی...... ادھر یہ بچّ اسی طرح کھڑی تھی۔ اُسے بھی وہ کسی خدمت کے لیے خرید کر لایا تھا۔ اُس نے خدمت گزاری بھی کی اور پھر ویسی کی ویسی ہی تھی۔

بعض اوقات اگر انسان ان باتوں پر غور کرے تو ایسی بے جان چیزیں جو بدستور اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہیں انسان کے لیے بہت ہی اذیت دہ ثابت ہوتی ہیں۔ عمارتیں، سڑکیں، پہاڑ، دریا وغیرہ ایک انسان کی زندگی کے دوران میں عموماً روز اول ہی کی طرح قائم اور سلامت رہتے ہیں۔ انسان بدلتا رہتا ہے لیکن اس کے ارد گرد کی چیزوں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ یہ بات اس طرح بڑی اذیت رساں محسوس ہونے لگتی ہے کہ پہلے جس پہاڑ پر انسان ہنستا کھیلتا، چٹکیاں بجاتا چڑھ جاتا تھا۔ اب اس سے کسی صورت میں بھی اس پر نہیں چڑھا جاتا۔ اس طرح کچھ اس قسم کا احساس ہونے لگتا ہے جیسے اُسے بھری محفل سے بے آبرو کر کے دھکے دے دے کر نکالا جا رہا ہو۔

وہ دریا جو پہلے آغوش پھیلائے ہنس ہنس کر اُس پار تک تیرنے کی دعوت دیتا تھا۔ اب اُس کے سامنے اعلانیہ حقارت سے ہنس کر آگے بڑھ جاتا ہے اور بوڑھا انسان چپ چاپ کھڑا رہ جاتا ہے۔

وہ بڑے سے بڑا درخت جس پر وہ اُچک کر بندر کی طرح چڑھ جاتا اور چشم زدن میں اُس کی بلند ترین ٹہنیوں پر پہنچ جاتا تھا اب اُس بوڑھے کھوسٹ کو بڑی رعونت سے دیکھتا ہے اور ایسی بے رخی سے پیش آتا ہے جیسے کبھی اُسے دیکھا ہی نہ ہو۔

وہ بھرپور چھاتیوں والی عورتیں جن کی طرف دیکھ کر جب وہ آنکھ مار دیا کرتا تھا اور وہ جواب میں دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ نظریں جھکا لیتی تھیں۔ اب ''ہٹ رے بابا! رستہ چھوڑ'' کہہ کر ایک زناٹے کے ساتھ قریب سے گذر جاتی ہیں اور انسان کا دل کٹ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اس پر کسی کا کیا زور تھا۔ ایک نا معلوم بہاؤ تھا کہ انسان اس میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ یہاں ڈوبتے کو رواتی تنکے کا سہارا نہ ملتا تھا۔

بڑھاپا بجائے خود ایک مرض تو خیر ہے ہی۔ لیکن اگر اس کے ساتھ ہر جان دار

اور بے جان چیز کی بے رخی بھی شامل ہوجائے تو زندگی کس قدر تلخ ہوجاتی ہے۔ اس عمر میں ہر شے یہی کہتی دکھائی دیتی ہے: ''ہٹ رے بابا! رستہ چھوڑ'' ہر چہار طرف سے اسی قسم کی آوازیں آنے لگتی ہیں اور ہمارا نحیف و زار بوڑھا لڑکھڑاتا ہوا حیرانی سے اُن لوگوں کی طرف دیکھتا ہے جو بڑے جوش وخروش کے ساتھ بڑھے جاتے ہیں۔ انہیں اس قدر جلدی کس بات کی ہوتی ہے۔ وہ کہاں پہنچ جانا چاہتے ہیں— آخر میں تو یہی ہوگا کہ ان کا وہ دن بھی آ پہنچے گا جبکہ دنیا کی کوئی شے ان کی رفاقت کا دم نہ بھرے گی۔ اُنہیں بھی سب رستہ چھوڑنے کے لیے کہیں گے۔

تو کیا خود اس نے ان باتوں پر پہلے بھی کبھی غور کیا تھا؟

اس کے کانوں کو سردی محسوس ہونے لگی اُس نے مفلر کانوں پر لپیٹ لیا اور برآمدے میں لٹکے ہوئے لوہے کے تاروں کے گملوں کی طرف دیکھنے لگا۔ جن میں بیلیں نکل کر نیچے کی طرف بڑھ آئی تھیں۔ اور ہلکے رنگوں کے پھول بالکل ساکن دکھائی دیتے تھے جیسے رقص کرتے کرتے ایک دم رک گئے ہوں۔ گملوں میں سے اب بھی پانی رس رس کر بوند بوند کر کے نیچے گر رہا تھا۔

معاً ہنسی اور شور وغل کی آوازیں سن کر وہ چونک اٹھا۔ اس کی خاموش اور سنجیدہ دنیا سے یہ دنیا کس قدر علاحدہ تھی۔ یہ اُسی کے بچے تھے دو لڑکے اور تین لڑکیاں۔ سب سے بڑے لڑکے کی عمر اٹھائیس برس کے قریب تھی اُس کی شادی ہوچکی تھی۔ اُس سے چھوٹی لڑکی تھی۔ چوبیس برس کے قریب اُس کی بھی شادی ہوچکی تھی۔ اُس سے چھوٹی لڑکی کی عمر اُنیس برس کی تھی۔ اس سے چھوٹا چودہ سالہ لڑکا اور سب سے چھوٹی بارہ برس کی لڑکی۔ ان میں اُس کے لڑکے کی نوجوان بیوی اور اس کا چھوٹا سا پوتا بھی شامل تھا۔ وہ سب لوگ ہنس کھیل رہے تھے۔ اور وہ خود تنہائی میں بیٹھا تھا۔ عرصہ دراز سے یہی سب کچھ ہو رہا تھا۔ لیکن اسے کبھی ان باتوں کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ پہلے اُس کی زندگی بھرپور تھی۔ وہ کماتا رہا اور اپنے مشاغل میں محو رہا۔ اُس کے دوست تھے جن کے

ساتھ یکجا کھانا اور پھر پینا بھی ہوتا تھا۔ ان کی صحبت میں چنگ و رباب کی محفلیں بھی گرم ہوتی تھیں۔ سیر و شکار کی مہموں پر بھی جاتے تھے۔ گھر والوں سے اُس کا کچھ زیادہ تعلق نہ تھا۔ اُس کا ایک علاحدہ کمرہ تھا۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ حصہ اسی کمرے میں صرف کرتا تھا۔ یہیں اُس کے دوست بھی آ پہنچتے تھے۔ یہیں برج بھی کھیلی جاتی تھی۔

دوستوں سے فرصت پاتا تو پھر دفتر کا کام بھی تھا اور کئی مسائل تھے جن پر سوچنا پڑتا تھا۔

وہ گھر میں سخت قسم کا ڈسپلن پسند کرتا تھا۔ بچے اس کے پاس کم آتے تھے۔ وہ سخت طبیعت کا شخص تھا۔ اس میں بھی شبہ نہیں کہ اُسے باپ ہونے کا غیر معمولی احساس تھا۔ وہ بلا ضرورت شاذ و نادر ہی بچوں سے بات چیت کرتا تھا۔ وہ گھر کے اندر بھی کم و بیش ہی داخل ہوتا تھا۔ اگر اُس کے بچوں میں سے کسی کو کسی شے کی ضرورت ہوتی تو وہ موقع پا کر اُس کے پاس آتا، مدعا بیان کرتا...... وہ بچوں کا رونا دھونا، ان کی ہنسی... و غل برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے اُس نے اپنا کمرہ بالکل علاحدہ کر رکھا تھا۔ بچوں کے لیے وہ ایک بلند مرتبہ اور افضل ہستی تھا جو کسی اونچے سنگھاسن پر متمکن تھا۔ اس کے نزدیک جانا یا بلا وجہ اُس کے سامنے ہنسنا اور باتیں کرنا وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ وہ اپنے باپ کی عزت کرتے تھے۔

وہ اپنے بچوں کے اس رویہ سے بالکل مطمئن تھا۔ اس نے بچوں کو بہت اچھی طرح سے پالا پوسا۔ اُن کی ضروریات کا خیال رکھا۔ اس طرح وہ ہمیشہ ان کے لیے ایک بہت ہی بلند ہستی بنا رہا۔ اُسے خواب میں بھی خیال نہیں آیا کہ اُس سے بڑھ کر بھی کسی شے کی ضرورت ہوسکتی ہے۔ والدین اور اولاد کے مابین اس سے بھی قریبی تعلقات لازمی ہیں۔ اس کی اولاد نیک تھی۔ وہ سب با اخلاق، تعلیم یافتہ اور با ادب بچے تھے۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کے تعلقات میں کسی قسم کی کوئی کمی رہ گئی تھی۔

کچھ نئے قسم کے خیالات تھوڑے ہی عرصہ میں اُس کے دماغ میں کروٹیں لینے

گئے تھے۔ اس کا جسم اب کمزور ہو چکا تھا۔ اب وہ پہلے کے مشاغل ترک کر چکا تھا۔ اتنی سکت ہی نہ تھی کہ وہ اِدھر اُدھر بھاگتا پھرے۔ اب اُس کے دوستوں میں بھی بوڑھے لوگ شامل تھے وہ لاٹھیاں ٹیکے ہوئے آتے اور پھر ان میں سے کسی کے ساتھ چہل قدمی کرتا ہوا شہر سے دور چلا جاتا۔ ان بڈھوں میں سے بیش تر کو جوانوں سے کوئی نہ کوئی شکایت ضرور ہوتی تھی۔ وہ اپنا وقت زیادہ تر انہیں باتوں میں صرف کرتے تھے۔ یا پھر مختلف رشتہ داروں کی باتیں۔ گذشتہ زمانے کے قصے یا وہی مادہ پرستوں کی بے کار روحانیت' پرم آتما اور آتما کا فرق تصوف اور ویدانت کا تعلق۔ اس طرح وہ اپنی علاحدہ دنیا میں پوپلے منہ ہلا ہلا کر باتیں کیا کرتے تھے اور ان باتوں کا نتیجہ کچھ بھی نہ نکلتا تھا۔ بس یوں ہی دل کو ڈھارس دینے کے طریقے تھے۔ اس کی طرح سب کو یہی احساس تھا کہ اب ان کا کام ختم ہو چکا۔ اب انہیں آج کل میں بوریا بستر لپیٹ کر چل دینا ہے۔

لیکن دنیا کی محفل اب بھی گرم تھی۔ شمعیں اب بھی جلتی تھیں۔ پروانے اب بھی قربان ہوتے تھے۔ اس زندگی کے ہنگاموں میں ذرہ برابر بھی فرق نہ آیا تھا...... تو بس یہی تھی زندگی؟ اسی کے لیے اس قدر شور دغل مچا ہوا تھا؟

اس محفل سے اس طرح بے آبرو ہو کر نکلنا کس قدر اذیت دہ تھا۔ بھری محفل سے خارج کر دیئے جانے والا بھی کس قدر دبے پاؤں آگے بڑھتا تھا۔ کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ انسان کو ایک دم کھڑکی سے باہر نکال کر پھینک دیا جائے تو وہ ایک علاحدہ بات ہے۔ لیکن اس کے برعکس یہ عمل اس قدر آہستہ آہستہ ہوتا تھا اور یہ سارا قضیہ اس قدر طویل ہوتا تھا کہ انسان مارے اذیت کے چیخ اٹھتا تھا۔ پاگل ہو جاتا تھا...... انسان کو اس بات کا احساس دلایا جاتا تھا کہ اب وہ اس محفل کے قابل نہیں رہا۔ محفل اسی طرح گرم رہتی ہے۔ وہی ساقی' وہی جام وہی چنگ و رباب کی اڑتی ہوئی تانیں...... لیکن انسان بدل جاتا ہے۔ اُسے اوروں کے لیے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے اور اگر وہ یہ نہ کرے تو پھر نو وارد اُس کی چھاتی پر بیٹھ کر اپنا پروگرام جاری رکھتے ہیں۔ وہی شخص جو پہلے جان

محفل تھا اب اس کا وجود محفل کے لیے باعثِ شرم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے بیش تر بوڑھے پگڑیاں سنبھالتے ہوئے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلتے ہیں اور جو ضدی بچوں کی طرح وہاں اڑے رہتے ہیں ان کی مٹی پلید ہوتی ہے۔

لیکن اس ساری رنگین محفل کی رنگ رلیوں کی تہ میں کس قدر کمینگی اور درندگی کام کرتی ہے۔ رنگین پردوں کے پیچھے خوف ناک درندے چھپے رہتے ہیں۔ مرصع کرسیوں کے نیچے سانپ پھن پھیلائے جھوما کرتے ہیں۔ وہ سب سازش کے مطابق ایک ہی وقت شکار پر جھپٹتے ہیں۔

اس نے ٹٹول کر قریب پڑی ہوئی تپائی سے سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر اُسے سلگایا اور اس کے اڑتے ہوئے دھوئیں کی باریک چادر میں سے وہ مٹر کی بیلوں کی طرف دیکھنے لگا جو مڑی تڑی کیاریوں میں گڑی ہوئی چھڑیوں کے سہارے کھڑی تھیں۔

وہ ایک بے بس ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح کنارے پر ہچکولے کھا رہا تھا— اس قسم کی باتیں سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوا جاتا تھا۔

پھر اُس کے خیالات اپنی بیوی کی طرف منتقل ہو گئے۔ اس کی بابت بھی اُس نے کبھی بہت زیادہ غور نہیں کیا تھا۔ وہ بھی ایک زمانے میں اُسی کی طرح جوان تھی...... جو بن کی متوالی اٹکھیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ اکیلی بیٹھی ہوئی گیت گنگنایا کرتی تھی۔ اب وہ بھی بوڑھی تھی لیکن اس کی صورت مضمحل نظر نہ آتی تھی۔ اُس پر کسی قسم کا شدید ردِعمل نہ ہوا تھا۔ نہ اُس کا مزاج چڑچڑا تھا نہ وہ کبھی بڑبڑاتی تھی۔ وہ اپنے بچوں کے ساتھ خوش خوش رہتی تھی۔

وہ عورت کو کم عقل سمجھتا تھا۔ لیکن وہ سوچنے لگا کہ اگر اس کی کم عقلی ہی اُس کی دلی راحت کا موجب ہو رہی ہے تو پھر یہ حماقت ہی اچھی۔ ایک روز اس نے دیکھا کہ اُس کا سب سے بڑا لڑکا ماں کی گود میں سر رکھے پلنگ پر لیٹا ہے۔ یہ ایک عجیب بات

تھی۔ اُس کے سامنے اُس کا لڑکا بھیگی بلی بنا رہتا تھا۔ اب جبکہ وہ ایک بچے کا باپ بھی بن چکا تھا وہ کبھی اُس کے سامنے آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہ کرسکتا تھا۔ لیکن اپنی ماں کے ساتھ وہ اس قدر بے تکلف تھا...... یہ منظر دیکھ کر اُسے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ یہ عجیب قسم کی خوشی تھی۔ اتنا بڑا بال بچے دار لڑکا اپنی ماں کی گود میں چار سالہ بچے کی طرح سر رکھے لیٹا تھا۔

باہر کی محفلوں کی بابت تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی خود اُس کے گھر کی محفل ابھی تک اُسی طرح گرم تھی۔ بلکہ پہلے کم تھی اور اب اس کی رونق پہلے سے کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔ بھائی بہنوں کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے ناچا کرتے تھے۔ وہ ابھی تک ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے اور شور مچاتے تھے۔ کبھی کبھی جب اُسے بڑے زور زور سے پاؤں کی چاپ سنائی دیتی تو وہ چپکے سے گھر کے اندر چلا جاتا۔ دور ہی سے کسی پوشیدہ مقام سے دیکھتا کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ایک دوسرے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی باچھیں کھلیں جاتی ہیں۔ چیخیں نکلی پڑتی ہیں۔ اسی طرح بھاگ بھاگ کر جب وہ تھک جاتے ہیں تو کوئی نیا کھیل کھیلنے کی تجویزیں سوچنے لگتے ہیں۔ اُن کی ماں بھی ان کے کھیلوں میں شامل ہوجاتی ہے۔ وہ ان میں کھیلتی بھدی ہرگز نہیں دکھائی دیتی۔

جب وہ آنکھ مچولی کھیلنے لگتے۔ تو کہتے'' آؤ ماں، آنکھ مچولی کھیلیں......''

''بچو مجھ سے نہ کھیلی جائے آنکھ مچولی۔ اب میں بوڑھی ہوگئی ہوں۔ بس تم ہی کھیلو آپس میں۔''

لیکن اس کی بیٹیاں اور بیٹے کب چھوڑتے تھے اُسے۔ نتیجہ یہ کہ ماں کو بھی بھاگنا دوڑنا پڑتا۔ اُسے بھی چور بن کر دائی کے قریب آنکھیں بند کر کے کھڑے ہونا پڑتا تھا۔ اس کے چھوٹے بچوں سے لے کر بڑوں تک کسی کو یہ احساس نہ تھا کہ اب اس قسم کے کھیل کھیلنے کی ان کی عمر نہیں رہی۔ نہ انہیں خود اس بات کا احساس تھا اور نہ وہ اپنی ادھیڑ

عمر کی ماں ہی کو اس قسم کا احساس ہونے دیتے تھے۔

پہلے تو نہ کبھی اُسے تنہائی کا احساس ہوا نہ اُس نے کبھی ان باتوں پر غور ہی کیا۔ لیکن جب باہر کی دنیا کے دروازے اس کے لیے بند ہوگئے تو اس نے اپنے اندر جھانکنا شروع کیا۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ بھی اپنے بچوں کے کھیلوں میں شامل ہوجائے۔ یقیناً وہ ایسا کمزور تو نہیں تھا کہ تھوڑی دوڑ بھاگ بھی نہ کرسکے۔ وہ چلا سکتا تھا، گا سکتا تھا۔ ناچ سکتا تھا......"

وہ سوچنے لگا کہ شاید ہم بچے پیدا کر کے انہیں بھول جاتے ہیں کہ ان کی رگوں میں بھی تو ہمارا خون رواں ہے۔ ہم ہی نے انہیں جنم دیا ہے۔ شاید ہم کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ سدا بہار ہی رہتے ہیں۔ ہماری پیدا کردہ ہستیاں ہمیں کبھی بڑھاپے اور زندگی کی ناپائیداری کا احساس نہ ہونے دیں' اگر ہم ان پر یہ بات ظاہر کردیں کہ صرف ہمارا ہی اُن پر حق نہیں ہے اُن کے بھی ہم پر حقوق ہیں...... اس طرح یقیناً وہ ہمیں اپنے کھیلوں میں شامل کر لیں گے۔ ہمارے دماغ سے یہ خیال ہی نکال دیں گے کہ ہم کوئی غیر ہیں۔ ہمارا علاحدگی کا احساس ہی مٹ جائے گا۔

وہ اس بات پر جس قدر غور کرتا تھا اُسی قدر ایک نئی دنیا اُس کے سامنے روشن ہوتی جاتی تھی۔ زندگی کا یہ نیا رخ اُسے بہت ہی دل فریب نظر آرہا تھا۔ یہ کوئی بہت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ نہ تھا۔ آخر اُسے اپنی انفرادیت پر اس قدر زیادہ اصرار کیوں تھا۔

رفتہ رفتہ اُسے یقین سا پیدا ہونے لگا کہ اس بات کا حل جسے سوچ سوچ کر وہ باولا ہوا جاتا تھا اس قدر مشکل نہیں تھا۔

اتنے دنوں تک وہ گمراہ رہا۔ اب بھی وہ واپس جاسکتا تھا۔ ابھی کچھ بگڑا نہیں تھا۔ لیکن اس کے دل میں کچھ ہچکچاہٹ تھی۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنی لڑکیوں اور لڑکوں کے ساتھ کود پھاند کرنے لگے۔ وہ آج تک ان کے سامنے ضرورت سے زیادہ ہنس کر بولا تک نہ تھا۔ اب یک بیک وہ کیوں کر بدل جائے۔

وہ چپ چاپ سگریٹ کا دھواں اڑاتا رہا۔ اُس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ لیکن کچھ جرأت کی ضرورت تھی۔ وہ سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر تصور میں اپنا ناچنا کودنا دیکھ رہا تھا۔ اُس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ کتنی معمولی بات تھی۔ بس وہ لاٹھی ٹیکتا ہوا دفعتاً اپنے گھر والوں کے رو برو پہنچ جائے۔ آخر وہ اُسی کے بچے تو تھے۔ وہی ننھے ننھے بچے جو کبھی توتلی زبان میں باتیں کیا کرتے تھے۔ اب بڑے ہو گئے تو کیا ہوا۔ وہ بڑے اپنے لیے ہوں گے اس کے لیے تو وہ وہی کل کے بچے تھے۔

اندر سے زور زور باتیں کرنے ، گانے اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کارواں چلا جا رہا تھا۔ وہ خواہ مخواہ بے کارواں ہو کر اس تاریک کونے میں منہ چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ اس کے اپنے جسم کے ٹکڑے تھے وہ جو شاداں و فرحاں گیت گاتے چلے جا رہے تھے۔ آخر وہ اپنے آپ کو اس سے نوچ کر علاحدہ کیوں بیٹھا تھا......؟

اتنے میں اُس کے سب سے بڑے لڑکے کے قہقہے کی آواز بلند ہوئی......

وہ یہ قہقہہ سن کر چونک اٹھا اُس کے لڑکے کی آواز اور اُس کی اپنی آواز کس قدر زیادہ مشابہ تھی۔ اُس کے دوستوں نے خود اس بات کا کئی مرتبہ اعتراف کیا تھا کہ اُس کا لڑکا جب ہنستا تھا تو ان کو دھوکا ہو جاتا تھا...... اُس کا بیٹا کسی بات پر قہقہے لگائے جا رہا تھا۔ اُس کی آواز میں کس قدر مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا تھا۔ کوئی فکر نہیں، فاقہ نہیں، بناوٹ نہیں ایک الھڑ نوجوان کی بے باک ہنسی...... جیسے خود اُس کی روح کسی نئے جسم میں سمائی ہو...... اُسے ایک نئی مسرت کا احساس ہونے لگا۔ یہ بات بھی کس قدر خیال انگیز تھی کہ اس کی روح نئے قالب میں داخل ہو کر بالکل مطمئن اور خوش تھی...... ایک روز اس کا لڑکا بوڑھا ہو جائے گا...... اُس کی روح پھر بھی کسی نئے قالب میں اطمینان اور مسرت کے ساتھ چھپی رہے گی...... اور اس طرح ابد تک......

اُس نے خاموش درختوں کی طرف دیکھا جن کی نازک کونپلیں متحرک دکھائی دیتی تھیں۔ گہرے سکون کے بعد زندگی کے آثار دکھائی دینے لگتے تھے۔

سگریٹ کا بچا ہوا چھوٹا سا ٹکڑا اُس نے پرے پھینک دیا اور لاٹھی ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے جھک کر اپنی ٹانگوں کو ٹٹولا وہ ابھی مضبوط تھیں۔ اس کی قوتِ بینائی خاصی تھی۔ اُس کی آواز بھرپور تھی۔ وہ سب کچھ کرسکتا تھا۔

آہستہ آہستہ لاٹھی ٹیکتا ہوا مکان کے اندر والے کمروں کی طرف بڑھا...... وہ رنگین قہقہے جو دور سے ذرا مدھم سنائی دیتے تھے نزدیک پہنچ کر واضح طور پر سنائی دینے لگے۔ اس کا ذہن ان پرمسرت قہقہوں اور چیخوں میں گھل مل کر مسرور ہو اٹھا۔

وہ تاریکی سے اٹھ کر اِدھر آیا تھا۔ جوں جوں آگے بڑھتا گیا روشنی زیادہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ وہ اس کمرے کے عین قریب پہنچ گیا جہاں وہ سب ہنس کھیل رہے تھے۔ وہ دروازے کے پردے کو اٹھانے ہی لگا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

سامنے اُس کی بیوی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بڑے پلنگ پر بیٹھی تھی۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا ماں کی گود میں سر رکھے ہوئے لیٹا تھا۔ اور اُس کے ہاتھوں میں اُس کا ننھا سا بچہ تھا۔ وہ اُسے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوا میں بلند کیے ہوئے تھا۔ بچہ بہت خوش ہو رہا تھا۔ اُس کی ایک لڑکی پلنگ کے پیچھے سے آگے کو جھکی ہوئی اپنی ماں کو اپنی باہوں میں جکڑے ہوئے تھی۔ اُس کی بہو پرے کرسی پر بیٹھی سویٹر بن رہی تھی۔ ایک لڑکی ہاتھ اٹھائے کولھوں کو ہلا رہی تھی اور کہہ رہی تھی'' بھلا سادھنا بوس کیسے ناچتی ہے بتاؤں؟ یہ کہہ کر وہ بڑے بانکپن سے کمر اور بازو ہلانے لگی۔ عین اُس کے پیچھے اس کا چھوٹا بھائی کھڑا اُس کی چوٹی کپڑے کے بنے ہوئے کتے کی دم کے ساتھ باندھنے کی فکر میں تھا۔ اس کے چہرے سے غضب کی شرارت ٹپک رہی تھی۔ باقی لوگ اس کی اس حرکت کو تاڑ رہے تھے۔ وہ ناچنے والی کا دھیان بٹائے ہوئے تھے۔ تاکہ یہ شرارت کامیاب ہوسکے۔ اس کی سب سے چھوٹی لڑکی دری پر لیٹی ہاتھوں ہی ہاتھوں سے بھائی کو گرہ دینے کے اشارے کر رہی تھی۔ ادھر گرہ بندھ گئی اُدھر ہوا میں اُٹھے ہوئے بچے کی رال ٹپک کر اُس کے باپ کی ناک پر جاگری۔ ان دونوں پر ایک ساتھ ہی ایسا ہلڑ مچا

کہ بس توبہ ہی بھلی.....''

وہ باہر کھڑا کھڑا کل تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اس ہلڑ کے درمیان وہ پردہ ہٹا کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

ایک لمحہ کے لیے تو اُسی طرح شور غوغا مچا رہا۔ لیکن دفعتاً سب ایک دم چپ ہوگئے۔

بڑا بیٹا ماں کی گود سے سر ہٹا کر ایک دم سیدھا کھڑا ہوگیا۔ وہ لڑکی جس کی چوٹی سے کتا بندھا ہوا تھا ایک کونے میں دبک گئی۔ اور وہ لڑکا جس نے کتا باندھا تھا کچھ خوفزدہ سا ہو کر مودبانہ کھڑا ہوگیا۔ باقی لڑکیاں بھی آنچل سنبھالتی ہوئی ادھر اُدھر ہوگئیں۔ اُس کی بیوی بھی پلنگ سے نیچے اُتر آئی۔

کمرے میں اس قدر مکمل خاموشی طاری ہوگئی کہ اگر فرش پر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دیتی۔

وہ پہلے کبھی اس طرح دفعتاً کمرے میں داخل نہ ہوا تھا۔ سب بچے کچھ اس طرح سہمے ہوئے نظر آ رہے تھے جیسے چڑیوں کے گھونسلے میں باز آن گھسے ——

اُس نے چھپی نظروں سے سب کی طرف دیکھا۔ وہ سب نظریں جھکائے زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے اُن کے ہاتھوں سے کوئی بڑا بھاری گناہ سرزد ہوگیا۔

جیتے جاگتے انسانوں کے اس کمرے میں یہ قبرستان کی مکمل خاموشی اُس کے تنہا گوشے کی خاموشی سے کہیں زیادہ اذیت دہ اور روح فرسا تھی۔

یہ افسانہ 'افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

جھرجھری

لالہ رام لبھایا— لالہ، ہاں لالہ۔ اب وہ لالہ ہی تھا۔ کبھی لوگ اُسے مسٹر رام لبھایا کہہ کر بھی بلایا کرتے تھے...... لیکن یہ اُن دنوں کی بات ہے جب آتش جوان تھا...... مسٹر سے لالہ وہ خود بخود ہی بن گیا۔ پہلے اُس کی صورت ایسی ہی تھی جیسی کسی مسٹر کی ہونی چاہئے۔ لیکن نہ معلوم کیسے لوگوں کو جب اُس کی صورت سے لالہ پن کے آثار دکھائی دینے لگے تو اُنہوں نے اُسے لالہ رام لبھایا کہہ کر بلانا شروع کردیا— خیر، تو لالہ رام لبھایا نے جب زندگی شروع کی تو وہ جونیئر کلرک تھا۔ اور اب جب کہ وہ زندگی کے اس پار آن پہنچا تھا وہ ہیڈ کلرک بن چکا تھا...... اُسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ اُس کے آگے آسمان اور بھی ہیں...... لیکن اگر اُسے اس بات کا علم ہوتا بھی تو وہ ''آسمان'' چوں کہ اُس کے لیے نہیں تھے اس لیے ظاہر ہے کہ اُس پر اس بات کا کچھ اثر نہ پڑتا تھا۔

اس کی ساری عمر سالانہ اضافہ اور ترقی وغیرہ کی بابت سر دُھننے میں گزر گئی...... یہ کل ہی کی بات تو تھی جب وہ جونیئر کلرک مقرر ہوا۔ آج کے چھچھورے نوجوان تو کلرکی کے نام ہی سے بھاگتے ہیں۔ لیکن ان دنوں یہ ایک بہت بڑا رتبہ سمجھا جاتا تھا۔ اُس کا باپ فخر سے لوگوں کو بتایا کرتا تھا کہ اُس کا بیٹا کلرک ہوگیا ہے اور لطف یہ کہ لوگ یہ سن

کر واقعی مرعوب ہو جاتے تھے۔

لیکن ایک روز جب رام لبھایا دفتر سے واپس آ کر اپنے کوارٹر کے چھوٹے سے برآمدے میں سرکنڈوں کی گول سی کرسی پر دونوں ٹانگیں سمیٹے آرام سے بیٹھا تھا۔ حقے کی نے اُس کے داتوں میں دبی ہوئی تھی اس نے بیٹی کو پکارا ''بیٹی! چلم نہیں بھری ابھی تک؟'' ...... اُس کا نقشہ ٹوٹا جارہا تھا۔ یوں تو وہ دفتر میں بیڑیاں اور کبھی کبھی سگریٹ بھی پیا کرتا تھا لیکن اس کے دل کو تسکین نہیں ہوتی تھی۔ پہلے زمانے بھی اچھے تھے۔ جب لوگ بغلوں میں حقے دبائے اپنے کاموں پر جایا کرتے تھے۔ چاہے کھیتی باڑی کا کام ہو، مزدوری ہو، اپنی دوکان ہو، کچھ بھی ہو حقہ ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ لیکن نئی روشنی میں لوگ کے سب اصول ہی بدل گئے تھے۔ کیا ہرج تھا اگر اُس کا حقہ اس کی میز کے قریب پڑا رہتا۔ آہا! پھر دفتر بھی سورگ بن جاتا۔ اسی لیے تو اب دفتر میں اس کا جی نہیں لگتا تھا۔ اِدھر چھٹی ہوئی اور اُدھر وہ رسی تڑا کر ایسا بھاگا کہ بس گھر ہی پر دم لیا...... لیکن یہ چھوکری — اور وہ پھر آواز دینے ہی کو تھا کہ اُس کی لڑکی ہاتھ میں چلم اٹھائے برآمدے میں داخل ہوئی۔ اس نے جب اُس کی طرف دیکھا تو اُس کی آنکھیں جھپک گئیں۔

لڑکی تو چلم رکھ کر چلی گئی۔ لیکن وہ گہرے گہرے کش کھینچتے وقت اپنے خیالات میں کھو گیا۔

اب اُس کی لڑکی جوان ہوگئی تھی...... وہ عرصہ سے جوان ہو رہی تھی۔ اُس کی بیوی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن اب تک وہ سنا اَن سُنا اور دیکھا اَن دیکھا کرتا رہا۔ لیکن آج اُسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ راہِ فرار کی اب کوئی صورت باقی نہیں رہی۔

اُس کی جوان بیٹی کے پاؤں کی دھمک سے زمین ہلتی دکھائی دیتی تھی۔ اُس کا جسم سڈول اور بھرپور ہو چکا تھا۔ ہر چند وہ سینہ دُہرے دوپٹے تلے چھپائے رکھتی تھی۔ چلتی بھی تو ذرا آگے کو جھک کر لیکن اُس کی چھاتیاں...... وہ انہیں نوچ کر کہاں پھینک دے ان کا ابھار چھپائے نہ چھپتا تھا۔ اُس کے کپڑے بالکل سادے ہوتے تھے، مانگ بالوں کی عین بیچ میں سے نکلی ہوتی تھی۔ آنکھیں کاجل کی سیاہی سے بے نیاز رہتی

تھیں۔ زبان پر تالا پڑا رہتا' نظریں زمین میں گڑی رہتی تھیں..... کوئی شوخی، کوئی شرارت، کوئی بناؤ سنگھار، کوئی اٹکھیلیاں نہیں۔ لیکن شباب چیخ چیخ کر اپنا اعلان کر رہا تھا..... اور یہ شور دن بدن بڑھتا گیا۔

لالہ رام لبھایا بھونچکا سا رہ گیا۔ زمانہ اتنی جلدی کروٹ بدلتا ہے؟ آنکھ جھپکتے بچپن شباب، شباب پیری میں تبدیل ہوجاتا ہے؟ اسی کوارٹر میں اس کی بیوی نئی نویلی دلہن بن کر آئی تھی۔ اب وہ چار بچوں کی ماں، ڈھیلے ڈھالے پیٹ اور چپاتی کی طرح لٹکتی ہوئی چھاتیوں والی عورت تھی..... لیکن رام لبھایا یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اک دم اس قدر بوڑھی کیوں کر ہوگئی۔ جب وہ اُسے بیاہ کر لایا تھا تو شب و روز پروانے کی طرح بیوی کے اردگرد منڈلایا کرتا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی دیہاتی عورت تھی۔

سامنے سفیدی پھری مٹی کے بنے ہوئے کرشن جی کھڑے بنسری بجا رہے ہیں۔ ان کے تاج میں لگا ہوا مور کا پر بھدے سے سبز رنگ سے بنایا گیا ہے۔ مسخروں نے پاؤں میں گھنگھرو باندھ دیئے ہیں۔ لیکن کرشن جی گھنگھرو تو نہیں باندھتے تھے پاؤں پر۔ ممکن ہے کچھ اور ہی ہو۔ پھولوں کے گجرے ہوں شاید۔ آخر اس زرد رنگ سے انسان کیا سمجھ سکتا تھا؟..... اور پرے وہی پرانی تصویر تھی۔ وہ بے چارے کوئی رشی جی تھے۔ ان کی تپشیا بھنگ کرنے کے لیے ایک پری زمین پر اُتری اُس نے رشی جی کے سامنے رقص کیا۔ رشی جی عورت کے تیرِ نگاہ کے گھائل ہوگئے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی اب رشی کو ہوش آیا..... پری بچی کو آگے بڑھا کر اُس کی گود میں دے دینا چاہتی تھی رشی جی ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر اُسے اپنے سے دور رہنے کی ہدایت کر رہے تھے اور خود جنگلوں کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔

اور تو اور پاندان کے قریب مٹی کا بنا ہوا ایک بینگن بھی پڑا تھا یہ بینگن بالکل اصلی کی مانند نظر آتا تھا۔ اس کی بیوی تو واقعی اس کو بالکل اصلی بینگن سمجھ بیٹھی تھی۔ اور جب اُسے معلوم ہوا کہ وہ اصلی بینگن نہیں بلکہ مٹی کا بنا ہوا ہے تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

اُن دنوں جب کبھی اُس کے دفتر کے دوست آواز دے کر بلاتے ''مسٹر رام لبھایا! آیئے نا! ذرا گھوم آئیں......''

اُس وقت وہ اپنی بیوی کو گود میں بٹھائے ہوتا تھا۔ اُسے ان دوستوں پر بہت سخت غصہ آتا تھا۔ لیکن قہرِ درویش بجانِ درویش بے چارا چل کھڑا ہوتا۔ اگر نہ جاتا تو دوسرے روز اُسے زن مرید کہہ کر آوازے کسے جاتے۔

وہ اس زمانہ کی یاد مکمل طور پر تازہ کرسکتا تھا۔ وہ گڑ کی مکھی کی طرح ہمیشہ بیوی سے چپکا رہتا تھا۔ اور پھر اُس کی بیوی نے بچے دینے شروع کیے پے در پے جیسے زلزلے کا جھٹکا لگنے پر پہاڑ سے چٹانیں لڑھکنے لگیں۔

پہلی مرتبہ جب اُس کی بیوی کا پیٹ پھول گیا تو وہ بہت خوش ہوا وہ ایک دبلا پتلا اور دبّو سا شخص تھا۔ اُس نے زندگی میں نہ کبھی کبڈی کھیلی تھی نہ کشتی لڑی تھی۔ نہ کبھی کوئی نظم کہی تھی نہ کوئی تصویر بنائی تھی۔ اُس نے کوئی بھی ایسا کام نہ کیا تھا جس سے لوگوں میں واہ واہ ہوتی لیکن اُس نے اپنی عورت کا پیٹ بڑا کر دیا تھا۔

اسی طرح وہ ایک کرسی پر بیٹھا حقے کی نے دانتوں تلے دبائے دھوئیں کے بادل اڑایا کرتا تھا اور کنکھیوں سے گھر میں چلتی پھرتی بیوی کے پیٹ کی طرف دیکھا کرتا تھا جس کی جلد خوب تن کر چکنی سی دکھائی دینے لگی تھی۔

ایک روز اس کی بیوی نے ایک بچہ اُگل دیا...... وہ بے تابی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ پیٹ کا پھیلاؤ دیکھ کر تو اُسے خیال پیدا ہوتا کہ اس میں سوائے لڑکے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے ہاں لڑکی ہوئی ہے تو اگرچہ اُس کے دل کو خاص خوشی محسوس نہ ہوئی لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مایوس بھی نہیں ہوا۔ یار زندہ صحبت باقی۔

یہی وہ پہلی لڑکی تھی جو اب خود بچے دینے پر تلی ہوئی تھی...... پہلے پہل یہ بچی کس قدر معصوم اور بے ضرر ننھی سی جان نظر آتی تھی۔ وہ اس کے لیے بازار سے لوہے

کی جالی کا بنا ہوا مضبوط پنگوڑا لے آیا۔ اس کی بیوی نے ایک چھوٹا سا گدیلا سی کر پنگوڑے میں بچھا دیا۔ حقیقت یہ تھی اس کی بچی ان کو ذرا دق نہ کرتی تھی۔ نہ وہ روتی تھی نہ چیختی تھی نہ چلاتی تھی۔ بس چپکے سے پنگوڑے میں پڑی ہاتھ پاؤں چلایا کرتی تھی اور چھت کی طرف نہ معلوم کیا کچھ دیکھ دیکھ کر خود بخود ہی ہنسے جاتی تھی۔ اُس کی بیوی نے کئی مرتبہ اس بات کا ذکر کیا کہ اُن کی بچی بہت ہی اچھی تھی۔ اور پھر بھاگوان بھی کیوں کہ جب وہ پیدا ہوئی تو کچھ ہی روز بعد اُس کی تنخواہ میں بھی کچھ اضافہ ہوگیا۔ بیوی نے جب یہ خوش خبری سنی تو کہنے لگی "ایشور بڑا دیا لو ہے۔ وہ پتھر کے کیڑے کو بھی کھانے کو دیتا ہے۔ یہ بچی اپنا نصیب اپنے ساتھ لائی ہے۔ اِدھر یہ پیدا ہوئی اُدھر تنخواہ میں ترقی ہوگئی۔

وہ اُسے بھاگوان ہی سمجھتے رہے۔ وہ پنگوڑے میں پڑی رہنے والی بے ضرر بچی دھواں بن کر اوپر کو اٹھنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ سارے آسمان پر چھا گئی۔ وہ ایک خاموش آندھی بن کر اُنہیں ڈرانے لگی۔ اتنے وسیع و عریض آسمان سے وہ خوف ناک آنکھوں سے اُن کی طرف گھورنے لگی اس کے جبڑے ہلنے لگے۔ جیسے وہ ان کو اپنی آنکھوں میں سے نکلنے والی جوالا میں بھسم کر کے اُن کی راکھ تک اڑا دے گی یا جیسے وہ اپنے ہلتے ہوئے جبڑوں میں پیس کر رکھ دے گی۔

وہ سہم گئے وہ ہر طرف پھیلی ہوئی تاریکی میں اندھوں کی طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ لحظہ بہ لحظہ طوفان بڑھتا آ رہا تھا۔ اُس کی آمد بتدریج بھی تھی اور دہشت ناک بھی......

لالہ رام لبھایا کو اُس دن زندگی میں پہلی مرتبہ معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ وہ تھوڑی دیر تک حقہ پیتا رہا اور اُس کے ساتھ ساتھ سوچتا بھی رہا۔ بڑی دور دور تک دماغ دوڑایا لیکن اس سوچ بچار کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ پھر اُس نے حقہ سرکا کر اک طرف رکھ دیا اور سلیپر چٹخاتا ہوا باورچی خانے کی طرف بڑھا۔ صحن میں اُس کے چھوٹے تین

بچے کھیل رہے تھے۔ اس کی بیوی نے بچے بڑی فراخ دلی سے دیئے تھے۔ لیکن ان میں سے بیش تر چھوٹی عمر ہی میں مر گئے۔ اس وقت اُس کی بڑی بیٹی لوکی کو کدو کش پر رگڑ رہی تھی۔ نیچے تھالی میں لوکی کے بل کھاتے ہوئے لچھے جمع ہو رہے تھے۔ گویا آج کدو کا رائتہ تیار ہو رہا تھا۔ اُسے کدو کا رائتہ پسند تھا۔ بڑی بیٹی نے کدو کش دونوں پیروں سے دبا رکھا تھا۔ اُس کی ساری ذرا اوپر کو کھسک گئی تھی۔ وہ اس کے ٹخنے اور گول گول پنڈلیوں کے نصف حصے دیکھ سکتا تھا۔ اسی سے وہ اس کے جسم کی صحت اور بھوک کا اندازہ لگا سکتا تھا۔ بیٹی کی آنکھوں سے آنکھیں ملانے کی اُسے ہمت ہی نہ ہوئی۔ وہ چپکے سے دھوتی سنبھالتا ہوا باروچی خانے میں گھس گیا۔

اس کی بیوی رائتے کے لیے دہی بلو رہی تھی۔ یہ اُس کے قریب چپکے سے ایک چوکی پر بیٹھ گیا اور پھر چولھے میں جلتی ہوئی لکڑی کی کھپچی میں سے ایک بے ڈول سا تنکا توڑ کر کان کریدنے لگا۔ اُس کی بیوی نے دہی میں تھوڑا سا دودھ ملا دیا۔

''بھئی یہ کیا کرتی ہو؟''

بیوی نے اُس کی صدائے احتجاج کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا ''دہی کھٹا ہے دودھ ملانے سے اس کا مزا بہت اچھا ہو جائے گا......''

اس کا چھ سالہ لڑکا اندر آ گیا۔ اُس نے سر پر ایک لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی تھی۔ وہ باپ کو ٹوپی دکھانے آیا تھا۔ باپ کے دماغ میں اور ہی طوفان برپا تھا۔ اُس نے بیوی کے دو پٹے کے آنچل سے اس کی ناک صاف کر دی ''جاؤ بیٹا کھیلو...... ہاں بھئی واہ واہ کیا شان دار ٹوپی ہے...... جاؤ......''

''ہائے رام یہ کیا کیا آپ نے میرے دوپٹے سے اس کی ناک پونچھ ڈالی۔ ابھی نیا نکال کر سر پر رکھا تھا...... آج ہمارے یہاں شیلو کی ماں آنے والی ہے۔''

''شیلو کی ماں؟''

''ہاں آ رہی ہے وہ اس کے ساتھ اور عورتیں بھی ہوں گی......'' پھر اس نے بیٹی

کو آواز دے کر کہا" لا رے لوکی مجھے دے دے تو منہ ہاتھ دھوکر کپڑے پہن لے نا۔"

رام لبھایا کا دل کھٹکا۔ کچھ دریافت کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ "کیا کوئی خاص بات ہے۔"

"بھئی آپ سا غافل بھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ وہ لڑکی کو دیکھنے کے لیے آرہے ہیں...... آخر آپ اتنی گرمی میں چولہے کے پاس کیوں بیٹھے ہیں...... ہائے رام آپ نے دفتر سے آکر کچھ کھایا بھی تو نہیں، کیا کھائیں گے...... مجھے آج بہت سا کام کرنا ہے۔ مہمانوں کے لیے مٹھائی بھی منگوانی ہوگی۔ تھوڑی سی مٹھائی ہو، چائے ہو اور ساتھ کچھ نمکین چیز...... سموسے یا دال موٹھ......"

وہ اٹھ کر چلا آیا۔ اُسے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اُس کی بیوی ایک عملی عورت تھی۔ وہ نہ صرف سوچتی تھی بلکہ ہمت سے کچھ کام بھی لیے جارہی تھی۔ وہ دوبارہ اپنی سرکنڈے کی کرسی پر آن بیٹھا۔ کجلائے ہوئے اُپلے کے ٹکڑوں کو ہلایا اور پھر لمبے لمبے کش لینے لگا۔ اُس نے دفتر میں برسوں بڑی کامیابی سے کام کیا تھا۔ بڑا صاحب ہمیشہ اس سے خوش رہتا تھا۔ یہ اُسی کی نظرِ عنایت کا کرشمہ تھا کہ وہ بیالیس برس کی عمر ہی میں ہیڈ کلرک بن گیا۔ دفتر میں کوئی بات ہو بس ہیڈ کلرک صاحب سے پوچھو۔ وہ دفتر کا پرانا کام کرنے والا تھا۔ اُس سے کون سی بات پوشیدہ تھی اور اپنے نیچے کام کرنے والے جونیئر اور سینئر کلرکوں کو وہ سالہا سال تک پڑھا سکتا تھا لیکن اپنے گھر میں اُس کی ایک نہ چلتی تھی۔

وہ گھریلو معاملات میں تھا بھی بدھو— جب بیوی نے اُسے "غافل" کہا تھا تو در اصل وہ اُسے اول درجے کا احمق کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس نے یہ بات کہی نہیں۔ وہ پتی برتا استری تھی نا۔ لالہ رام لبھایا کو اپنی بے بضاعتی کا شدید احساس ہونے لگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکیوں کی شادی پر والدین کے گھر اُجڑ جاتے ہیں۔ پہلے زمانے میں لڑکیاں بکتی تھیں۔ اب لڑکے بکتے ہیں۔ لڑکیوں میں پہلے تو دنیا بھر کے اوصاف تلاش کرتے

ہیں۔ بہت حسین و طرح دار ہو، کھانا پکانے اور سینے پرونے سے بخوبی واقف ہو۔ ہنس مکھ اور چتی برتا ہو۔ پڑھی لکھی ہو، گانا بجانا بلکہ اگر ہو سکے تو ناچنا بھی جانتی ہو۔ اور اگر سب شرائط پر لڑکی پوری اُترے تو پھر آخری سوال یہ کیا جاتا ہے کہ ''ہاں صاحب! لڑکی کے ساتھ کیا دو گے؟''

یہ باتیں سوچ سوچ کر رام لبھایا کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ شاید اُس کی بیوی نے ان سب باتوں پر غور کر لیا ہو اور اس کا حل بھی نکال لیا ہو......

اُس روز جب وہ سیر کرتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اپنے خیالات میں غلطاں۔ جب وہ اسٹیشن پر پہنچا تو اُس نے سوچا پلیٹ فارم پر کے بک اسٹال تک چکر ہی لگا آؤں۔ پلیٹ فارم پر پہنچ کر لوگوں کی گہما گہمی میں چند لمحوں کے لیے اس کا دل بہل گیا۔ وہ بک اسٹال پر رسائل اور کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا۔ پھر وہ بڑے پل پر چڑھ گیا۔ رات ہو چکی تھی۔ تاروں کی مدھم روشنی میں ریلوے کی لائینس دور دور تک چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ بل کھاتی، پھیلتی اور سمٹتی ہوئی لائنوں کو دیکھ کر اُسے زندگی میں پہلی مرتبہ اس بات کا احساس ہوا کہ ان لوہے کی لائنوں کا بھی ایک خاص حسن ہے اِدھر اُدھر بے کار کھڑے ہوئے ڈبوں سے بہت پرے آسمان میں اٹھے اونچے اونچے کھمبوں پر سگنل کی سرخ سرخ روشنی کس قدر بھلی معلوم ہوتی تھی۔

وہ بہت دیر تک اس جگہ کھڑا رہا۔ اُسے مدھم روشنی میں ادھر سے اُدھر آتے جاتے ریلوے کے بھاری بھرکم انجن جان دار دکھائی دیتے تھے۔ اُن کی آوازیں ایسی تھیں جیسے کوئی عظیم الجثہ جانور بھاری بوجھ تلے ہانپ رہا ہو۔ لیکن یہ آہنی جانور بھی مصروف تھے۔ انہیں دن رات کام کرنا پڑتا تھا۔ انسان نے زندگی کی تگ و دو میں بے جان چیزوں کو بھی شامل کر لیا تھا۔ لوہے، بھاپ اور بجلی کو بھی انسان کے کاموں سے فرصت نہ تھی۔ اور انسان نے ''کیوں اور کہاں'' کہنا تو چھوڑ ہی دیا تھا۔ پہلے اُنھوں نے مشینوں کو اپنا غلام بنایا اور پھر وہ خود مشینوں کے ہاتھوں غلام بن کر رہ گئے۔ لیکن یہ سب

کچھ کس قدر بوجھل اور بے کیف معلوم ہوتا تھا...... وہ فلاسفر نہ تھا۔ لیکن مختصر پینے پر ہر شخص فلاسفر ہوتا ہے۔ سڑکوں پر چھڑکاؤ کرنے والا سقہ، مکئی بھوننے والا بھڑ بھونجہ، چنے اور کلچے بیچنے والا دکان دار غرض ہر کسی کا کوئی نہ کوئی اپنا ہی فلسفہ ہے۔ وہ کئی مرتبہ فلاسفروں کی طرح سوچتے اور اُنہیں کی طرح باتیں بھی کرتے ہیں۔

جب وہ گھر پہنچا تو بیوی کا چہرہ کچھ اُترا ہوا تھا۔ بچے روٹی کھا چکے تھے۔ اُس وقت وہ صحن میں چار پائیوں پر بیٹھے بڑی بہن سے کہانی سننے پر اصرار کر رہے تھے۔ وہ سیدھا باورچی خانے میں چلا گیا۔ بیوی بھی اُس کے ساتھ ہی چلی آئی اُس نے اُس کے چہرے کی کیفیت گھر میں داخل ہوتے ہی بھانپ لی تھی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ وہ خود ڈر رہا تھا۔ وہ چپ چاپ روٹی کھانے لگا۔ اُس کی بیوی نے بھی کوئی بات نہیں کہی چپ چاپ پنکھا جھلتی رہی۔ کبھی کبھار پوچھ لیتی " روٹی دوں؟...... رائتہ لیجئے گا......؟"

روٹی کھانے کے بعد وہ حقہ لے کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ جب اس کی بیوی آئی تو اس نے برآمدے کی بتی بجھا دی تاکہ باہر سڑک پر آنے جانے والوں کی نظر ادھر نہ پڑے۔ اُس کی بیوی چپ چاپ دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھ گئی۔

اُسے پہلے کے دن یاد آگئے جب وہ اپنی بیوی کو کبھی آرام سے نہ بیٹھنے دیتا تھا۔ کبھی اس کی چوٹی کھینچتا، کبھی ان پر چٹکی لیتا۔ کبھی اُسے چھاتی سے لگا کر بھینچ لیتا۔ لیکن ازدواجی زندگی میں سب سے راحت انگیز دور وہی ہوتا ہے جب پہلا طوفان کم ہوجاتا ہے۔ بعد میں میاں بیوی میں وہ جوش رہتا ہے نہ وہ گرمی، نہ جسم آگ کی طرح جلتا ہے۔ نہ دل مچلتا ہے۔ پھر دونوں میں ایک راحت انگیز سمجھوتہ اور روح پرور یگانگی پیدا ہوجاتی ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پچھلی شرارتوں پر لعنت ملامت کرتے ہیں۔ کچھ جھینپتے ہیں کچھ لطف اندوز ہوتے ہیں۔

اس دور زندگی کے بعد وہ آزمائے ہوئے دوستوں کی طرح ایک دوسرے کی

محبت اور اعتماد میں زندگی کی نہایت پُر امن اور سرور انگیز گھڑیاں گزارنے لگتے ہیں۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ان گھڑیوں کے سامنے زندگی کے پہلے طوفانی اور ہنگامہ خیز لمحے کچھ حقیقت نہیں رکھتے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ آخری دور کو پہلا دور ہی جنم دے سکتا ہے۔

جب وہ حقہ گڑگڑا رہا تھا اور اس کی بیوی سڑک سے پرے تاریکی میں چند چلتے پھرتے سایوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُن کے دل ایک ہی تال پر دھڑک رہے تھے۔ رام لبھایا نے اپنی ہمت استوار کرنے کے لیے خوب گہرا کش لیا اور کھانس کر بولا۔

''وہ آئی تھیں؟''

''جی ہاں''

وہ چپ ہوگیا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ وہ خود ہی باقی بات کہہ دے لیکن اُس کی بیوی بھی شاید اسی بات پر تلی ہوئی تھی کہ اگر وہ کچھ پوچھے تو وہ جواب دے۔ وہ پھر حقہ گڑگڑانے لگا۔ یہ خاموشی بڑی اذیت رساں محسوس ہونے لگی اُس نے پھر کر ہمت باندھی'' تو پھر کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔''

اس نے سوالیہ نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن اُس کا دھیان دوسری طرف تھا۔ کہنے لگی'' لڑکی کو دیکھ لیا ہے اُنہوں نے میں نے خاطر و تواضع بھی کردی تھی۔ لیکن کچھ امید نہیں۔''

''کیوں امید کیوں نہیں؟''

وہ چپ رہی۔

''بھئی جب لڑکی میں کوئی عیب نہیں اور پھر تم نے اُن کی خاطر بھی اچھی طرح کردی تو اور کیا چاہیے۔ تم بھی بڑی وہمی ہو۔ کیا انہوں نے انکار کردیا؟ بولو، کہونا۔ کیا اُنہوں نے تم سے کچھ کہہ دیا؟''

''آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں۔ دوسرا کچھ کہے تب ہی انسان کو پتہ چل سکتا ہے۔ ان کی صورت ہی سے دل کا حال ظاہر تھا۔''

اس بات پر رام لبھایا گرم ہوگیا۔ ''صورت سے ظاہر ہوگیا تو جائیں بھاڑ میں...... ہماری بیٹی کسی اور کے پلّے بندھ جائے گی۔ آخر ہمیں فکر بھی کیوں ہو۔ جب ہماری بیٹی بے داغ، نیک چلن اور سگھڑ ہے تو پھر میں تو یہی کہوں گا اُسے لڑکوں کی کچھ کمی نہیں۔ ایسی لڑکی ملتی بھی ہے کہیں؟''

''آپ تو پھر وہی باتیں کرتے ہیں۔ کتنی مرتبہ تو لوگ دیکھ گئے ہیں آخر بتاؤ کسی نے ہاں بھی کہی؟''

اب اُس کے چپ رہنے کی باری تھی۔ وہ جلدی جلدی حقّے کے چھوٹے چھوٹے کش لینے لگا۔ اور بڑی تیزی کے ساتھ وہ کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ کام یوں نہیں ہوا کرتے۔''

اس نے حقّے کی نے پرے ہٹا کر تعجب سے پوچھا۔ ''اچھا تو اور کیسے ہوا کرتے ہیں میری گنّو؟''

''چلیے بس آگئے اپنی باتوں پر...... ہائے کب سوچو گے تم۔ لڑکی کو دیکھ کر تمہیں ڈر نہیں لگتا۔ اور پھر اوپر سے زمانہ جانتے ہو کون سا جارہا ہے وہ تو کہئے ہماری بیٹی ہے ہی گئو۔ اور لڑکیوں کو دیکھو کیسی بے شرم ہیں۔ آنکھیں پیشانی پر جڑی ہوئی۔''

اب اُس کی بیوی خفا ہو رہی تھی۔ کیوں کہ جب وہ اُسے تم کہہ کر مخاطب ہوتی تھی تو وہ سمجھ جاتا تھا کہ اب خیر نہیں۔ اب اُس نے نرمی اختیار کی'' بھئی دیکھو نا! تم خود بہت سیانی ہو۔ میں تو پرماتما کا ہزار ہزار شکر ادا کرتا ہوں کہ میرے پلے تم بندھیں۔ اب تم نہ مانو...... تم ایسی بھاگوان عورت کے قابل ہی کہاں ہوں میں ......''

اُس کی بیوی اُس کے الفاظ کی حقیقت کو خوب سمجھتی تھی۔ لیکن وہ اس ابلتی دال کی طرح جس پر ٹھنڈے پانی کے چار چھینٹے دے دیئے گئے ہوں فوراً نیچے بیٹھ جاتی

تھی۔

رام لبھایا مسکرایا" اب تم جو کہو وہی کروں۔ تم مجھ پر خفا ہوتی ہو اب کہہ دو بھگوان کو سامنے جان کر کبھی میں نے تمہیں کوئی بری بھلی بات بھی کہی۔ کبھی تمہارا ہاتھ بھی روکا میں نے....."

"میں نے یہ کب کہا" اُس کی بیوی کی آواز میں کچھ رقت سی پیدا ہوگئی۔

"آپ بس میرا ہاتھ بٹائیے نا، باقی میں کرلوں گی سب کچھ۔"

"ہاں ہاں، بھئی تمہارا ہاتھ بٹانا کوئی غیر کا ہاتھ بٹانا تو نہیں نا؟"

لیکن اس کے بعد جب اُس کی بیوی نے تجویز پیش کی تو وہ دم بخود رہ گیا۔ وہ تجویز یہ تھی:

چند دنوں کے لیے کہیں سے مانگ کر اعلیٰ فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان لایا جائے۔ چینی کے برتن ہوں، دو نوکر ہوں۔ اگر سامان مانگے سے نہ ملے تو کرایہ پر لایا جائے۔ اور پھر دروازے پر ایک بھینس اور ایک گائے بندھی ہوئی ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

بیوی نے اس بات پر زور دیا کہ ظاہراً ٹیپ ٹاپ بھی تو ہونی چاہئے۔ آخری اسی ترکیب پر عمل کیا گیا۔ ایک مہینے کے لیے کرایہ پر بہت اعلا فرنیچر، دریاں، چینی کے برتن، دو نوکر بھی رکھ لیے گئے دیہات سے ایک رشتہ دار کی ایک بہت اعلا بھینس لا کر دروازے پر باندھ دی گئی۔ بچوں کو ہر وقت نئے کپڑوں میں لپیٹے رکھا۔ بچے بے چارے ، حیران کہ آخر یہ کیا سے کیا ہوگیا۔

یہ ترکیب کام کرگئی۔ اب جو لوگ لڑکی کو دیکھنے کے لیے آئے۔ انہوں نے لڑکی کو بھی دیکھا بھالا۔ لیکن لڑکی سے زیادہ اُن کی نگاہیں ساز و سامان پر پڑتی رہیں..... اور ان کو لڑکی بہت پسند آئی۔ اِدھر اُدھر کی ضروری اور غیر ضروری بات چیت کے بعد شادی کا دن بھی مقرر ہوگیا۔

ایک روز جبکہ اُس کے گھر پر "ویلکم" کے تختے لگائے جارہے تھے کیلے کے

درختوں کے بڑے بڑے دروازے بنائے جارہے تھے۔ رنگ برنگ کے کاغذوں کی جھنڈیاں رسیوں سے چپکا کر اُنہیں اِدھر اُدھر باندھا جارہا تھا۔ اُس نے ایک جگہ سے تین ہزار روپیہ قرض لیا۔ گھر آ کر جب اُس نے روپے بیوی کے حوالے کردیئے تو اُس کا دل بیٹھ گیا۔ گھر کی ساری پونجی کے ساتھ تین ہزار روپیہ قرض۔ یہ شادی ہوجائے گی وہ سرخ رو ہوجائیں گے۔لڑکی اپنے گھر میں جا بسے گی...... اور اگر وہ اپنے ساتھ اچھا جہیز گہنے اور نقدی لے کر جائے گی تو غیروں کے گھر میں بھاگوان کہلائے گی۔ ورنہ ...... اِدھر وہ کولھو کے بیل کی طرح تھکے ماندے قدموں سے آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اور یہ قرضے کا بوجھ اُس کے سینے پر دن بدن زیادہ ہوتا جائے گا۔

اُس رات اُسے نیند نہ آئی۔ بُرے بُرے خواب آتے رہے۔ اس نے جو ساری عمر اس قدر محنت کی تھی کیا اس کا یہی نتیجہ تھا؟ اسے نہیں معلوم نہ وہ کب سویا۔ سویا کیا بے ہوش ہوگیا۔

جب صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ اُس کی بڑی بیٹی کو بخار ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ دوا پلائی گئی۔ تیمار داری ہونے لگی۔ شادی میں زیادہ دن نہ رہ گئے تھے۔ اس لیے اُن کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اچھی ہوجائے۔

لیکن بخار دن بدن بڑھتا چلا گیا۔ پہلے تو کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ یہ بخار کون سا تھا۔ لیکن بالآخر ڈاکٹر نے کہا کہ میعادی بخار ہوگیا ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں۔ تیمار داری کیے جاؤ— تیمار داری کی گئی دن رات والدین بیٹی کے سرہانے سے لگے بیٹھے رہتے...... لیکن وہ جاں بر نہ ہوسکی۔

سب لوگ اُس کی موت پر انتہائی افسوس کا اظہار کر رہے تھے کیسی بے وقت کی موت تھی۔ چڑھتی جوانی میں جب کہ اُس کے ہاتھ منہدی سے رنگے جارہے تھے یم راج نے اُسے آن دبوچا۔ پرماتما کے کاموں میں واقعی انسان کو کچھ دخل نہیں۔

اُنہوں نے اپنی لاڈلی گئو بیٹا کو دوسری ہی پالکی پر بٹھایا اور شمشان کی طرف چل

کھڑے ہوئے۔ وہ ہرا بھرا جسم جسے سینچ سینچ کر انہوں نے اس قدر بڑا کیا تھا لکڑیوں پر رکھ کر اُسے آگ دکھادی۔

جب شعلے سرد ہوگئے وہ لوگ واپس گھر کو لوٹ آئے۔ شادی کے ہنگامے موت کے نوحوں میں تبدیل ہوگئے۔ وہ رات کس قدر بوجھل اور تاریک تھی۔

رام لبھایا برآمدے میں اپنی سرکنڈے کی کرسی پر حسب معمول ٹانگیں سمیٹے بیٹھا تھا۔ حقہ قریب ہی پڑا تھا۔ لیکن اُس کی چلم ٹھنڈی پڑی تھی۔ پہلے وہ اپنی بیٹی کو آواز دے کر چلم بھروا لیا کرتا تھا۔ وہ کھوئی کھوئی نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا۔ آخر یہ بے چاری اتنی بڑی کیوں ہوئی کیوں ایسی جوان ہوئی۔ کیوں نہ بچپن ہی میں مرگئی۔ جیسے اُس کے اور بھائی اور بہنیں مرگئی تھیں۔ وہ اس وقت پیدا ہوئی جب وہ جوان تھا جب وہ مسٹر رام لبھایا تھا۔ اُس وقت تو وہ ان کے لیے ایک ننھا سا کھلونا تھی۔ لڑکیوں کی اتنی پروا ہی کہاں کی جاتی ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ چپ رہی۔ اُس نے کبھی کسی شے کے لیے ضد نہیں کی۔ جب بچی ہی تھی تب بھی وہ کسی کو دق نہ کرتی تھی۔ بھوکی ہو یا پیاسی آرام سے اپنے لوہے کے پنگوڑے میں لیٹی مسکرایا کرتی۔ اور وہ لوہے کا پنگوڑا اب تک گھر میں موجود تھا۔ اس کے بعد وہ پنگوڑا اُس کے بھائی بہنوں کے کام آتا رہا۔

بے چاری جوان ہوئی تو اُس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں رکھا دروازے یا کھڑکی میں سے تاک جھانک نہیں کی۔ اپنے والدین اور بزرگوں کا پورا لحاظ اور ادب کیا۔ بچپن میں سر اٹھا کر نہ چلی اور جب سے جوان ہوئی نظر اٹھانا اُسے بار ہوگیا۔

آخر اُس پر بھی تو اسی طرح جوبن آیا تھا جیسے اور لڑکیوں پر آتا ہے۔ اُس کا دل بھی تو محبت کے لیے اسی طرح تڑپتا ہوگا جیسے اور لڑکیوں کا۔ وہ بھی تو نسوانیت سے مجبور ہوکر چاہے جانے کی تمنا کرتی ہوگی۔ لیکن اُس نے ماں باپ کی آبرو کا خیال رکھا۔ اور جب کہ اس کے والدین اپنا آخری فرض پورا کرنے والے تھے وہ چل بسی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پرلوک کو چل دی۔ رام لبھایا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

دماغ ہلکا ہونے کے بعد اس کے دل کے ایک گوشے سے اطمینان اور شادمانی کی ایک ننھی سی شعاع بلند ہوئی اور وہ بلند سے بلند تر ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس نے اُسے اچھی طرح پہچان لیا' سمجھ لیا، محسوس کر لیا۔ اُس نے ایک جھرجھری سی لی...... اب اُس پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ اُس کی پونجی بچ گئی تھی' وہ تین ہزار روپیہ فوراً واپس کر دے گا وہ تباہ نہ ہوگا۔

دفعتاً اس کا دل زور سے دھڑک گیا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اور چوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

کاغذ کی جھنڈیاں خاک میں مل گئی تھیں' خوش آمدید کے تختے اُلٹ گئے تھے۔ کیلوں کے درختوں کے دروازے ایک طرف گرے پڑے تھے۔

ہر شے اُداس، خاموش، بے حس، بے کیف—

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

آزاد فاقہ

1939ء میں جب کہ دوسری جنگِ عظیم کا آغاز ہوا میں روزگار کی تلاش میں آوارہ پھرا کرتا تھا۔ جنگ عظیم شروع ہوجانے کے بعد تو روزگار کی کچھ کمی ہی نہ رہی۔ لیکن میں نے انہیں دنوں بلیو بلیک روشنائی بنانے کا کام شروع کردیا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے یہ کام پندرہ روپے کے سرمایہ سے شروع کیا تھا۔ جس بازار میں ہم رہتے تھے وہ شہر کا بہت اہم بازار نہیں تھا۔ لیکن میرے کام کے لیے یہ جگہ بری نہیں تھی۔

پہلے پہل اس کام میں کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ اکیلا کام کرنے والا تھا۔ خود ہی روشنائی تیار کرتا۔ خود ہی شیشوں میں بھر کر ڈبوں میں بند کرتا اور پھر خود ہی دوکان داروں کے پاس اُنہیں بیچنے کے لیے جاتا۔ لیکن ان دنوں ہندوستان کی بنی ہوئی سیاہیوں کو پوچھتا ہی کون تھا۔ لیکن جب جنگ کی وجہ سے باہر کا بنا ہوا مال آنا ناممکن ہوگیا تو پھر دیسی چیزیں بھی مارکٹ میں کھپنے لگیں۔

ہاتھ بٹانے کے لیے میں نے دو نوکر بھی رکھ لیے۔ گھر کی حالت بھی سدھر گئی۔ اگرچہ ایک طرف گرانی کی وجہ سے گھر کے اخراجات بہت بڑھ گئے تھے۔ لیکن دوسری جانب آمدنی بھی امید سے بڑھ چڑھ کر ہو رہی تھی۔

شام کے وقت گلی محلہ کے لوگ بھی میری دوکان پر وقت گزارنے کے لیے آن بیٹھتے تھے ان میں دفتروں کے وہ بابو بھی تھے جنہیں پہلے میں رشک کی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ خود میں نے اُن سے کئی مرتبہ کہا تھا کہ بھئی مجھے بھی کوئی چھوٹی موٹی نوکری دلوا دو۔ لیکن اب وہ مجھے رشک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں اُن کی نسبت زیادہ آرام سے ہوں۔ وہ مجھے حقیر مخلوق نظر آنے لگے۔

میرا کاروبار اب ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ میں نے دو تین مرتبہ وقت نکال کر اِدھر اُدھر کے شہروں کا چکر لگا لیا اور مجھے معلوم ہوا کہ اگر باقاعدہ گھوم پھر کر یہ کام کیا جائے تو اچھا خاصہ روپیہ کمایا جاسکتا ہے۔

چناں چہ ایک روز شام کے وقت چند دوست حسب معمول میری دوکان میں جمع ہوئے تو میں نے اُنہیں بتایا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہاں دفتر میں ایک پڑھا لکھا نیجر ملازم رکھ لوں جو وقتاً فوقتاً صوبے بھر کے شہر میں گھوم پھر کر آرڈر بھی لایا کرے۔

میرے دوستوں نے یہ بات سنی تو حیران رہ گئے تعجب اُن کے چہروں سے صاف عیاں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں خاصے روپے کما رہا ہوں۔ لیکن خواب میں بھی اُن کا خیال یہ نہ تھا کہ میں اس قابل بھی ہوگیا ہوں کہ ایک نیجر بھی ملازم رکھ سکتا ہوں۔

اُنہوں نے مشورہ دیا کہ اخبار میں اس مطلب کا اشتہار نکلوا دوں اس طرح کئی اشخاص درخواستیں دیں گے۔ اور پھر اُن میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینا مشکل نہ ہوگا۔

مجھے یہ تجویز معقول معلوم ہوئی۔ چناں چہ اخبار میں اشتہار دے دیا گیا خلاف امید ڈیڑھ سو سے اوپر درخواستیں آئیں۔ اُس رات میں بیوی کے ساتھ بیٹھا درخواستیں پڑھتا رہا۔ بیوی مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ پہلے میں خود درخواستیں بھیج کر بیٹھا جواب کا انتظار کیا کرتا تھا۔ آج ڈیڑھ سو سے اوپر نوجوان میری توجہ کے منتظر تھے۔ ہمارے گھر میں یہ ایک بالکل ہی نئی بات تھی۔

درخواستوں پر غور کرنے کے بعد میں نے سولہ امیدواروں کو انٹرویو کے لیے بُلایا۔

انٹرویو سے ایک روز پہلے میں خود پریشان ہو رہا تھا۔ جیسے خود میرا انٹرویو ہونے والا ہو۔ گھر کے سبھی لوگ یعنی بوڑھا باپ، ماں، بیوی، بہنیں کرسیوں اور چارپائیوں پر

بیٹھی اپنی اپنی قیمتی رائے کا اظہار کر رہی تھیں۔ خاندان کا ہر فرد اپنی اہمیت کو محسوس کر رہا تھا۔ میں بظاہر بڑی سنجیدگی سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ جیسے یہ سب میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو۔ گھر والوں کو بھی مجھ پر پورا بھروسہ تھا۔ اخبار میں اشتہار دینے کی ترکیب سنتے ہی سب میرے نام کا کلمہ پڑھنے لگے تھے۔ لیکن میرے دل میں ایک طوفان سا اٹھ رہا تھا۔ اُمیدواروں میں مجھ سے کہیں زیادہ پڑھے لکھے اور تجربہ کار اشخاص تھے۔ میں اُسی فکر میں گھلا جا رہا تھا کہ میں ان سے کیوں کر گفتگو کروں گا۔ کیا کیا سوالات دریافت کروں گا اور جب وہ جواب دیں گے تو میں کیوں کر اپنے سر کو ایک خاص انداز سے حرکت دوں گا۔ جیسے سب کچھ سمجھتا ہوں اور پرانا گھاگ ہوں۔

گئی رات تک میں اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا اور مجھے کچھ علم نہیں کہ کب میری آنکھ لگ گئی۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ گھر کے اور سب لوگ کبھی کے سو چکے تھے۔

صبح ہی صبح آنکھ کھلی۔ داتون کرتا ہوا نیچے گیا۔ دفتر کی صفائی کروائی۔ ہر شے قرینے سے رکھی۔ میز پر دھوبی کی دھلی ہوئی چادر بچھادی۔ قلم دان، مہریں، پن کشن وغیرہ ہر چیز جھاڑ پونچھ کر مناسب جگہ پر رکھ دی گئی۔ کیلنڈر کی تاریخ بدل کر لگا دی۔

ان انتظامات کے بعد اوپر گھر میں پہنچ کر خوب اچھی طرح داڑھی بنائی بال سنوارے اچھے کپڑے پہنے اور ناشتہ کیا۔ جب اُمیدواروں کے آنے کا وقت ہوا تو میں دفتر میں جا بیٹھا۔ نوکر کو ہدایت کردی کہ جو کوئی آئے اُسے برآمدے میں پڑی ہوئی بنچوں پر بٹھا دے۔

بڑی میز کے آگے بیٹھا بیٹھا میں ریہرسل کرنے لگا۔ جب امیدوار کمرے میں داخل ہوگا۔ تو وہ مجھے خوب جھک کر یا بڑے ادب کے ساتھ سلام کرے گا۔ اور میز کے سامنے اُس وقت تک کھڑا رہے گا جب تک کہ میں اُسے بیٹھنے کا اشارہ نہ کروں۔ لیکن میں بہت جلد ہی اُسے بیٹھنے کا اشارہ کردوں گا۔ وہ بیٹھ جائے گا۔ تو میں پوچھوں گا—

''ہم ......تو آپ کا نام...... ہے؟''

''جی بندہ پرور۔''

''ہم ...... اونہہ...... اونہوں......''

میں بہت کم بولوں گا۔ ہر لفظ بڑے رعب سے ادا کروں گا— از حد سنجیدہ بنا رہوں گا۔ خواہ امیدوار کیسے بھی دانت نکالے۔ میں زیادہ سے زیادہ اپنے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہونے دوں گا۔ پھر میں اُنہیں کام کی نوعیت بتاؤں گا۔ اور یہ کہنے میں بھی کچھ ہرج نہ ہوگا کہ میں وقت کا بہت پابند ہوں اور اسی قسم کے ملازموں کو پسند کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد امیدوار آنے شروع ہوگئے۔ میں دروازے کے قریب کھڑا چھپ کر ہر آنے والے کو دیکھ رہا تھا...... پھر میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے ایک امیدوار کو اندر بلایا۔

ایک ہی امیدوار سے نپٹنے کے بعد میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ جو بے چارے ملازمت کے لیے آتے ہیں وہ خود ہی پریشان ہوتے ہیں۔ اُن کے اپنے دل دھڑکتے ہوتے ہیں۔ بھلا وہ بے چارے مجھ پر کیا رعب جمائیں گے۔

میرا خیال ہے کہ آٹھواں شخص جو میرے کمرے میں داخل ہوا مظفر تھا۔

مظفر کا قد کچھ نکلتا ہوا تھا۔ اکہرا بدن، آنکھوں پر چشمہ، سر کے بال برش سے پیچھے کی طرف ہٹے ہوئے، مانگ ندارد، پتلے حساس ہونٹ، ناک ذرا خم کھائی ہوئی، تیز چمکیلی آنکھیں۔ وہ کمرے میں یوں ہی بے تکلفی سے داخل ہوا۔ اپنے ہیٹ کو چھو کر اُس نے سر کو ذرا سا خم دیا۔ اور پیش تر اس کے کہ میرا ہاتھ بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے لیے مکمل طور پر اوپر اٹھے وہ ''تھینک یو'' کہہ کر بیٹھ گیا۔

مجھے اس کا انداز پسند نہیں آیا۔ میں نہیں جانتا میرے چہرے سے کس قسم کے جذبات کا اظہار ہو رہا تھا۔ اُس نے کہا:

''آپ کو منیجر چاہئے نا! جی تو میں اپنی خدمات پیش کرتا ہوں......'' آپ نے اشتہار میں کوئی تفصیل نہیں دی۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ آپ سیاہیوں کا کام کرتے ہیں۔

اور میری رائے میں دوران جنگ میں یہ بہت منافع بخش کام ثابت ہوگا...... ایک بات اور عرض کروں...... ہندستان میں کچھ لوگ نئے قسم کے کام شروع کریں گے۔ لیکن سب کی ذہنیت یہی ہوگی کہ پبلک کی مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمائیں...... لیکن آپ محتاط رہئے گا۔ اگر آپ نے اپنا کام ایمان داری اور اعلا پیمانے پر جاری رکھا تو یقین فرمایئے جنگ ختم ہوجانے کے بعد بھی آپ اپنا کام جاری رکھ سکیں گے......"

اُس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ چوں کہ اُس نے اتنی باتیں کہہ دی تھیں۔ مجھے بھی ہوں ہاں کر کے کچھ نہ کچھ جواب دینا ہی پڑا—

اُس نے ہیٹ اُتار کر میز پر رکھ دیا۔ اتنی دیر تک ہیٹ اُتارنے کی اُس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ پھر اس نے جیب میں سے سگریٹ کیس نکالا اور ایک سگریٹ مجھے دکھا کر کہنے لگا۔ "اجازت ہے؟" اور پیش تر اس کے کہ میرے منہ سے کوئی لفظ نکلے۔ اُس نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر دیا سلائی جلائی۔

مجھے اُس کی بے ہودگی پر غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اُس کے چہرے پر غرور یا شرارت کا شائبہ تک نہ تھا۔ بلکہ وہ اس طرح گفتگو کر رہا تھا۔ جیسے ایک انسان کو کسی انسان سے کرنی چاہیئے۔ اور مجھے اُس کا اس طرح آزاد اور بے تکلف ہونا بھی پسند نہ تھا۔

اُس نے دھواں اڑاتے ہوئے کہا " آپ اس کام کو بڑھایئے۔"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا " اسی ضرورت سے یہ اشتہار شائع کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا شخص ہو جو یہاں کام سنبھال سکے۔ اور باہر کے شہروں کا دورہ بھی کر لے۔ اس طرح ترقی کی زیادہ امید ہے۔"

میں نے یہ باتیں ایسے لہجہ اور ادا میں کہہ ڈالیں جیسے میں اس میدان کا کوئی پرانا کھلاڑی ہوں۔ وہ اس دوران میں کرسی کے پیچھے کی طرف جھکا ہوا سر اس طرح ہلاتا رہا جیسے میں اُس کے سامنے ایک طفلِ مکتب ہوں۔

میری مکمل گفتگو سن لینے کے بعد اُس نے سگریٹ کا گل جھاڑتے ہوئے کہا۔
"دیکھئے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو عرض کروں کہ میں یہ دورے وورے پر جانا پسند نہیں کرتا۔ وجہ یہ کہ میں، جیسا آپ دیکھ رہے ہیں ذرا کمزور سا آدمی ہوں مجھ سے یہ جھنجھٹ تو ہرگز نہ ہوگا....."

مجھے اس کی یہ بات بہت عجیب معلوم ہوئی۔ بھلا اس بھلے آدمی سے کوئی پوچھے کہ میں نے تمہیں منیجر بنایا کب ہے جو ابھی سے حیل و حجت شروع کردی۔ میں اس کی اس بات کا کوئی چست سا جواب دینا چاہتا تھا لیکن جلدی میں کچھ نہ سوجھا۔

اُس نے بڑے اطمینان سے کش کھینچتے ہوئے کہنا شروع کیا۔"میری ناچیز رائے میں آپ کو اس وقت بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے..... آپ دو تین ایجنٹ رکھ لیجئے مختلف علاقے اُن کے سپرد کر دیجئے۔ اس میں فکر کی کوئی بات نہیں ان ایجنٹوں کے اخراجات نکال کر بھی آپ کو معقول منافع ہوگا— پھر اُس نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔" اس کرسی پر جس پر کہ اس وقت آپ بیٹھے ہوئے ہیں آپ کا ایک سمجھ دار اور تجربہ کار منیجر بیٹھا ہونا چاہئے۔ جو کوئی یہاں آئے اچھا اثر لے کر جائے..... اور جناب لاہور کوئی معمولی شہر نہیں۔ آپ اس شہر کے اندر اپنے کاروبار کو اور زیادہ آرگنائز کیجئے۔ سرکاری ٹھیکوں کے لیے کوشش کیجئے۔ پرائیویٹ فرموں سے تعلقات پیدا کیجئے۔ اسکولوں اور کالجوں کے دفتروں میں اپنی سیاہی پہنچائیے۔ ہر اچھے دکان دار کو اپنی روشنائی کا ایک بڑا سا بورڈ مفت دیجئے اور بیسیوں گر ہیں بزنس (تجارت) کے..... درحقیقت آپ کو ایسے ہی منیجر کی ضرورت ہے جو نہ صرف اچھی بات چیت کے فن سے واقف ہو۔ بلکہ وہ گاہکوں کو اپنی چیز کی برتری کا یقین دلا سکے۔ بس یہی ایک شے ہے۔ اگر گاہک آپ پر ایمان لے آئے تو بس چاندی ہی چاندی ہے۔ لیکن ایک بات یاد رہے کہ کبھی دل میں گاہک کو بے وقوف بنانے کا خیال نہ آئے۔ میری بات سمجھے نا! آپ؟..... بزنس مین وہ ہے جو اڑتی چڑیا کو پہچان لے۔"

یہ آخری فقرہ نہ معلوم اس نے کیوں کہا۔ میں اُسے اپنے آپ سے منسوب کر کے کچھ مرعوب سا ہوگیا تھا۔

''بہتر'' اُس نے سگریٹ پرے پھینک کر کہا '' اب میرے خیال میں دیگر ضروری باتیں بھی ہوجانی چاہئیں...... اچھا لو......''

'' میں شاید پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مجھے ایسے مینجر کی ضرورت ہے جو دورہ بھی کرے اور یہاں کا کام بھی بھگتا سکے۔ اس صورت میں اسّی روپے ماہوار دے دوں گا۔''

اُس نے ہیٹ ہاتھ میں تھام کر جواب دیا '' آپ میری گزارشات پر غور کر لیجئے...... میری ناچیز رائے میں آپ کو اسی قسم کے مینجر کی ضرورت ہے جو مستقل طور پر یہاں رہ کر اس کام کر ترقی دے سکے۔ فی الحال میں سو روپیہ ماہوار لے لوں گا...... اور پھر اُس میں چار پانچ ماہ بعد کم از کم پچاس روپیہ کا اضافہ ہوجانا چاہئے...... میں کل صبح خود ہی حاضر خدمت ہوجاؤں گا، آپ غور کرلیں۔''

میں سارا دن اور ساری رات اس بات پر غور کرتا رہا۔ اور دوسرے دن جب وہ آیا تو میں نے اُسے ملازم رکھ لیا۔

اُس نے آتے ہی دفتر کا حلیہ بدل دینے کے لیے کہا۔ چناں چہ ہم دونوں بازار گئے۔ کچھ اچھی قسم کا فرنیچر اور دری چٹائی وغیرہ خرید لائے اور اُسی دن اُس نے دفتر کی صورت بدل دی۔ واقعی اب دفتر خوب صورت دکھائی دینے لگا۔ اس نے بڑی میز سے ذرا پرے کھڑے ہو کر کہا'' نائیس (Nice) ۔ اب یہ انسانوں کے بیٹھنے کی جگہ ہوگئی ہے۔

اس کی اس قسم کی باتیں دل میں نشتر کی طرح اُتر جاتی تھیں۔ میں جب اُس کے چہرے کی طرف دیکھتا تو وہ از حد سنجیدہ اور متین نظر آتا تھا۔

دوسرے روز جب میں دس بجے کے قریب اوپر سے نیچے دفتر کی طرف گیا تو دیکھا کہ مظفر کرسی پر بیٹھا کام میں مصروف ہے۔ اس وقت وہ چند نئے رجسٹروں میں پنسل سے لکیریں لگا رہا تھا۔ میں جب اندر داخل ہوا تو اس نے بلا میری طرف دیکھے کہا۔

"آداب عرض جناب۔"

مجھے تعجب ہوا کہ اُس نے بلا دیکھے مجھے کیسے پہچان لیا۔

اُس نے مسکرا کر کہا۔" میں آپ کے قدموں کی چاپ ہی سے آپ کو پہچان سکتا ہوں۔ اگر آپ دس آدمیوں کے ساتھ اپنی عام چال کے مطابق گھوم رہے ہوں تو بھی مجھے آپ کی چال پہچان لینے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔"

میں دل ہی دل میں ہنسا۔ سوچا یہ کوئی شرلک ہومز کا چچا معلوم ہوتا ہے۔

میں چپ چاپ میز کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے میرے لیے میز کی خاص کرسی خالی نہیں کی۔ ہاتھ سے سامنے والی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا:

" تشریف رکھئے نا۔"

پھر اُس نے سگریٹ سلگا لیا۔

"دیکھئے یہ لیبل جو آپ نے چھپوائے ہیں بہت بھدّے ہیں۔ اور یہ ڈبّے بھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر اتنے رنگوں میں لیبل چھپوانے کا آپ کو مشورہ کس بے وقوف نے دیا تھا۔"

وہ لیبل دراصل میری ہی تجویز کے مطابق چھپے ہوئے تھے۔ اُس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا:

"اس قسم کے لیبل چھپوانا اور اُنہیں شیشیوں اور بوتلوں پر لگانا بڑی بد ذوقی کا ثبوت دینا ہے...... ایک رنگ صرف ایک رنگ کافی ہے...... آپ سمجھے...... اور پھر حروف بھی سادہ ہونے چاہئیں۔ زیادہ ڈیکوریشن کی ضرورت نہیں ہے...... دیکھئے میری تجویز یہ ہے۔ اس جگہ روشنائی کا نام بس اتنے بڑے بڑے حروف میں لکھا ہوا ہے۔ نیچے باریک حروف میں اس کی تعریف میں ایک اچھا سا جملہ۔ بس۔ ادھر بھی ایک موٹی سی لکیر اور اس طرف بھی......"

اُس نے اپنی مرضی کے مطابق کسی آرٹسٹ سے ڈرائنگ بنوالی۔ اور پھر اس کا

بلاک بنوا لیا۔

اس کے جسم میں خون کی کمی معلوم ہوتی تھی۔ جسم کمزور۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے۔ ہونٹ یوں ہی پھیکے سے چہرہ زردی مائل۔ لیکن وہ غضب کا پھرتیلا شخص تھا۔ اُس اکیلے شخص کی چلت پھرت سے دفتر میں رونق سی رہتی تھی۔

اُس کی تجویز کے مطابق دو ایجنٹ بھی رکھ لیے گئے۔ ایک کو باہر بھیج دیا گیا۔ ایک لوکل کام کے لیے رکھ لیا گیا۔

وہ یقیناً بڑا چلتا پرزہ شخص تھا۔ چند ہی دنوں کے اندر اُس نے سب لوگوں سے واقفیت پیدا کرلی۔ اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر، کالجوں کے پرنسپل، دیسی و انگریزی فرموں کے منیجر بھی سبھی اس کے دوست بن گئے۔ ایک روز میں برآمدے میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک انگریز وہاں آیا۔ کہنے لگا ''میں منیجر سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں تو اُسے دیکھ کر ڈر ہی گیا۔ اور جب مظفر کمرے سے باہر آکر اُس سے بڑے تپاک کے ساتھ ملا تو میں حیران رہ گیا۔ وہ اُسے دفتر میں لے گیا۔ وہاں وہ دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اب پہلے کی نسبت کہیں بہتر کام ہو رہا تھا۔ بلکہ کہنا چاہئے کہ مظفر نے میرے کاروبار کی کایا پلٹ دی۔ اب کام ایسے پیمانے پر چل رہا تھا کہ میں خواب میں بھی اس کا خیال دل میں نہ لا سکتا تھا۔ مظفر اس قدر محنتی شخص تھا کہ شاید میں خود بھی اتنا کام کبھی نہ کرسکتا تھا۔ اور وہ یہ کام اس طرح کرتا تھا جیسے زندگی میں اس کا نصب العین ہی یہی تھا کہ اسے کامیاب بنائے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں کچھ بے چین سا رہتا تھا۔

جب سے وہ آیا تھا میرے لیے کوئی کام ہی نہ رہ گیا تھا۔ سارا سارا دن بیٹھا مکھیاں مارا کرتا۔ میرا منیجر کبھی مجھ سے کسی قسم کا مشورہ طلب کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتا تھا۔ بلکہ اگر میں کوئی صلاح دیتا بھی تو اگر وہ میرا زیادہ لحاظ کرتا تو چپ رہ جاتا ورنہ اُسے میری بات رد کر دینے میں بھی کچھ تکلف نہ تھا۔

میری بات رد کر دینے کے بعد فوراً کوئی ایسی تجویز پیش کر دیتا جو مجھ سے یقیناً کہیں بہتر ہوتی تھی۔ اس لیے مجھے خاموش رہنا پڑتا تھا...... یہاں تک کہ میں اُس کے سامنے کوئی تجویز پیش کرتا ہوا بھی ڈرنے لگا تھا۔

پہلے چند ماہ تو واقعی میں مرعوب رہا۔ مجھے اپنا بے کار بیٹھنا پسند نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ جب میرا کام اچھا خاصہ چل رہا تھا تو پھر مجھے اس قدر بے چینی کا اظہار کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میری الجھن کا سبب یہ تھا مجھے اُس نے اس بات کا شدید طور پر احساس کرادیا تھا کہ میں ایک نا اہل شخص ہوں۔ میری کوئی رائے اس قابل نہیں کہ اُس پرعمل کیا جاسکے۔

یہ بھی درست ہے کہ وہ محض باتیں نہیں بناتا تھا بلکہ جو کچھ کہتا تھا کر کے دکھا دیتا تھا...... لیکن مجھے اس نے بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا۔ میں دفتر یا برآمدے میں یوں ہی بے کار کتے کی طرح گھوما کرتا تھا۔ اُس نے کبھی مجھے خوش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ کہتا تھا۔ میں صرف آزادی کے ساتھ کام کرسکتا ہوں۔ مجھے ایک مرتبہ میرا فرض سمجھا دیا جائے اور ایک مرتبہ مجھے اپنے کام کی نوعیت معلوم ہوجائے تو بس پھر مجھے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ جو کاٹھ کا الو اٹھے میرے کام میں ٹانگ اڑا دے۔

اسی پر بس نہ تھی بلکہ اُس نے اپنی سہولت کے مطابق سارا ٹائم ٹیبل ہی بدل ڈالا تھا۔ میں نے صبح نو بجے سے لے کر شام کے چھ بجے تک دفتر کا وقت مقرر کیا تھا۔ دوپہر کو پون گھنٹے کا وقفہ کھانا کھانے کے لیے۔ لیکن اس نے اسے بدل کر دس سے ساڑھے چار بجے تک کام کا وقت مقرر کر دیا تھا اور دوپہر کے وقت ڈیڑھ گھنٹے کا وقفہ۔ میں نے اُس کی ہر بات برداشت کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن یہ تو بس حد ہی ہوگئی۔ اس طرح دوسرے نوکروں پر بھی برا اثر پڑتا تھا۔ وہ یوں ہی بڑبڑاتے رہتے تھے۔ میرے پاس آکر چغلیاں کھاتے تھے۔

میں نے ایجنٹ سے کہا کہ وہ کسی طرح مظفر کے کانوں تک یہ بات پہنچا دے

کہ میں اس بات کو پسند نہیں کرتا۔

جب ایجنٹ نے اس سے یہ بات کہی تو اس نے یہ جواب دیا کہ ان کی پروا مت کرو۔ اُنہیں ان باتوں کی کچھ خبر ہی نہیں۔ دل لگا کر انسان جو کام ایک گھنٹہ میں بھگتا سکتا ہے وہی کام اگر بے دلی سے کیا جائے تو تین گھنٹے میں بھی ختم نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی بزنس کا ایک گر ہے کہ نوکروں کو زیادہ سے زیادہ آرام اور تفریح کرنے کا موقع ملے۔ اس طرح وہ زیادہ بہتر کام کرسکتے ہیں۔

اس کا یہ جواب معقول تھا۔ لیکن دوسرے نوکروں کے سامنے وہ مجھے عقل سے کورا ظاہر کرے یہ بات میری قوتِ برداشت سے باہر تھی۔

چناں چہ ایک روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر واپس آیا تو میں نے ذرا بگڑ کر کہا۔

''مسٹر مظفر! آپ نے دفتر کا وقت بالکل بدل ڈالا ہے......''

''جی...... دیکھئے صبح میں ذرا دیر سے جاگتا ہوں۔ شام کے وقت مجھے ٹینس کھیلنے کے لیے جانا ہوتا ہے۔ اگر مجھے چھ بجے تک اس جگہ بیٹھنا پڑے تو پھر میرا سارا پروگرام درہم برہم ہوجائے۔''

'' اور پھر آپ دوپہر کو بھی پون گھنٹے کی بجائے ڈیڑھ گھنٹے کی چھٹی مناتے ہیں......''

''خاں صاحب! میرے خیال میں آپ کو میرے کام پر نگاہ رکھنا چاہئے...... پندرہ منٹ مجھے گھر جانے کے لیے درکار ہیں اور پندرہ منٹ واپس آنے کے لیے چاہئیں۔ آپ خود ہی بتایئے کہ پندرہ منٹ میں روٹی کیسے کھا سکتا ہوں...... غور فرمایئے میں پیٹ کے لیے ملازمت کرتا ہوں...... اگر روٹی بھی نہ کھاؤں تو کام کیسے کروں......''

میں نے گرم ہو کر جواب دیا:

جو کچھ بھی ہو اگر آپ واقعی کام کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو میری شرائط کے مطابق

کام کرنا ہوگا۔"

مجھے اس کی اس قدر مکمل دلیل بازی اور ہر بات میں اپنی ہی سبکی کے اظہار سے نفرت سی ہوگئی تھی۔

میں اپنے دل میں اس بات کا ضرور متمنی تھا کہ وہ میری ہستی کو بالکل ہی عضو معطل بنا کر نہ ڈال دے۔ بلکہ پروپرائٹر ہونے کی حیثیت سے میرے احساسات کی قدر کرے۔

اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت کی میری بات اُسے بے حد گراں گزری ہے، وہ منتظر ہے کہ میں اپنے تخیلات واپس لینے کی طرف توجہ کروں گا مگر میں ان باتوں سے اُکتا سا گیا تھا۔ اور میں نے ایسا نہیں کیا۔

وہ چند لمحوں کے لیے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتا رہا۔ پھر اپنی تیز آواز میں بولا۔

" خاں صاحب ! اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کام چل نکلا ہے اور اب آپ اسے چلا لیں گے تو آپ کا یہ خیال سراسر غلط ہے...... اور اگر مجھے نوکری کرنے کے باوجود فاقہ کرنا پڑے تو میں...... آپ جانتے ہی ہیں کہ میں آزادی سے کام کرنے کا عادی ہوں...... اس لیے میں غلامی کے فاقہ پر آزادی کے فاقہ کو ترجیح دوں گا۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کمزور شانوں کو حرکت دی اور سگریٹ پیتا ہوا گھر کو چل دیا۔

یہ افسانہ' افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

سکوت

یہ چھوٹا سا بنگلہ نما مکان شہر کے باہر سول لائنز کے اس حصہ میں بنا ہوا تھا جس سے آگے چند پلاٹ خالی پڑے تھے۔ لیکن اور کوئی عمارت نظر نہ آتی تھی۔ ایک تو سول لائنز کی یہ آبادی ہی شہر سے باہر تھی اور پھر یہ مکان بھی آبادی کے ایک خاموش گوشے میں تنہا کھڑا ہوا تھا۔ اس لیے یہاں سرِ شام ہی ہر طرف خاموشی طاری ہوجاتی تھی— اور جب تھکا ماندہ شبیر اپنے دوست کے مکان کی طرف قدم بہ قدم بڑھتا رہا تھا' تو اس کی تکان زدہ آنکھیں مکان پر گڑی ہوئی تھیں......

عموماً جب انسان دن بھر کام کرنے کے بعد واپس لوٹتا ہے تو اسے ہمیشہ یہی احساس ہوتا ہے جیسے اس کا مکان بازو کھولے اُس کے استقبال کے لیے کھڑا ہو۔ اور جب وہ اندر داخل ہوگا تو مکان کے اندر حسب حیثیت کرسیاں ہوں گی' یا کوچ بچھے ہوں گے' یا کم از کم چار پائی ہوگی...... وہ بیٹھ یا لیٹ کر تھوڑا سا آرام کرے گا— پھر وہاں منہ ہاتھ دھونے کے لیے پانی بھی ہوگا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کے کھانے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی چیز موجود ہوگی۔ اپنے گھر کی آزادی ، امن، جانی پہچانی ہوئی فضا، مکمل راحت وغیرہ تو مسلمہ خوبیاں ہیں۔ لیکن جب شبیر نے اپنے دوست پر نگاہ ڈالی تو اُسے اس قسم کی بات محسوس نہ ہوئی۔ وہ مکان یوں ہی پیلے رنگ کے مینڈک کی طرح

بے حس دکھائی دے رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگر وہ اُس کے قریب گیا تو مکان پھدک کر کہیں دور جا رہے گا۔ وہ اس کے پیچھے بھاگتا چلا جائے گا اور مکان پھدکتا ہوا دنیا کے دوسرے گوشے میں جا پہنچے گا۔ یہاں تک کہ وہ بے چارا کہیں رستے ہی میں تھک کر چور ہوجائے گا اور کسی گڑھے میں گر کر کراہتا رہے گا۔ یا کسی جھاڑی میں الجھ جائے گا۔ وہاں اُس کے گھٹنے چھِل جائیں گے۔ کانٹوں کے چبھ جانے سے اُس کے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھیں گی...... شبیر رُک گیا۔

اس مکان سے کس قدر سرد مہری ٹپکتی تھی ''خوش آمدید'' کہنا تو خیر دور کی بات تھی۔ بلکہ اگر وہ وہاں سے بھاگ کر مکان سے پرے چلا جائے تو وہ دل کھول کر قہقہے لگائے گا، بغلیں بجائے، اور یومِ نجات منائے گا...... کچھ بھی ہو وہ مکان سے پرے بھاگ جانے پر آمادہ تھا۔ لیکن وہ بھاگ کر کہاں جائے۔

یہ اس کی زندگی کے تاریک دن تھے۔ وہ دنیا میں تنہا تھا— بلکہ تنہا چھوڑ دیا گیا تھا۔ باپ نے اپنی ہوس کی سیری کے لیے اسے لنڈورے چوہے کی طرح اکیلا چھوڑ دیا۔ یہ ایک لمبی داستان تھی باپ کے بھیجے ہوئے وہ روپے جن پر اس کا گزارا ہو رہا تھا یکا یک آنے بند ہوگئے۔ اُس کی اعلا تعلیم کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور اُس نے ایک اسکول میں چھوٹی سی نوکری کرلی۔

جس جگہ وہ پہلے رہتا تھا اُسے وہ چھوڑنی پڑی۔ اس نے کم کرائے کا چھوٹا سا کمرہ تلاش کیا لیکن نہ ملا۔ وہ عارضی طور پر اپنے دوست کے ہاں آکر رہنے لگا تھا۔ وہ مثل مشہور ہے ایک دن کا مہماں اس کے بعد شیطان......

...... چھوٹی سی باڑ کے پیچھے زمین پر اُگی ہوئی گھاس اس سے پرے مکان......
بے حس، سرد مہر، چپ چاپ...... کھڑکیوں میں سے روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کس قدر اُداس اور پریشان کن تھی۔

تاریکی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ چپ چاپ گھر کے اندر چلا گیا...... اس کے دوست کے بچے باپ کو دیکھ کر چلّا اٹھتے تھے۔ لیکن وہ اُس سے مانوس نہیں تھے۔ وہ پہلے تو اُسے پہچان نہ سکے۔ لیکن جوں ہی اُنہوں نے اُسے پہچان لیا مسرت و شادمانی کی چیخیں اُن

کے لبوں تک پہنچتی پہنچتی رہ گئیں۔ دوست کی بیوی اُس سے پردہ نہیں کرتی تھی۔ وہ بہت اچھے دوست تھے اس لیے اس قسم کے تکلفات کا دخل ہی نہیں تھا...... لیکن اُس کی بیوی شبیر سے بے تکلف بھی نہیں تھی۔ جس قدر اُس کا دوست لطیف بدصورت تھا اُسی قدر اس کی بیوی حسین تھی۔ دونوں کی جوڑی اور بھی کئی پہلوؤں سے اچھی خاصی بے جوڑ تھی۔

شبیر سیدھا ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور خاموشی سے ایک آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ کسی غیر کے مکان میں آرام کرسی پر دراز ہونا کس قدر اذیت دہ تھا۔ وہ گرم جوشی اور پرخلوص استقبال کا بھوکا تھا وہ آنکھیں بند کیے کچھ دیر تک یوں ہی پڑا رہا...... اتنے میں لطیف کے بولنے کی آوازیں بھی آنے لگیں...... وہ یوں ہی سر جھکائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بچوں اور بیوی کے ساتھ باتیں کرنے کے بعد لطیف اِدھر چلا آیا...... پہلے پہل جب وہ نیا نیا آیا تھا تو لطیف اُس سے بات کر لیا کرتا تھا۔ اب اگر کوئی بات کہنے کی ہوتی تو وہ بولتا۔ ورنہ یوں ہی اپنے کام میں مصروف رہتا...... شبیر حد سے زیادہ تھک گیا تھا آج اُس نے نویں درجے کے لڑکوں کے جوابات کی کاپیاں دیکھ کر واپس کی تھیں۔ اس لیے آج سارا دن لڑکوں نے چلا چلا کر اُس کا ناک میں دم کردیا تھا۔ ایک تو ذاتی پریشانیاں، بیسیوں الجھنیں اور پھر لڑکوں کی کائیں کائیں۔ ان سب پر طرّہ یہ کہ اسکول سے مکان تک تین میل اڑتی گرد میں پیدل آنا پڑا — اور مکان؟ ...... اس کا جی چاہتا تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے باہر کھیتوں کی طرف نکل جائے۔ وہ لطیف کو سیر کے لئے کہنا نہیں چاہتا تھا۔ کیوں کہ پہلے ایک مرتبہ اُس نے اس سے کہا تو اس نے جواب دیا تھا کہ اُسے کام کرنا ہے۔ اُس نے کچھ اصرار کیا تو لطیف نے ذرا درشت لہجے میں کہا کہ اگر میں سیر ہی کرتا رہوں تو پھر کماؤں کہاں سے...... اُس دن سے شبیر نے اُسے کچھ کہنا ہی ترک کردیا اور آج تو خود اسی کا بولنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں باہر جانے کی ٹھان رہا تھا کہ لطیف نے خود ہی اُس سے کہا

"باہر چلو گے؟"

شبیر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ وہ اٹھ کر اُس کے ساتھ ہو لیا۔ مکان سے سڑکوں پر کوئی اکا دُکا آدمی نظر آ جاتا تھا یا کوئی کتا ایک کوٹھی کی باڑ سے گزر کر دوسری کوٹھی کی باڑ میں گھستا دکھائی دے جاتا۔ وہ دونوں خاموش تھے۔ ہاتھ پیٹھ پر باندھے سر جھکائے وہ آگے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سڑک سے گزر کر وہ گرد سے اٹے ہوئے میدان میں سے گزرنے لگے۔ سڑک پر کھڑے ہوئے کھمبے کی روشنی میں اُن کے سامنے پہلے تو خوب واضح طور پر اُن کے کالے کالے سایے حرکت کرتے ہوئے دکھائی دیتے رہے۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتے گئے سایے مدھم پڑتے گئے یہاں تک کہ وہ بالکل ہی غائب ہو گئے۔

آگے صرف تاروں کی روشنی تھی...... انسانوں کی آبادی کو وہ پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اُن کے سامنے کھیت تھے۔ پرے بہت دور دو گاؤں درختوں کے جھرمٹ میں گھاس چرنے والی بھیڑوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ موٹروں کا شور، لڑکوں کی ٹائیں ٹائیں، لاریوں کے پہیوں سے اڑتی ہوئی گرد اور پھر کانوں کے پردے سے پھاڑ دینے والا شہر بھر کی مختلف آوازوں کا گھلا ملا ہوا غل غپاڑہ...... ان سب سے پیچھا چھوٹ گیا تھا۔ شبیر نے لطیف کی طرف اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ وہ بھی اس کی طرح بالکل سنجیدہ سا ہو رہا تھا۔ اُس کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے۔ ماتھے پر بل۔ ناک کے نتھنوں کے قریب سے رخساروں کے نیچے جانے والے خطوط خوب گہرے دکھائی دے رہے تھے۔ چوں کہ وہ چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی بڑھائے ہوئے تھا۔ اس لیے اُس کے چہرے سے خشونت کے آثار اور بھی شدید دکھائی دیتے تھے۔

خاموشی سے چلتے ہوئے وہ کھیتوں کے قریب ایک جوہڑ کے پاس جا پہنچے۔ وہ پہلے بھی ہمیشہ اسی جگہ آیا کرتے تھے۔ جوہر کا پانی گدلا تھا۔ لیکن گاؤں کے لوگ نہ صرف مویشیوں کو اس میں نہلاتے تھے بلکہ خود بھی اس میں نہاتے اور کپڑے دھوتے تھے۔ دن

بھر پانی کی سطح پر صابن کی جھاگ تیرا کرتی تھی۔ البتہ رات کو پانی پر سکون اور صاف و شفاف نظر آتا تھا۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ دن میں اس جوہڑ کا نظارہ طبیعت پر کچھ نا خوش گوار اثر ڈالتا تھا۔ لیکن رات کے وقت یہ کاشمیر کی کسی جھیل کی طرح دل کش نظر آنے لگتا تھا۔ چناں چہ آج بھی ململ کی طرح باریک چھوٹی سی بدلی کے پیچھے چھپے ہوئے چاند کی روشنی جوہڑ کے پانی پر جھلملا رہی تھی...... وہ دونوں عین جوہڑ کے کنارے اپنی پرانی جگہ پر بیٹھ گئے۔

ہوا خنک تھی ہر طرف خاموشی اور امن کی حکومت تھی۔ آسمان قریب قریب بالکل صاف تھا۔ کہیں کہیں بادل کا ہلکا سا ٹکڑا کارواں سے بچھڑے ہوئے یوسف کی طرح آوارہ پھرتا دکھائی دے جاتا تھا۔ تارے ایسے روشن دکھائی دے رہے تھے جیسے اُن کے چہرے خوب اچھی طرح سے دھو دیئے گئے ہوں اور وہ معصوم بچوں کی طرح آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ تا حد نگاہ بڑے بڑے کھیت پھیلے ہوئے تھے اور اُفق میں کچھ ایسی کھلی ملی سی پھیلی پھیلی روشنی نظر آرہی تھی جیسے کوئی مٹھیاں بھر بھر کر گلال ہوا میں اڑا رہا ہو۔ اس جگہ انسان کو ایک لا متناہی وسعت، ابدی سکون اور دائمی راحت کا احساس ہوتا تھا۔

وہ دونوں اس انداز سے بیٹھے تھے کہ اُن کی ایڑیاں زمین پر ٹکی تھیں۔ گھٹنے اوپر کو اُٹھے ہوئے تھے۔ اور گھٹنوں پر اُن کی کہنیاں ٹکی ہوئی تھیں لطیف کے چہرے سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ کسی سے لڑ کر چلا آرہا ہو۔ شبیر سوچنے لگا۔ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہے۔ یہی میرا دوست کس قدر خوش مزاج اور باتونی شخص تھا۔ لیکن اب اُس کی زبان پر تالا سا پڑ گیا ہے۔ اگر انسان پر ذرا سی مصیبت آن پڑے تو دوست کھسکنے لگتے ہیں۔ انسان کو آنکھیں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آخر لوگ اس قسم کا رویہ اختیار کس طرح کر لیتے ہیں۔ کل جس دوست سے بے حد بے تکلفی تھی آج اس سے بات کرنے کے روا دار نہیں۔

اس طرح کے خیالات میں کھوئے کھوئے اُس نے اپنے دوست کی طرف نگاہ

اٹھا کر دیکھا جیسے کہہ رہا ہو" دوست ! میں تمہاری پریشانی کا سبب خوب اچھی طرح سے سمجھتا ہوں۔ یوں تو تم یہی کہتے ہوگے کہ میں بے حیا ہوں جو اس طرح تمہارے گھر میں ڈیرا لگائے بیٹھا ہوں دونوں وقت روٹی کھاتا ہوں۔ اس طرح مفت میں تم سب کی پریشانی کا باعث ہو رہا ہوں۔ تم صحیح کہتے ہو۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تمہیں ایک مصیبت میں گرفتار کر رکھا ہے۔ لیکن میرے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں۔ میں جلد از جلد تمہارے گھر کو خیر باد کہہ دینا چاہتا ہوں لیکن مجبور ہوں۔ خیر یہ تو رہی میری حالت۔ لیکن تم اپنی کہو۔ کس طمطراق سے تم مجھے اپنے گھر لائے تھے۔ تم نے کہا اسے اپنا گھر سمجھو۔ میری حالت سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ تمہیں میں نے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ سب حالات جانتے ہوئے بھی تم نے مجھے اپنے پاس بلا لیا۔ اب گلے پڑا ڈھول بجانا پڑا تو گھبرا گئے۔

لطیف نے جیسے اُس کی بات سن لی ہو۔ اُس نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو" بھئی میرے کہنے کی کوئی بات ہے نہیں۔ جو میرے دل میں ہے وہ میری صورت سے ظاہر ہے۔ بال بچے دار آدمی ہوں۔ زیادہ عرصہ تک مہمان اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ ہر بات کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ تم کنوارے ہو تم ان باتوں کو نہیں سمجھتے۔ بلکہ سمجھ ہی نہیں سکتے۔ میں در اصل لاچار ہوں۔ کچھ باتیں میرے بس کی نہیں۔ مجھے تمہارا پورا پورا خیال ہے۔ لیکن ہمارا سماجی نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ میاں کچھ بات پسند کرتے ہیں تو بیوی نہیں پسند کرتیں۔ اسی طرح جو بات بیوی کو پسند ہے میاں کو نہیں خیر' یہاں تک تو کوئی ہرج نہ تھا۔ لیکن مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ایک دوسرے کے اختلاف برداشت کرنے کو بھی تو وہ تیار نہیں ہوتے۔ اگر ہم ایک بات پر متفق نہیں ہوسکتے...... لیکن کم از کم اختلاف پر رضا مند تو ہوسکتے ہیں نا؟ تم میرے دوست ہو لیکن میری بیوی کے نہیں...... جس طرح میری بیوی کی سہیلیاں میری سہیلیاں نہیں ہوتیں......"

عورتوں کا خیال آنے پر شبیر کا ذہن دوسری طرف کو منتقل ہوگیا وہ سوچنے لگا کہ

عورتیں بھی عجیب بلا ہوتی ہیں۔ اچھے خاصے دوستوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دم لیتی ہیں۔ مرد بھی در اصل بے وقوف ہی ہوتے ہیں۔ لطیف سے تو خیر اُس کا دو تین برس کا یارانہ تھا۔ اس کے اور بھی پرانے دوست وہ لنگوٹئے یار' ہم پیالہ وہم نوالہ — کھیل کود میں ، شرارتوں میں، باغوں کی چوریوں میں غرض ہر جگہ ساتھ رہتے تھے...... اُس کے راول پنڈی کے دوست رؤف ، بدا، وغیرہ تین تین چار چار روز کے لیے کوہ مری کی سیر کو نکل جاتے تھے۔ سب کس قدر بے فکرے اور نڈر تھے۔ لیکن جب اُن کی شادی ہوگئی...... کئی سال بعد جب وہ راول پنڈی گیا تو اُسے معلوم ہوا کہ اُس کے دوستوں میں سے بیش تر کی شادی ہوگئی ہے۔ پرانے ساتھیوں میں سے کئی دوسرے شہروں میں چلے گئے تھے۔

وہ رؤف جو محض ایک بے کار لڑکا تھا۔ خود اُس کے ابا تو اُسے پڑھنے کے لیے مجبور بھی کرتے تھے۔ لیکن نہ معلوم رؤف کے ابا اُسے کبھی کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔ کیوں کہ جب کبھی آجائے تو بس جانے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔

اور وہ بدا...... اُسے کیا کام تھا بھلا۔ کچھ نہیں، اس کے ساتھ برج خواہ سارا سارا دن کھیلتے جاؤ اور جب وہ لوگ باہر جایا کرتے تھے تو وہی شرارتیں کرنے میں سب سے پیش پیش رہتا تھا...... لیکن جب اُس نے اُنہیں کئی برس بعد دیکھا تو ان سب دوستوں کے حلیے ہی بدل گئے تھے۔

رؤف نے ریڈیو کی دوکان کھول لی تھی۔ جب وہ اُسے ملنے کے لیے گیا اور پرانے زمانہ کا ذکر چھیڑا تو وہ کہنے لگا۔ ''یار اب کچھ نہ پوچھو...... اب وہ بات ہی نہیں رہی......''

''کیوں بھئی وہ بات کیوں نہیں رہی؟ شبیر کو اُس کی شادی ہوجانے کی اس وقت تک کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ کسی غیر متوقع جواب کا منتظر تھا۔

لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب رؤف نے جواب دیا ''یار اب میری

شادی ہوگئی ہے۔''

اسی طرح بدا کی بھی شادی ہوچکی تھی۔ پہلے تو اگر جناب ایک مرتبہ مل جائیں تو پھر سارا سارا دن اُس کا ساتھ نہیں چھوڑتے تھے لیکن اب اگر ایک آدھ گھنٹہ اکٹھے بیٹھنا پڑے تو اٹھ اٹھ کر گھر کی طرف بھاگتے تھے۔ آخر بیویوں میں ایسی کیا کشش ہوتی ہے کہ بس ایک مرتبہ مرد اُن کے قابو میں آیا اور انہوں نے منتر پڑھ کر اُسے گدھا بنا ڈالا......

اب ہلکی ہلکی خنک ہوا چلنے لگی تھی۔ وہ دونوں اپنے اپنے سر کی جلد پر ہوا کی ٹھنڈک کو محسوس کر سکتے تھے۔ دماغ کی تکان دور ہونے لگی تھی مکمل خاموشی سے اُن کے اعصاب میں مسرت انگیز راحت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ شبیر کا ذہن ماضی کی طرف منتقل ہوگیا......عورت کیا بلا ہے؟ اس بات کا جواب خود اُسی کا حافظہ دینے لگا۔ یہ اُن دنوں کی بات تھی جب گاؤں کے قریبی قصبے سے دسویں پاس کرنے کے بعد وہ شہر پہنچا اور کالج میں داخل ہوگیا۔ شہر میں اُسے ایک علاحدہ کمرے کی ضرورت تھی۔ وہ ہوسٹل میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ ان دنوں اس کی ماں اُس کے ساتھ تھی۔ ماں کی ایک سہیلی مل گئی۔ کچھ تو وہ پہلے ہی سے سہیلیاں تھیں کچھ اتنے لمبے عرصہ کے بعد جو ملیں تو بس ایک دوسرے سے لپٹ ہی تو گئیں اور پھر اس طرح باتوں ہی باتوں میں اس کی بات بھی چھڑ گئی۔ ماں کی سہیلی کا شہر میں اپنا مکان تھا۔ جس میں اُنہیں کا کنبہ رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹھک دینے پر رضا مند ہوگئیں...... اُس نے اُن کی بیٹھک میں رہنا شروع کر دیا۔ اس بیٹھک میں مالکوں کی ایک بہت بھاری لوہے کی پیٹی رکھی تھی۔ وہ اُنہوں نے اُسی جگہ پڑی رہنے دی۔

بیٹھک کا دروازہ ڈیوڑھی کے اندر ہی تھا۔ ڈیوڑھی میں دن بھر عورتیں بیٹھی چرخے کاتا کرتی تھیں۔ رات کو ڈیوڑھی کو اندر سے مقفل کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے اُنہیں کوئی خطرہ نہ تھا۔ باقی رہا شبیر' تو وہ ان کا اپنا بیٹا ہی تو تھا...... البتہ اُنہوں نے یہ ضرور

کیا کہ کمرے کی ایک چابی پیٹی میں سے اُسے دے دی اور ایک اپنے پاس رکھ لی۔ تاکہ جب کبھی اُنہیں کسی شے کی ضرورت محسوس ہو تو وہ لے سکیں۔

اُن کی ایک لڑکی تھی۔ کچھ بھلا سا نام تھا۔ حسین تھی جوان تھی بلکہ جوبن کی آمد آمد تھی۔ شبیر تنہائی پسند، خاموش اور شریف لڑکا سمجھا جاتا تھا...... اس لیے کبھی کبھی وہ لڑکی بھی پیٹی میں سے کوئی زیور یا نقدی نکالنے کے لیے چلی آتی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تھی تو شبیر منہ پھیر کر کتاب کی طرف دیکھنے لگتا کبھی کوئی بات نہیں ہوئی اُس کی شرافت کی دھوم مچ گئی۔ لیکن ایک روز گرمیوں کی ایک دوپہر کو جب لڑکی پیٹی کھولنے لگی تو چابی سوراخ میں پھنس گئی...... اُس کا دھیان اپنی کتاب کی طرف تھا۔ لیکن اُسے معلوم ہوگیا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ہوگئی ہے۔ لیکن وہ چپکا بیٹھا رہا۔ پھر لڑکی نے آہستہ سے کہا ''چابی گھومتی نہیں...... اس کا دل دھڑکنے لگا۔ لڑکی نے آج تک اُس سے کبھی کوئی بات نہ کی تھی۔ جب اُس نے گھوم کر دیکھا تو وہ اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی تھی۔ گویا یہ الفاظ لڑکی نے اُس سے نہیں کہے تھے۔ اُس نے بھی منہ پھیر لیا اور کتاب کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ '' کیا میں آپ کی مدد کرسکتا ہوں؟'' لڑکی نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ لڑکی ابھی تک بیٹھی ہے تو اُس نے الخاموشی نیم رضا سمجھ کر اُس کی مدد کرنے کی ٹھانی۔

جب وہ پیٹی کے قریب پہنچا تو وہ چابی اُس کے ہاتھ میں دے کر آپ ذرا پرے سرک کر بیٹھ گئی۔ اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے چابی یوں ہی ایک سوراخ میں ڈالنی شروع کردی...... لڑکی نے ہاتھ بڑھا کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایتھے'' یعنی اس جگہ......

اُس رات اُسے وہ گورا گورا ننھا منھا ہاتھ خواب میں نظر آتا رہا...... دوسرے تیسرے روز جب لڑکی کی ماں گھر پر نہیں تھی وہ اُس سے ایک سوال سمجھنے کے لیے اس کے پاس آن بیٹھی...... پھر جب وہ ایک روز کمرے میں آیا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کا

کمرہ شیشے کی طرح چمک رہا ہے۔ اُس کا بے ترتیبی سے پھیلا ہوا سامان کرسیاں، میز، کپڑے کتابیں سب ٹھکانے سے رکھے ہیں...... اور پھر اسی طرح اُس کا کمرہ صاف رہنے لگا۔ اُسے صبح کے وقت میٹھے کا گلاس اور مکھن بھی ملنے لگا۔ ایک روز لڑکی کے ہونٹوں سے اُس کے ہونٹ پیوست ہوگئے۔ لڑکی کی ٹانگوں سے چھو کر اُس کی ٹانگیں زور زور سے کانپنے لگیں...... یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ چند دنوں بعد اُس نے گھومنا، پھرنا، دوستوں کے ساتھ کھیلنا اور تھیئٹر وغیرہ دیکھنا سب کچھ بند کر دیا تھا......

دفعتاً شبیر کی نظریں اوپر کو اٹھ گئیں۔ چند بڑے بڑے پرندے نہایت خاموشی سے پر ہلاتے ہوئے اُن کے سروں کے اوپر سے گزر گئے۔ وہ دور چلے جارہے تھے اور پھر لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلند تر ہوتے جارہے تھے۔ یقیناً اُن کی کوئی نہ کوئی منزل ضرور ہوگی۔ یوں ہی بلا مقصد تو نہ اڑ رہے ہوں گے۔ لیکن کیسی خاموشی کے ساتھ کس پر اسرار انداز سے وہ اڑے جارہے تھے...... پرے ہی پرے...... اُس نے اپنے دوست لطیف کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ اس کا نام لطیف کس نے رکھ دیا۔ صورت سے تو لطیف نہیں ہے...... یہ سوچ کر اُس نے دل ہی دل میں ہنس کر اپنے آپ کو داد دی...... اور وہ لطیف ابھی تک اُس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ ''میرے خیال میں اب تم سمجھ گئے ہو گے......''

''نہیں نہیں...... میں کچھ نہیں سمجھا...... تم عورت کی بات کہہ رہے تھے......''

شبیر پھر غور کرنے لگا۔ اُس نے پیچھے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹیک دیں۔ اب وہ پہلے کی نسبت کچھ مطمئن تھا۔ اُس نے دوست کی طرف دیکھا جیسے ...... ''ہاں بھائی! عورت کی بابت جو تم نے کہا وہ درست ہے۔ میرا بھی یہی تجربہ ہے...... کسی نے کہا ہے کہ عورت مرد کو زمین کی طرف کھینچے رکھتی ہے۔ وہ اُسے اس فانی دنیا ہی کا بنائے رکھتی ہے۔ اگر عورت نہ ہو تو مرد نہ معلوم کن رفعتوں کی طرف پرواز کر جائے۔

عورت بے وقوف بھی تو پرلے درجے کی ہوتی ہے۔ جب رات کو ہم تم دونوں

کھانا کھانے کے بعد بیٹھے بات چیت کرتے ہوتے ہیں تو تمہاری بیوی دوسرے کمرے میں سے ہاتھ سے اشارے کرتے ہوئے کہتی ہے...... اجی...... میں نے کہا...... ذرا...... اِدھر سنئے۔"

تم انجان بن کر پوچھتے ہو "بھئی کیا ہے؟"

وہ کنکھیوں سے تمہاری طرف۔ خاص تمہاری طرف دیکھتی ہوئی پھر ہاتھ سے اشارے کرتی ہے...... تم بظاہر برہم ہو کر بڑبڑاتے ہوئے چل دیتے ہو۔ اور پھر جب واپس آتے ہو تو ہر چند تم اپنی مونچھیں بڑی احتیاط سے صاف کر کے آتے ہو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ تمہاری بیوی نے تمہیں دودھ پینے کے لیے بلایا تھا۔ اور تم مجھ سے چوری سے دودھ پی کر معصوم صورت بنائے آگئے ہو...... حالانکہ یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ جب تم نے اندر جا کر اپنی بیوی کو ہاتھ میں دودھ کا گلاس تھامے ہوئے دیکھا ہوگا۔ تمہاری باچھیں کھل کر دونوں کانوں سے چھو گئی ہوں گی...... ذرا سوچو کہ کیا تم...... جو اتنے عقل مند بنے پھرتے ہو اس کی کوئی بہتر تجویز نہیں سوچ سکتے؟"

لطیف نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا جیسے اپنے گناہوں کا اعتراف کر رہا ہے "بھئی درست ہے۔ خدا نے مہمان کا درجہ بہت بلند رکھا ہے...... در اصل...... انسان واقعی بہت کمزور ہے میں بھی ایک انسان ہی تو ہوں۔ مجھ سے بھی غلطی ہو ہی جاتی ہے...... میں بھی کمزور ہوں...... یار! واقعی تم ہو تکلیف میں۔ میں جانتا ہوں تم ایک ذمہ دار دوست ہو۔ تم سے جب بھی ممکن ہوگا، تم چلے جاؤ گے اور بھئی اگر اس موقع پر میں تمہارے کام نہ آیا تو کب آؤں گا؟"

شبیر کے دل کی کدورت دور ہونے لگی۔ وہ کچھ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس طرح اپنے خیالات میں گم اُس نے دور کھڑے ہوئے درختوں کی طرف دیکھا۔ یہ دو درخت بھی دور سے کچھ عجیب ہی نظر آتے تھے جیسے وہ دونوں سرگوشی میں ایک دوسرے سے باتیں کر کے ہنس رہے ہوں۔

شبیر مہمانوں کی بابت سوچنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر لطیف کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہا ہو...... ''بھئی میں مانتا ہوں کہ مہمان میزبان کی بابت تو سب کچھ سوچتے ہیں۔ اس کے فرائض کی لمبی سی فہرست تیار کر لیتے ہیں۔ لیکن کبھی اپنے فرائض پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ بے شک مہمان کی یہی کوشش ہونی چاہئے کہ وہ میزبان کی تکلیف کا باعث نہ بنے۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری بھی یہی کوشش ہوتی ہے۔ میں نہیں جانتا شاید مجھ سے بھی غلطی ہو ہی جاتی ہو۔ یعنی باوجود اس قدر احتیاط کے بھی...... ممکن ہے...... لیکن بھئی تم تو بعض اوقات یوں ہی بگڑ جاتے ہو۔ مثلاً اُس دن کیا بات کی تھی میں نے ؟ یہی نا کہ آؤ ذرا باہر کھیتوں کی سیر کر آئیں۔ اس پر تم فوراً بگڑ گئے تم نے مجھے کچھ ایسی باتیں کہہ ڈالیں جو درحقیقت بالکل دور از کار اور بے معنی تھیں۔ ظاہر ہے کہ میری بات بالکل بے ضرر تھی۔ تم پر جو اس قدر شدید ردِعمل ہوا وہ بالکل بے جا تھا......''

لطیف نے اپنی انگلی منہ میں دبا رکھی تھی۔ اس وقت اُس کی آنکھیں پہلے کی طرح سکڑی ہوئی نہیں تھیں اور نہ اُس کے چہرے کے خطوط پہلے کی طرح مسخ ہو رہے تھے۔ اس وقت اُس کے چہرے سے ملائمت ٹپک رہی تھی۔ اُس کی دونوں بھوؤں کے درمیان کی لکیریں اس وقت پہلے کی نسبت مدھم دکھائی دے رہی تھیں اور آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی تھیں۔ اُس نے ایک گہری سانس لی۔ سینہ خوب اچھی طرح سے پھلا لیا۔ پھر اُس نے آنکھیں موند لیں اور پیچھے کی طرف جھک گیا جیسے کہہ رہا ہو ''واقعی بعض اوقات انسان دیوتا بن جاتا ہے اور کبھی بالکل ہی شیطان کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بھئی یقین مانو تمہارے یہاں ٹھہرنے سے مجھے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ جہاں اور اتنے لوگ کھانے والے ہیں تم بھی ان میں شامل ہوگئے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ بھئی خدا گواہ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے اور دیکھو نا یار بعض دفعہ میرا موڈ ہی کچھ بگڑا ہوا ہوتا ہے۔ مجھ ہی پر کیا منحصر، ہر آدمی کا یہی حال ہے...... کبھی کبھی دفتر میں جھگڑا ہو جاتا

ہے۔ ہمارے عملے کے آدمی ایسے بد خصلت ہیں کہ ہمیشہ لگائی بجھائی میں مصروف رہتے ہیں یعنی جس کام کی تنخواہ پاتے ہیں اُس کی طرف تو دھیان دیتے نہیں ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتے ہیں...... اور پھر بڑے افسروں کا تو خیر پوچھنا ہی کیا ہے وہ بھی ایک ہی کم بخت ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا نہ تو اپنا دماغ ہوتا ہے نہ کان نہ آنکھ...... بس جو کچھ ان کے پٹھوؤں نے کہہ دیا انہوں نے چپ چاپ اُسے تسلیم کر لیا۔ بھئی میں تو بعض اوقات پریشان ہو جاتا ہوں۔ تم جانتے ہی ہو میں نہ تو اس قسم کی باتیں کرنا پسند کرتا ہوں اور نہ سنتا...... کئی دفعہ دل چاہا استعفا داخل کر دوں۔ جان چھوٹے......
بس ان چھوٹے چھوٹے بچوں اور بیوی کا خیال آتا ہے تو دل مسوس کر رہ جاتا ہوں۔"

شبیر نے جوتے اتار دیئے اور پاؤں زمین پر ٹیک دیئے۔ اس کے پاؤں کے تلوؤں سے زمین کی ٹھنڈک اُس کی آنکھوں تک پہنچ گئی۔ اُس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ ہوا کے سرد جھونکے گریبان میں گھس کر اُس کی بغلوں میں گدگدی کر رہے تھے انہوں نے اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھا۔ دور سے گاؤں چاند کی چاندنی میں سوئے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہاں چلتی پھرتی زندگی کے آثار دکھائی نہ دیتے تھے۔ کوئی روشنی، کوئی حرکت، کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سول لائنز کی طرف سڑکوں پر کھڑے ہوئے بجلی کے کھمبے بھی ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے کھڑے کھڑے اونگھ گئے ہوں۔ اور ان کی روشنی بھی خواب ناک سی تھی۔ بادل کا اکا دکا ٹکڑا آسمان پر سبک خرامی سے اڑتا نظر آجاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاموشی کوئی ایسی متبرک شے تھی جسے توڑنے سے وہ بہت احتراز کرتے تھے۔

شبیر کو لطیف کا انکسار اور جھکے ہوئے سر کا انداز اس قدر پسند آیا کہ اُس نے نہ صرف اسے سب کچھ معاف کر دیا۔ بلکہ وہ یہ سوچنے لگا کہ کیا کبھی ایسا موقع بھی آئے گا جب وہ اس کے لیے کچھ کر سکے۔ وہ زمین سے ہاتھ اٹھا کر پھر پہلے کی طرح آگے کو جھک کر بیٹھ گیا۔ اس کے ذہن سے سارے دن کی تھکاوٹ دور ہوگئی آج اُسے لڑکوں

نے کس قدر زیادہ پریشان کیا تھا۔ ان میں ہر ایک کو اس سے یہی شکایت تھی کہ اُسے کم نمبر ملے ہیں۔ ان سے نپٹنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اُسے خواب میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ اُسے یہ کام بھی کرنا پڑے گا۔ اس پر اتنی قلیل تنخواہ اور پھر دھوبی کے اس روایتی کتے کی طرح نہ گھر کا نہ گھاٹ کا...... لیکن اب اس کی طبیعت بشاش تھی اور دل خوشی سے لبریز تھا۔

لطیف کا دفتر والوں سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ وہ ان کی ذلیل حرکتوں سے پہلے ہی تنگ آچکا تھا۔ آج تو حد ہوگئی تھی۔ آج تو اس نے صاحب کے پاس پہنچ کر سارا زہر اُگل دیا۔ وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا...... صاحب نے اُس کا یہ رنگ دیکھا تو اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ لیکن لطیف نے پروانہیں کی۔ اُس نے سوچا جو ہو سو ہو آج تو اُسے جو کچھ کہنا ہے وہ کہہ کر رہے گا۔

...... جب وہ بول چکا تو اس نے دیکھا کہ عملے کے سب لوگ اِدھر اُدھر سے صاحب کے کمرے میں جھانک رہے ہیں۔ صاحب نے سب کو چلے جانے کا حکم دیا۔ اُس کو جو کچھ کہنا تھا سو کہہ چکا تھا۔ اب اس پر خوف طاری ہونے لگا۔ دیکھیں اب صاحب کا کیا حکم ہو...... صاحب نے نرم آواز میں یہی کہا کہ میں پوری تفتیش کروں گا...... اسی وجہ سے اس کی طبیعت اور بھی زیادہ مضمحل ہو رہی تھی۔ لیکن اب وہ بے پروا ہو بیٹھا تھا۔ اس کے جسم اور ذہن کی تکان دور ہوچکی تھی۔ زندگی خوش گوار نظر آنے لگی تھی۔ اُسے کیا پروا اگر کل صاحب اسے نوکری سے بھی برخاست کردے تو اس وسیع اور عریض دنیا میں اس کے سر چھپانے کے لیے جگہ کی کچھ کمی نہ تھی۔ اب وہ پہلے کی نسبت اپنے دل میں ایک نئی امنگ محسوس کر رہا تھا۔ اُسے زندگی کی دشوار گزار گھاٹیاں عبور کرنا محض ایک کھیل معلوم ہو رہا تھا۔

ہوا کچھ تیزی سے چلنے لگی۔ لیکن اس قدر تیزی کے ساتھ بھی نہیں کہ درختوں کے پتے تالیاں بجانے لگیں۔ یا سائیں سائیں کی آواز آنے لگے۔ جوہڑ کے پانی کی سطح

پر چھوٹی چھوٹی لہریں اٹھنے لگیں۔ اور چاند کا عکس سنہری کشتی کی طرح ہچکولے کھانے لگا بعض اوقات تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کشتی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھی چلی جارہی تھی۔ لیکن باوجود ہچکولوں کے کشتی وہیں کی وہیں تھی۔ ہوا کے خنک جھونکے پہلے تو کھیتوں میں اُگے ہوئے پودوں کے ہمراز بنے اور پھر ان پودوں کی نم دار زمین اور گھاس کی بھینی بھینی خوشبو اڑا کر اُن دونوں کے قریب سے گزرتے ہوئے آسمان کے پرندوں کی طرح نئی زمینوں کی طرف اڑ گئے۔ اور وہ بے کراں خاموشی گہری ہوتی گئی۔ کسی آواز کا نام و نشان تک نہ تھا۔ زمین کا ذرہ ذرہ اپنی جگہ ساکن پڑا تھا۔ رات بھیگی جارہی تھی۔ سکوت بڑھتا جا رہا تھا...... اور پھر اس گہرے اور متبرک سکوت میں سے ایک نئی آواز ایک نیا نغمہ بلند ہوا...... لیکن ایسی آواز...... کہ اس آواز اور مکمل خاموشی میں حد فاصل قائم کرنا قریب قریب ناممکن تھا دھرتی کی چھاتی پر اُگی، بچھی، بہتی اور چلتی پھرتی ہر شے اُسے سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوگئی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ لطیف نے جیب ٹٹول کر سگریٹ کیس نکالا اور ان دونوں نے ایک ایک سگریٹ منہ میں لے لیا۔ سگریٹ سلگا کر لطیف نے دھواں اڑاتے ہوئے کوئی مزے دار بات سنانے کے لیے منہ کھولا۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

روشنی

فلیٹ نمبر 4 والے بیچ کے کمرے کی کھڑکی میں سے آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ آسمان کی رنگت ایسی تھی جیسے کسی مصور نے کھردرے کاغذ کی سطح پر گدلے، پھیکے اور مٹیالے رنگ پھیلا دیئے ہوں۔ لیکن بے ترتیب اور بلا توازن۔

کمرے کے فرش پر دو پاؤں الٹی طرف کو ہٹ رہے تھے یہ دو پاؤں تقریباً چودہ سالہ لڑکے تھے، میلے، گیلے، پھولے ہوئے اور دو پاؤں آگے کی طرف بڑھ رہے تھے جرابوں میں لپٹے ہوئے بڑے بڑے پاؤں۔ پنڈلیوں پر کالے کالے گھنے بال۔

''حرامی کے بچے! آئینہ اوپر کو رکھ۔''

حرامی کے بچے نے پہلے اپنی ناک میں سے تیز سرر کی آواز نکالی اور منہ کھول کر آئینہ اوپر کو اٹھا دیا۔

''آؤ میری بلی!''

بلی خاموش تھی — رنگین گرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی۔ اس وقت اس کے چھوٹے چھوٹے نرم اور گورے ہاتھ دستانوں سے باہر تھے۔ آنکھوں میں نیند کا سا خمار تھا۔ گال خوب پھولے ہوئے تھے۔

''لو ہم نے تو داڑھی پر الٹی طرف سے بھی استرا پھیر ڈالا — یعنی ہمارے کلو کی

روز روز کی شکایت بھی رفع ہوئی۔ اب چاہئے کہ ہماری کٹو بھی رانوں پر حلوا باندھا کرے......"

ہماری کٹو نے چپیں بجبیں ہو کر آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ اس نے دیکھا کہ ہماری کٹو اس بات پر کچھ برہم سی نظر آتی ہے۔

"کیوں بے کتے کے پلے تو ان باتوں کو سمجھتا ہے، آئینہ اوپر کو رکھ۔"

کتے کے پلے نے الو کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر صابن کی جھاگ میں جلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھا۔ پھر اس کی ناک میں سرر کی تیز آواز پیدا ہوئی — اور اس نے نیچے کا جبڑا ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس کا منہ بے معنی طور پر کھل گیا......

"سگریٹ پی لو یا داڑھی ہی مونڈ لو......"

"لو یہ کچل کر رکھ دیا سگریٹ ہم نے — اور کچھ؟"

"کتنے کے سگریٹ پیتے ہو ہر روز؟"

"سگریٹ یا سگار بھی؟"

"سگار بھی"

"پائپ بھی؟"

"پائپ بھی"

"یہی آٹھ دس سگار، بیس تیس سگریٹ، پانچ یا چھ حد ہے آٹھ مرتبہ پائپ۔"

"کتنے کے؟ — میں پوچھتی ہوں۔"

"یہی دو روپے کے"

"کتنے عرصہ سے؟"

"یہی کوئی تیس سال سے"

"اگر تم اتنے روپے جمع رکھتے تو آج وہ سامنے کی بلڈنگ تمہاری ہو سکتی تھی۔"

"اوہو ہو ہو واہ وا — یہ لطیفہ کہاں سے پڑھا تم نے...... سچ سچ کس نے بہکا دیا ہماری کٹو کو؟"

"— —"

''خفگی؟ چہ؟ — دیکھو ڈارلنگ!

میں تو یوں ہی..... ہاں بھئی کون سی بلڈنگ؟ ...... وہ پیلے رنگ کی؟...... اچھا تو وہ جس پر ہوٹل ڈی پیلس لکھا ہوا ہے...... ایں؟ ......نہیں؟ ......تو وہ کہو نا جس پر رات کو نیلے حروف چمکتے ہیں؟ ...... او ہو تو تمہارا مطلب اس سیٹھ ڈھینگرہ کی بلڈنگ سے...... ہاں ہاں یوں کہو یعنی سب سے اونچی...... ارے بھئی جس کے پیچھے چھوٹی چھوٹی جھونپڑیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ یہ جھونپڑیاں بھی خوب ہیں میں انہیں دیکھتا ہوں تو مجھے نوشیرواں کے محل کے پاس بڑھیا کی جھونپڑی یاد آجاتی ہے تم نے وہ قصہ پڑھا ہے؟''

جدید طرز کی بڑی بڑی عظیم الشان عمارتوں کے ساتھ ساتھ جھونپڑیوں کا یہ سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ عمارتیں اگر زمانۂ حال کی جدت طرازیوں کے اعلا نمونے تھیں تو جھونپڑیاں ان عظیم الشان عمارتوں کا منہ چڑاتی تھیں۔ انسان کی عظمت اور ذلت ہاتھ میں ہاتھ دیئے کھڑی تھیں۔ اونچے مکانوں والے جھونپڑیوں کو ہر روز دیکھتے تھے۔ جھونپڑیوں کے رہنے والوں ان فلک بوس عمارتوں کو بلا ناغہ دیکھا کرتے تھے۔ اور وہ ایک دوسرے کے اس قدر عادی ہوگئے تھے کہ جھونپڑیوں کے مکینوں کو اونچے مکان والے کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اور اپنے مکانوں کے رہنے والوں کو اپنی ذات کا احساس ختم ہوگیا تھا۔

یہ بھیک مانگنے والوں کی بستی تھی۔ باقی شہر کے بیچوں بیچ رہتے ہوئے ان سے علاحدہ ان کی دنیا ہی اور تھی۔ یہاں کا اخلاق اور قوانین الگ تھے۔ اس جگہ زندگی کے نظریے ہی اور تھے۔

یہاں پر جھوٹ ٹھگئی فریب کا اتنا ہی زور تھا۔ جتنا کہ اونچے محلوں میں۔ اپنی اس پست حالت سے ان بھکاریوں کو کوئی عبرت حاصل نہ ہوتی تھی۔ اُنہوں نے اس سے

اوپر اٹھنے کا خیال ہی ترک کر دیا تھا ان کے سامنے یہ سوال ہی نہ تھا۔ ان کی زیادہ سے زیادہ جس حد تک پرواز ہوسکتی تھی وہ اسے بخوبی سمجھتے تھے۔ اپنے دائرہ سے نکلنے کی جد و جہد کرنا تو دور کی بات رہی انہوں نے اس قسم کی باتیں کبھی سوچی تک نہ تھیں۔ اور در حقیقت اس قسم کے خیالات کا ان کے دل میں پیدا ہونا ہی ان کے قیاس سے باہر تھا۔ محرومی اور مظلومیت کا اظہار کرنا ان کے ہاں فن کا درجہ رکھتا تھا اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ در حقیقت وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے تھے۔ وہ بالکل آزاد تھے وہ جو چاہتے تھے۔ مظلوم ہوتے ہوئے انہیں خیال تھا کہ وہ مظلوم نہیں۔ اپنے حقوق پامال ہوجانے پر بھی وہ یہی سمجھتے تھے کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں۔ بھوک ان کے لیے ایک قدرتی بات تھی اس قدر قدرتی کہ انہیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ہر ایک مرتبہ دستر خوان پر بیٹھ کر پیٹ بھر کر نفیس غذا کھانا کیا ہوتا ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے ان کے دل مطمئن تھے۔

اپنے محدود دائرے میں وہاں بھی اچھے اچھے دولت مند بستے تھے۔ جنہوں نے مانگ مانگ کر بہت بڑی بڑی رقمیں جمع کر لی تھیں۔ وہاں اپنی حدود کے اندر ظالم بھی تھے مظلوم بھی۔ طاقت ور بھی تھے کمزور بھی۔ بہادر بھی تھے بز دل بھی۔ موجودہ نظام کی سب سے بڑی لعنت یہ ہے کہ انسان ہر شے سے محروم ہوتے ہوئے بھی یہی سمجھتا ہے کہ اس پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ آزاد ہے۔ جو جی میں آئے کر سکتا ہے جو دل چاہے حاصل کرسکتا ہے۔ جدھر چاہے جاسکتا ہے۔ انسان روز ازل سے اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے لیکن خود فریبی کی یہ انتہا پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔

ان بھکاریوں میں ایک وہ شخص ہے جس نے اپنے کمسن بچے کی دونوں ٹانگیں کاٹ کر اسے اپاہج بنا دیا تاکہ اس کے نام پر روپیہ جمع کر سکے۔ وہ خود اچھا خاصہ موٹا تازہ شخص ہے اگر واقعی کوئی مہذب سوسائٹی موجود ہو تو وہ ایک اچھا شہری بن سکتا تھا۔ لیکن نہیں، آخر ہمارے نظام کی کون سی کل خراب ہے کہ جس کی وجہ سے ایک طرف دن رات گلا پھاڑ پھاڑ کر انسانیت کا ڈھول پیٹنے والوں کے کان پر جوں نہیں رینگتی اور وہ

ایسے جرائم سے چشم پوشی کر لیتے ہیں۔ اور دوسری طرف ایک پست انسان اس قدر پست تر ہو چکا ہے کہ اس قسم کے گھناؤنے فعل کرنے سے باز نہیں آتا۔

ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے بچوں کے بازو اور ہاتھ کاٹ کر یا آنکھیں بے کار کر کے انہیں کرائے پر دے دیتے ہیں۔ بھیک مانگنے والوں کو ایک بہانا چاہئے۔ جسے بھیک مانگنی ہوتی ہے وہ ان میں سے کوئی اولاد یا لنگڑا بچہ اٹھا کر بازار کو چل دیتا ہے۔

وہ لوگ بھی انہیں میں شامل ہیں جو ایک اپاہج شخص کو چار پہیوں والے لکڑی کے صندوق میں بٹھا کر بازاروں میں گھماتے ہیں اور خود صحیح و سالم پانچ چھ آدمی کھڑ تالیں بجاتے ہوئے آگے آگے چلتے ہیں۔ اس ایک شخص کے سر پر وہ سب روٹی کھا لیتے ہیں۔

اس قسم کے لوگ بھی ہیں جو بھیک مانگ کر مال دار ہو گئے ہیں۔ لیکن وہ اپنے روپے زمین میں گاڑے جا رہے ہیں۔ نہ معلوم وہ اس کا کیا کریں گے۔ بعض فقیر اسی طرح مر جاتے ہیں اور جب ان کی جھونپڑیوں کے اندر زمین کھودی جاتی ہے تو بڑی بڑی رقمیں مل جاتی ہیں۔ ان میں ایسے انسانوں کی بھی کمی نہیں جو آپس میں ایک دوسرے کے ہاں چوریاں کرتے ہیں۔ وہ شیطان لڑکے، گھومتے رہتے ہیں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں بڑھیاں کی فلاں کٹوری میں پیسے جمع رہتے ہیں فلاں بھکاری اپنی کمائی ایک چیتھڑے میں باندھ کر آٹے کی فلاں ہانڈی میں چھپا کر رکھتا ہے۔

سارا سارا دن بھیک مانگنے اور دکھ بھری صدائیں لگا لگا کر لوگوں کو دعائیں دینے والے جب شام کے وقت ستانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو حالات اور واقعات پر اسی طرح تبصرہ کرتے ہیں جیسے اونچے مکانوں والے۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی مکاریوں اور جعل سازیوں کا اسی فخر سے ذکر کرتے ہیں جس طرح کہ اعلا اور متوسط طبقے کے لوگ کرتے ہیں۔

ان میں بعض بہت شریر، بعض بدمعاش، بعض چور، بعض دھوکے باز بعض ایمان

دار اور بعض بھگت مشہور ہیں۔ ان بھگتوں میں چانسو کا نام بھی لیا جاتا ہے — جن لوگوں کو ہمارے اس طبقہ سے جسے ہم بھکاری کہتے ہیں کچھ دلچسپی رہی ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں بعض ہستیاں واقعی بہت پر اسرار ہوتی ہیں۔

ان میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو پہلے کبھی اچھے خاصے کھاتے پیتے، ہنستے، کھیلتے شہری تھے۔ لیکن پھر اُن کے دماغ کو کوئی ایسا صدمہ پہنچا کہ وہ حواس کھو بیٹھے۔ اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور پھر ان بھکاریوں میں جا ملے۔ ان میں سے کئی تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں اور ہم بعض مرتبہ بازار میں گزرتے ہوئے کسی بھکاری کو شستہ انگریزی میں اپنے آپ ہی سے گفتگو کرتے دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے حواس قائم ہوتے ہیں لیکن دماغ کا کوئی نہ کوئی پیچ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔ یا زندگی میں ان کو کوئی اس قسم کا حادثہ پیش آتا ہے کہ ان کے لیے گھڑی کی سوئیاں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رک جاتی ہیں۔ رواں دواں زندگی کو بریک لگ جاتی ہے۔ ان کا ذہن آگے بڑھنے سے انکار کر دیتا ہے۔

چانسو بھی کچھ اسی قسم کا انسان نظر آتا تھا۔ وہ کون تھا؟ کہاں سے آیا؟ کسی کو اس بات کا کچھ علم نہ تھا۔ جس طرح کوڑے کرکٹ کے بڑے ڈھیر پر کہیں سے ایک اور ٹوکری آن گرتی ہے۔ اسی طرح ایک روز ان کی بیسیوں غلیظ جھونپڑیوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا۔ جب وہ پہلے پہل آیا تو ادھر اُدھر کے بھکاری آتے جاتے اس کے قریب رک جاتے تھے اس سے باتیں کرتے۔ لیکن وہ باتیں نہ کرتا تھا۔ وہ دوسروں ہی کی طرح غلیظ تھا۔ اس کی صورت سے جہالت کے آثار اسی طرح ہویدا تھے۔ جیسے دوسروں کے چہروں کے۔ اس کی عمر چالیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ اکہرے بدن کا ایک معمولی شخص تھا۔ اس کے بال بڑے سخت اور کانٹوں کی طرح اٹھے ہوئے تھے۔ اس کی پیشانی تنگ تھی اس کی آنکھوں کے گوشوں پر چھوٹی چھوٹی لکیروں کا اجتماع ہو رہا تھا۔ ناک کے نتھنوں کے قریب سے دو لکیریں پھیل کر نیچے تک چلی گئی تھیں۔ وہ کھوئی

کھوئی نظروں سے خلا میں ایسے گھورا کرتا تھا۔ جیسے وہ تاریکی میں دیکھ رہا ہو اور اُسے کچھ بھی نہ دکھائی دے رہا ہو۔ اس کی آنکھیں معمول سے زیادہ کھلی رہتی تھیں۔ اگر چہ اُس نے اپنے منہ سے کبھی ایک لفظ تک نہ نکالا تھا لیکن اس کے منہ کی بناوٹ ایسی تھی جیسے وہ ابھی کچھ کہے گا۔ کوئی بڑی زور دار بات کہے گا۔ ایسی کہ زمین اور آسمان کے درمیان ساری فضا گونج اٹھے گی۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ ہر گھڑی یہی گمان ہوتا تھا کہ وہ اب بولا تب بولا۔ لیکن اس کے لبوں میں ایک مبہم سی حرکت پیدا ہوتی اور پھر وہ کچھ کہے بغیر رہ جاتا۔

پہلے پہل جب وہ لوگ اس نئے آدمی سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے گئے تو بظاہر وہ ان کی طرح بھلا چنگا نظر آتا تھا۔ لیکن جب اُنہوں نے کوئی بات پوچھی تو اُس نے جواب نہیں دیا۔ تو پھر تند و مسخرے نے اس کی بانہہ کھینچ کر کہا ''ابے بھتنی کے بول...... بولتا کیوں نہیں۔''

اس وقت چانسو نے معاً اس کی طرف دیکھا اور اس کا منہ بالکل ایسے دکھائی دینے لگا جیسے وہ ابھی کچھ نہ کچھ کہہ ڈالے گا۔

سب لوگ ہنستے ہوئے پیچھے کی طرف سرک گئے۔ لیکن اس نے کچھ نہ کہا۔ البتہ اس کا منہ اُسی طرح بنا رہا۔

ایک بیوہ نے اُسے اپنے جھونپڑے کے ساتھ ہی ایک نیا جھونپڑا بنا دیا اور وہ اس میں رہنے لگا۔

اس کے اس بستی میں آجانے سے یہاں کے رہنے والوں کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ انہوں نے کسی قسم کی تبدیلی محسوس نہیں کی۔ پہلے چند لڑکوں نے اُسے چھیڑا اور اسے چانسو چانسو!! کہہ کر پکارنے لگے۔ اور پھر سبھی اسے اسی بے معنی نام سے یاد کرنے لگے۔ اس نے جھونپڑے کے باہر چار اینٹیں جوڑ کر چبوترا سا بنا لیا۔ فرصت کے وقت وہ ان اینٹوں پر جا بیٹھتا۔ بیٹھے بیٹھے یوں ہی فضا میں اس طرح دیکھنے لگا جیسے اسے

کوئی خاص شے نظر آ گئی ہو۔ یا جیسے وہ کسی دھندلی یا چھپی ہوئی چیز کو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں وہ آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر لیتا اور سر گھما گھما کر بڑے غور سے دیکھنے لگتا۔ اور پھر کبھی اس کی گردن تن جاتی۔ نتھنے لرزنے لگتے اور اس کے منہ کی کچھ ایسی صورت بن جاتی جیسے وہ کچھ کہنے کو ہو۔ کوئی بڑی پرزور بات۔ لیکن وہ چپ رہ جاتا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی کوئی شے کھو گئی ہے جسے وہ ڈھونڈ رہا ہے۔ جو اسے صاف طور پر دکھائی نہیں دی یا روشنی کی کمی کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتا— جیسے اسے کوئی بڑی اہم بات کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے وہ بات کہنے کی کوشش کی لیکن کہہ نہ سکا۔ اب تک وہ بات اس کے ذہن میں محفوظ تھی اور اس کے لبوں تک آنا چاہتی تھی لیکن زبان انہیں کسی نامعلوم وجہ سے بیان نہ کرسکتی تھی۔ اس کے ذہن کی یہ بات ایک اور ایسا راز تھی جس پر سے پردہ اٹھ جانے کی کبھی بھی امید نہ کی جاسکتی تھی۔

ہوٹل ڈی پیلس کی پچھلی طرف کی کھڑکیوں میں اندر کے مناظر دیکھے جاسکتے تھے۔ جب کبھی موسلا دھار بارش ہو رہی ہوتی تھی تو اس فٹ پاتھ پر بیٹھ کر مانگنے والے سب بھکاری اپنی جھونپڑیوں میں جا گھستے تھے۔ لیکن چانسو اپنی جگہ سے نہ ہلتا تھا۔ پچھلی جانب سے میونسپلٹی کی لالٹین لگی ہوئی تھی۔ یہی اس کا اڈا تھا۔ بلاناغہ شام کے وقت وہ اسی کھمبے کے قریب کھڑا ہو جاتا تھا۔ چپ چاپ، بلا کسی قسم کی حرکت کیے مٹی کے بت کی طرح۔ اس کی نظریں اندر کی طرف جمی ہوتی تھیں۔ اندر بجلی کی تیز روشنی میں اچھے اچھے کپڑے پہنے لوگ چہلیں کرتے پھرتے تھے۔ ان کی خدمت کرنے والے بیرے سفید وردیاں پہنے ہوئے سر پر کلاہ والی پگڑیاں باندھے ادھر اُدھر گھوما کرتے تھے۔ ان کے کمر سے لپٹے ہوئے سبز رنگ کے پٹکے اور ان پر پیتل کے حروف ان کے لباس کی شان کو دوبالا کرتے تھے۔

آندھی ہو برسات ہو چانسو باہر اسی کھمبے کے پاس کھڑا رہتا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آگے کو بڑھا رہتا تھا۔ لیکن اسے بڑھانا بھی یاد نہ رہتا تھا۔ بس وہ یوں ہی کھڑا

ہو جاتا۔ لوگ اس کے قریب سے گذر جاتے تھے کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیوں کھڑا ہوا ہے اگر کبھی وہ ہاتھ بڑھا دیتا تو جب تک وہ اس جگہ کھڑا رہتا اس کا ہاتھ اسی قدر آگے بڑھا رہتا تھا۔ سکون اور بے حسی اس پر اس شدت سے طاری تھی کہ وہ گھنٹوں بلا حرکت کیے بٹھایا کھڑا رہ سکتا تھا۔

وہ نہ دعائیں دیتا تھا نہ منت کرتا تھا۔ بس اس کا ہاتھ آگے بڑھا رہتا جس سے معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ حاجت مند تھا۔ اپنے ساتھیوں کی طرح اسے آنے جانے والوں کی کامیابی، صحت یا ان کے بچوں کی پرواہ نہ تھی۔ وہ مرے یا جئیں اس کی بلا سے۔ اسے بھوک محسوس ہوتی تھی۔ اس لیے وہ ہاتھ بڑھا دیتا تھا۔ لیکن اس کو بہت کم پیسے ملتے تھے۔ لوگوں کو اس کا پتہ ہی نہ چلتا تھا۔ انہیں اس کے وجود کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ بعض اوقات جب اسے بہت شدت کی بھوک لگی ہوئی ہوتی تھی۔ اور اسی طرح کھڑے کھڑے بہت زیادہ وقت بیت جاتا تو بعض اوقات وہ کسی بابو کو دیکھ کر خفیف سا آگے کو جھکتا۔ اس کے ہونٹ سمٹ جاتے اور پھر اس کی صورت سے یوں دکھائی دیتا کہ اب وہ اس بابو کو کچھ کہے گا۔ کوئی بڑی زور دار بات اچھل کر اس کے لبوں سے باہر نکل جائے گی۔ یہ کیفیت بہت ہی شدید صورت اختیار کر لیتی۔ لیکن نتیجہ وہی نکلتا کہ وہ خاموش کا خاموش رہتا...... جیسے کسی غیر معمولی طاقت کے زیر اثر اس کی زبان کی قوت زائل ہوگئی ہو۔

اس بستی سے دو فرلانگ پرے سکھوں کا ایک بہت بڑا گوردوارہ بھی تھا جس کی پر شکوہ عمارت پر جس قدر روپیہ خرچ آیا تھا اس رقم کے دس ہزار ویں حصہ سے اتنی اینٹوں خریدی جاسکتی تھی جس سے ان سب بھکاریوں کا صفایا کیا جاسکتا تھا۔ بڑے بڑے امیر سکھ اور عورتیں اور مرد قیمتی کپڑے زیب تن کیے اس غلیظ بستی میں سے صحیح سالم نکل کر گورو گرنتھ کے چرنوں تک جا پہنچتے تھے خواہ ادھر سے متبرک گورو گرنتھ صاحب کی روح اپنے ان غلیظ اور کچلے ہوئے ہندوؤں کی بستی پر منڈلاتی پھرتی ہو۔ بارہا وہ لوگ باجے اور ڈھلکیاں بجاتے اور شبد گاتے ادھر سے گذر جاتے۔ اور جانسو گرنتھ صاحب کو دیکھتا تو

یکا یک پھر اس کے منہ کی وہی صورت ہو جاتی جیسے وہ کوئی بات کہنے کو ہے لیکن وہ کچھ نہ کہہ پاتا— وہ تاریکی میں بھٹکتے ہوئے شخص کی طرح ادھر اُدھر دیکھتا لیکن اس کے بشر سے یہی ظاہر ہوتا جیسے اسے کچھ بھی نہیں دکھائی دیتا۔

بعض اوقات فرزندان اسلام بھی جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے ادھر سے گذرتے تھے۔ اس وقت وہ عموماً صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتے تھے۔ بعض ان میں غریب بھی ہوتے تھے۔ بعض بڑے بڑے خان ہوتے تھے۔ جن کے طرے ہوا میں لہراتے تھے۔ اور جن کی نظریں بلند ہوتی تھیں۔ وہ سینہ تان کر اور سر بلند کر کے چلتے تھے۔ اس وقت چانسو ہاتھ پھیلا کر ان کے رستہ میں کھڑا ہو جاتا تھا۔ وہ ہجوم خدا کے گھر کی طرف بڑھا چلا جاتا تھا۔ خدا کے بندوں کی طرف دھیان دینے کا انہیں خیال ہی نہ آتا تھا یا اس کی ضرورت ہی نہ سمجھتے تھے۔ جب ہجوم گذر جاتا تو ان کے پیچھے اڑتی ہوئی گرد چانسو کے حصے میں آتی تھی۔ اور وہ وہاں سے ہرگز نہ ٹلتا تھا جب تک کہ ان کے پیروں سے اڑی ہوئی ساری گرد سے اس کا چہرہ، بال، بھنویں، اٹ نہ جاتی تھیں۔ وہ وہاں بت بنا کھڑا رہتا جیسے وہ چپ چاپ صدائے احتجاج بلند کر رہا ہو۔ لیکن اس کی آواز کوئی شخص نہ سن سکتا۔ اس کا چہرہ عام طور پر جذبات سے عاری ہوتا تھا۔ اس طرح تیز دھوپ میں کھڑے کھڑے وہ اپنا ہاتھ آگے بڑھائے رکھتا۔ شاید یہ عالم تصور میں وہ اب بھی ایک جم غفیر اپنے سامنے سے گذرتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یا شاید اسے انسانوں کی بخشش کی اتنی پرواہ بھی نہ تھی۔ شاید آسمان سے کسی چیز کے ٹپک پڑنے کی امید تھی۔ لیکن جو کچھ بھی وہ سوچتا ہو۔ وہ کبھی کبھی سانس لیتے ہوئے جاندار سے اک دم پتھر میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جھونپڑی میں سے بیوہ کا لڑکا باہر نکل آتا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اندر لے جاتا۔

اس کھلے میدان میں بڑے بھاری بھاری جلسے منعقد ہوتے تھے۔ کبھی وہاں ترکی ٹوپیوں کے پھندنے ہوا میں اڑتے دکھائی دیتے تھے۔ اور ''اللہ اکبر'' کی صدائیں بلند ہوتی تھیں۔ کبھی کرپانوں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ اور گرج دار آواز میں

بلند بول سنائی دینے لگتے تھے۔ لیکن ان جھونپڑیوں کی دنیا میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا نہ ہوتی۔ وہ لوگ سب کے ساتھ رہتے ہوئے بھی ان سے کوسوں دور تھے۔

رات کے وقت ادھر سے گذرنا خطرناک سمجھا جاتا تھا۔ اونچے مکانوں کے رہنے والوں کا خیال تھا کہ اس علاقے میں شہر بھر کے بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگ رہتے تھے۔ امریکہ سے آئے ہوئے سپاہی یا غیر ممالک سے آئے ہوئے سیاح جب رات کو سینما ہاؤس یا ناچ گھر میں وقت گذارنے کے بعد ادھر سے گذرتے تھے۔ تو گوبر کے ڈھیروں کی طرح دکھائی دینے والی ان جھونپڑیوں اور رات کی تاریکی میں چھچھوندروں کی طرح چھپ چھپ کر چلنے اور دیدے چمکانے والی ان کالی کالی صورتوں کو دیکھ کر سمجھتے تھے کہ اس وقت وہ پر اسرار مشرق میں گھوم رہے ہیں اور پھر واپس جاکر وہ اپنے ہم وطنوں کو اس جگہ کے قصے سناتے تھے کہ ایک روز رات کے وقت انہیں کسی پر اسرار جگہ میں سے ہو کر گذرنا پڑا جہاں غلیظ انسان جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرتے تھے۔ اور پھر وہ ان بھوکے اور ننگے انسانوں کے گھناؤنے پن کا ذکر کرتے تھے۔

ایک رات گیارہ بجے کے قریب جب کہ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ چانسو آوارہ گھومنے کے بعد جھونپڑیوں کی طرف آرہا تھا۔ جب وہ گندہ نالے کے بوسیدہ اور چرچراتے ہوئے پل سے گذرا تو اس نے دیکھا کہ کالی کالی جھونپڑیوں سے پرے ڈی پیلس کی چھت پر کچھ روشنی سی ہو رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا آج چوں کہ موسم خوش گوار تھا اس لیے رقص و سرود کی محفل ہوٹل کی چھت پر منعقد کی گئی تھی...... وہ چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا اور سست قدموں سے اپنی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

اس کی جھونپڑی کے قریب اس بیوہ کی جھونپڑی تھی جس نے رحم کھا کر اُسے بھی ایک جھونپڑی کھڑی کر دی تھی۔

بیوہ کا دس گیارہ برس کا لڑکا اس وقت ماں سے جھگڑ رہا تھا۔

ہوٹل ڈی پیلس پر وقتاً فوقتاً آتش بازی کا تماشہ بھی دکھائی دیتا تھا۔ کبھی ایک انار

پھوٹ کر اس میں سے رنگین چنگاریاں پانی کی بوچھاڑ یا فوارے کی طرح ادھر کو اٹھ کر نیچے گرتی بہت دل فریب معلوم ہوتی تھیں۔ لڑکا اپنی ماں سے ضد کر رہا تھا کہ وہ اسے بھی کہیں سے آتش بازی کے انار لا کر دے۔ بیوہ حیران تھی کہ وہ انار کہاں سے لائے۔ ان دونوں میں کتنی ہی دیر تک جھگڑا ہوتا رہا۔ اور جب چانسو اپنی جھونپڑی میں گھس بیٹھا تو اسے ان دونوں کی کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز سنائی دیتی رہی۔ آخر ماں نے ہار مان لی۔ وہ انار لانے کے بہانے سے اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی اور دبے پاؤں چانسو کی جھونپڑی کے قریب دبک کر بیٹھ گئی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ لڑکا کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد سو جائے گا اور پھر وہ بھی اندر جا کر پڑ رہے گی۔

چانسو کے کانوں تک ان دونوں کی آوازیں پہنچتی رہی تھیں۔ جھونپڑی کے اندر برائے نام ہی روشنی تھی۔ وہ اسی طرح تاریکی میں بیٹھا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ ان عجیب و غریب انسانوں کی بستی میں اس کا وجود ایک معمہ سے کم نہ تھا۔ اس کا بے حس اور جذبات سے خالی چہرہ اس وقت کسی درندے سے مشابہ تھا...... اس نے جھونپڑی کے دروازے میں سے دیکھا کہ لڑکا دبے پاؤں ہوٹل ڈی پیلس کی طرف بڑھ رہا ہے...... دفعتاً وہ بھی چپکے سے چوپائے کی طرح چلتا ہوا جھونپڑی سے باہر نکلا۔ اور لڑکے کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

لڑکا ہوٹل کے پچھواڑے ایک دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور منہ اٹھا کر ہوٹل کی چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

چھت پر رنگ برنگ کی روشنی ہو رہی تھی۔ سیاہی مائل آسمان اور زرد رو تاروں کا پس منظر رنگوں، اور ادھر پیلے سبز اور سرخ رنگوں کی روشنی اوپر کی جانب پھیل کر تاریکی میں گھل مل گئی تھی۔ نیچے سے سوائے روشنی کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ رسیلے سازوں کی آواز اور گھنگروں کی جھنکار سنائی دے رہی تھی یا کبھی رقص کرتی ہوئی نوخیز عورتوں کی کلائیاں اور کنول سے ہاتھ چشم زدن میں ادھر سے اُدھر گھوم کر غائب ہو جاتے جیسے بجلی چمک جائے۔ غالبًا ایک سے زیادہ عورتیں رقص کرتی ہوئی اِدھر اُدھر چکر لگا رہی تھیں۔

ان کے ہوا میں اڑتے ہوئے ارغوانی، دھانی، اور ہلکے زرد اور سرخ رنگ کے دوپٹے لہریں لیتے ہوئے رنگین ساریوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

جب چانسو لڑکے کے قریب پہنچا تو لڑکے نے چونک کر ایک لمحہ کے لیے اس پر نگاہ ڈالی اور اسے پہچان کر اطمینان سے پھر اوپر کی جانب دیکھنے لگا۔ ملگجی روشنی میں اس کے طفلانہ چہرے سے کس قدر اشتیاق ظاہر ہو رہا تھا۔ اس کی ناک پر کہیں سے تھوڑی مٹی لگ گئی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے کھڑا تھا۔ اُس کی اوپر کو اٹھی ہوئی ٹھوڑی کے نیچے اس کی نرم نیالی گردن پر جس جگہ بل پڑتے تھے وہاں میل جم کر تین چار ہلکے ہلکے خطوط بن گئے تھے۔

چانسو اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ جب پھر انار چھوٹے تو لڑکے نے چانسو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مسرت سے چلاّ کر کہا۔ ''وہ دیکھو...... ہا کیسی روشنی ہو رہی ہے۔''

چانسو کے لبوں پر مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی...... وہ لڑکے کی طرف بڑی رحم بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔ اور اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا...... اور لڑکے کی نرم و نازک گردن ٹٹول کر ہاتھ میں پکڑ لی...... پھر اس کی گرفت تنگ ہونے لگی...... ایک مہیب چیخ لڑکے کے حلق میں سے نکلی...... لیکن پھر وہ بول نہیں سکا...... کش مکش کرتا رہا...... چانسو کی غیر معمولی طور پر باہر نکلی ہوئی آنکھیں درست حالت میں آنے لگیں...... لڑکے کی ماں بھاگی بھاگی آئی...... اس نے دیکھا کہ چانسو روشنی کی طرف دیکھ رہا ہے...... اس کے منہ کی بناوٹ ایک مرتبہ پھر ایسی ہوگئی جیسے وہ کوئی بڑی اہم بات کہنے کو ہو...... لفظ اس کے منہ سے نکل کر فضا میں پھیل گئے ''روشنی! ...... روشنی...... دیکھ روشنی!''

خون!...... خون!!

روشنی! ...... روشنی!!

یہ افسانہ 'افسانوی مجموعہ 'ہندوستاں ہمارا' میں شامل ہے۔

بھیک

ہمارے شہر کے جس چوک میں حلوائیوں کی دکانیں ہیں وہاں صبح و شام لسی اور دودھ پینے والوں کا تانتا سا بندھا رہتا ہے۔

گرمیوں کے دنوں میں لسی کی زیادہ کھپت ہوتی ہے۔ سردیوں میں لوگ لسی پیتے ہیں لیکن کم— لسی کے ساتھ دودھ اور چائے کا سلسلہ بھی جاری ہوجاتا ہے۔

ادھر صبح ہوئی حلوائی نے چبوترا دھلوا ڈالا۔ ایک طرف بھٹی پر دودھ کا بڑا کڑھاؤ رکھ دیا جاتا ہے۔ ددکان کے درمیانی حصہ میں خود نانبائی جو ایک بھاری بھرکم شخص ہے۔ ایک بڑی سی چوکی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے سر کے بال مشین سے کٹے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کی سیاہ بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔ رنگ گورا۔ اس قدر موٹاپے کے باوجود وہ اس طرح آلتی پالتی مار کر کیوں کر بیٹھ جاتا ہے یہ ایک راز ہے جو دیکھنے والے کی فہم سے بعید ہے— اس کے ارد گرد اس کے نوکر جو دہی بلونے کا کام انجام دیتے ہیں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے سوتے ہیں۔ یہ لوگ بھی عموماً اپنے لالہ کی طرح موٹے اور بھدے ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا چھوٹے پیمانے پر۔ وہ لالہ کے نزدیکی یا دور کے رشتہ دار بھی نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود وہ موٹاپے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ ان کی ٹھڈیوں کے نیچے کا گوشت قدرے لٹکتا ہوا سا دکھائی دیتا ہے۔ گال بھی پھلاؤ کی طرف

راغب ہوتے ہیں۔ پیٹ بھی اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ غالباً یہ اس لیے ہوتا ہوگا کہ وہ سارا سارا دن لالہ کے قریب بیٹھے رہتے ہیں— اور خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہی ہے۔

بڑا لالہ عموماً یا تو اپنی رانیں سہلایا کرتا ہے یا وہ بیٹھا بیٹھا اپنے ایک پاؤں کو دبایا کرتا ہے اور دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے وقفہ پر زور سے کھانس کر تولہ بھر بلغم اپنے قریب ہی ایک کونے میں دے مارتا ہے۔ وہ اپنی سست آنکھوں سے آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتا ہے بس وہاں گاہکوں کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص بلا پیسے ادا کیے وہاں سے کھسکنا چاہے تو اسے پتہ نہیں چل سکتا۔ در اصل اس کا ایک ہی کام ہے روپیہ بٹورنا۔ لوگ دودھ یا لسی پی کر دام اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں۔ اکنیاں، دوانیاں، چونیاں اور اٹھنیاں وغیرہ وہ اپنے سامنے رکھے ہوئے بڑے سے تھال میں پھینک دیتا اور نوٹ وغیرہ رکھنے کے لیے اس کے پہلو میں لوہے کی ایک صندوقچی پڑی رہتی ہے۔ اس میں چابی لگتی ہے۔ چابی کے ساتھ باریک تاگا بندھا ہوتا ہے جس کے دوسرے سرے پر اس کے کان کریدنے کی چمچی اور دانت کریدنے کی پن سی بندھی ہوتی ہے جس وقت وہ نوکروں کو گالیاں نہیں دے رہا ہوتا یا جب وہ اونگھتا نہیں ہوتا اس وقت وہ یا اپنے کانوں کی میل نکالنے میں مصروف رہتا ہے یا دانت کریدنے لگتا ہے۔

گاہک تو خیر دودھ یا لسی پینے کے لیے جمع ہوتے ہی ہیں ان کے ساتھ بھکاری بھی آن دھمکتے ہیں۔ اِدھر کسی شخص نے منہ سے دودھ کا گلاس لگایا اُدھر اس کے کانوں میں مکھی کی سی بھنک کی طرح ایک آواز متاثر ''بھوکی ہوں بابا...... تمہارا گدی بنی رہے۔ تمہیں پرماتما بہت بہت دے...... میں نے کئی دنوں سے پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا بابا۔''

جب دودھ پینے والا کچھ دم لینے کے لیے گلاس سے منہ ذرا پرے کو ہٹا لیتا ہے تو وہ سوکھی غلیظ بھکارن اس کے قریب چلی آتی ہے۔ اس کے متعفن کپڑوں سے بدبو نکل نکل اس کے نتھنوں میں گھسنے لگتی ہے بھکارن بڑی بھوکی نظروں سے اس کے ہونٹوں کی طرف دیکھنے لگتی جو ابھی دودھ ہی میں تر ہوتے ہیں۔ پھر دفعتاً وہ ہونٹ رومال سے پونچھ ڈالے جاتے ہیں۔

نانبائی کی طرف سے ان باتوں کا کوئی انتظام نہیں ہوتا۔ البتہ دکان کے اندر کرسیاں پڑی ہوتی ہیں اگر گاہک چاہیں تو ان پر بیٹھ کر آرام سے کھا پی سکتے ہیں کیوں کہ وہاں بھکاریوں کے پہنچنے کا احتمال نہیں ہوسکتا لیکن عام طور پر لوگ بہت جلدی میں ہوتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ کھڑے کھڑے چکیں اور پھر فوراً اپنے کام پر بھاگ جائیں۔ ایک سبب اور بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جو لوگ باہر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ بار بار تقاضا کر کے چیز جلد حاصل کر لیتے ہیں اور جو بے چارے اندر کرسیوں پر جا بیٹھتے ہیں وہ بیٹھے کے بیٹھے رہ جاتے ہیں— غرض لالہ نے گاہکوں کے لیے جو کچھ اس کے امکان میں تھا کیا۔ اب گاہکوں کو پوری آزادی حاصل تھی کہ وہ جس طرح چاہیں عمل کریں۔

دوکان پر جانے والے آدمیوں اور بھکاریوں کو یہ کش مکش بھی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ بھکاری نفسیات کے اُستاد ہوتے ہیں۔ فرائڈ، ایڈلر، ینگ وغیرہ نفسیات کی مسائل کو خواہ کہیں سے کہیں پہنچا دیں لیکن انسان عام طور پر انہیں پڑھے بغیر بھی نفسیات کے کار آمد اور عملی پہلوؤں کو وجدانی طور پر سمجھ لیتے ہیں اور ان سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے نانبائی کی دوکان پر جمع ہونے والے بھکاری اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب لوگ کچھ کھا رہے ہوں تو وہ یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی بھوکی نظروں سے ان کی طرف دیکھے۔ اس کی بھی کئی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو اس وقت ایک انسان خود اپنی بھوک یا پیاس مٹانے کے لیے دوکان پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر اسے بھوک یا پیاس کا بہت ہی شدید احساس ہوتا ہے۔ اس وقت اگر کوئی کہے کہ میں بھوکا ہوں تو اُسے اس کا مطلب سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔ اور وہ دوسرے کی بھوک مٹانے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ جب انسان کچھ کھا رہا ہو تو ایسے موقع پر گندی چیز دیکھنے یا سننے کو جی نہیں چاہتا۔ کھاتے پیتے وقت وہ کبھی غلاظت کا نام نہ لے گا۔ نہ اُس کا ذکر سننا پسند کرے گا۔ بلکہ یہاں تک کہ ان کی طبیعت ہر طرح سے مطمئن اور مسرور نہ ہو تو وہ اچھی طرح کھانا کھا

ہی نہیں سکتا۔ اپنی طبیعت کو مسرور رکھنے کے لیے انسان کھانے کی جگہ نہ صرف صاف ستھری رکھتا ہے بلکہ میز پر پھولوں کے گلدستوں کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ اب اگر کچھ کھاتے وقت غلیظ لالچی صورت سامنے آ کھڑی ہو تو انسان کے لیے ایک نوالہ تک نگلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ جب تک گاہک دوکان پر کھڑا دودھ پیتا رہے بھکاری قریب کھڑے منتیں کیے جاتے تھے...... اس کے علاوہ ہندوستانی وہمی بھی ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح نظر لگ جاتی ہے۔ کھایا پیا بجائے ہضم ہو کر جز و بدن بننے کے الٹا نقصان کرتا ہے اس لیے وہ جلد از جلد کچھ دے دلا کر بھکاریوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھکاری ان سب باتوں کو خوب سمجھتے ہیں اور وہ ان کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

موقع و محل کو سمجھنے میں بھکاری انتہائی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انسان کی باقی کمزوریوں سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ انہیں بے شمار دعائیں بھی یاد ہوتی ہیں۔ ان میں بعض بھکاری تو ان دعاؤں کو بڑی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے شکار کو دیکھ لیتے ہیں کہ اسے کس دعا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً عورتوں کو تو بچوں کی دعائیں ضرور ہی دیں گے۔ عورتوں کی یہ رگ بہت کمزور ہوتی ہے جہاں کسی فقیر نے منمنا کر اس کے بچوں کی درازئ حیات کی دعا کی تو وہ فوراً پگھل جاتی ہیں جھٹ گانٹھ سے پیسہ کھول کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہیں۔ بے چاری عورت! عورتوں کے خاوندوں کو دعائیں دینا بھی اسی قدر زود اثر ہے۔" بی تیرا سہاگ بنا رہے۔" اس پر ہندوستانی عورت پھول کر کپا ہو جاتی ہے۔ خاوند خواہ چور، شرابی، رنڈی باز، جو کچھ بھی ہو اس کی سلامتی بہر صورت منظور ہے۔ اس کی سلامتی نہ مانگی جائے تو عورت کی زندگی مصائب میں گرفتار ہو جاتی ہے کہ ساری عمر بے کار گذر جاتی ہے۔ اس لیے عورت کو خاوند کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ خاوند ہو تو بچوں کی بھی کچھ کمی نہیں ہو سکتی۔

عورتیں بھکاریوں کا سب سے آسان شکار ہیں۔ لیکن مردوں کو پھانسنے میں بھی وہ کچھ کم ہوشیار نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر وہ کسی نئے جوڑے کو گھومتے ہوئے دیکھ پائیں تو فوراً قریب پہنچ کر کہہ دیں گے۔ '' تمہاری جوڑی سدا بنی رہے۔''— عموماً مرد کو اپنی نئی دلہن بہت پیاری ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی ان کے حق میں دعائے خیر کر دے تو فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ جھٹ ہاتھ پتلون کی جیب میں جا گھستا ہے۔

پنجاب میں مردوں کو جوانی پر ناز ہوتا ہے کسی کو '' پہلوان'' کہہ کر مخاطب کرنا آدھی جنگ جیت لینے کے برابر ہے۔ اپنی اسی کمزوری کو پنجاب والے خوب سمجھتے ہیں اور وہ اسی حربہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً تانگے والا جا رہا ہو راستے میں خواہ یوں ہی دبلا پتلا آدمی کھڑا ہو اور تانگے والا اسے دھتکارنا بھی چاہتا اور لڑائی مول لینے سے بھی کتراتا ہو تو جھٹ کہہ دے گا '' ابے ہٹ پہلوان! بیچ سڑک کے ایسے کھڑا ہے جیسے اپنے گھر کی سڑک ہو۔''

اگر وہ پہلوان کا لفظ استعمال نہ کرتا تو اسی بات پر تو تو میں میں ہو سکتی تھی۔ لیکن صرف ایک لفظ '' پہلوان'' سے سڑک کے بیچ میں کھڑے ہونے والے کا دل اس قدر مسرور ہو جاتا ہے کہ وہ دو چار گالیاں کھا کر بھی خفا نہیں ہوتا۔ اسی طرح جوان کہلوانا بھی فخر کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی جوانی کی دعا دے دے تو کیا کہنے۔ جوان کچھ نہ کچھ دے ہی بیٹھتا ہے۔ ''تمہاری جوانی صدا بنی رہے۔'' اب سننے والا جوان ہو یا نہ ہو وہ اس بات پر پھولا نہیں سماتا۔ بعض اچھے خاصے ادھیڑ آدمی بھی اس جھانسے میں آجاتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کا آئینہ انہیں بتاتا ہے وہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔ درحقیقت اس کی صورت سے بڑھاپے کے آثار ظاہر نہیں ہوتے ورنہ یہ فقیر مجھے ایسی دعا ہی کیوں دیتا— وہ سیانے فقیر کی ذہانت اور دور اندیشی سے واقف ہی نہیں ہوتا۔

اسی طرح روپئے کا خمار بھی بہت زبردست شے ہے۔ دولت کا ہاتھ آنا اس دنیا میں ہر چیز کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی مدد سے بے نیاز ہو جاتا

ہی نہیں سکتا۔ اپنی طبیعت کو مسرور رکھنے کے لیے انسان کھانے کی جگہ نہ صرف صاف ستھری رکھتا ہے بلکہ میز پر پھولوں کے گلدستوں کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ اب اگر کچھ کھاتے وقت غلیظ لالچی صورت سامنے آ کھڑی ہو تو انسان کے لیے ایک نوالہ تک نگلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں، بلکہ جب تک گاہک دکان پر کھڑا دودھ پیتا رہے بھکاری قریب کھڑے منتیں کیے جاتے تھے...... اس کے علاوہ ہندوستانی وہمی بھی ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح نظر لگ جاتی ہے۔ کھایا پیا بجائے ہضم ہو کر جز و بدن بننے کے الٹا نقصان کرتا ہے اس لیے وہ جلد از جلد کچھ دے دلا کر بھکاریوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بھکاری ان سب باتوں کو خوب سمجھتے ہیں اور وہ ان کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

موقع و محل کو سمجھنے میں بھکاری انتہائی قابلیت کا ثبوت دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ انسان کی باقی کمزوریوں سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ انہیں بے شمار دعائیں بھی یاد ہوتی ہیں۔ ان میں بعض بھکاری تو ان دعاؤں کو بڑی احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے شکار کو دیکھ لیتے ہیں کہ اسے کس دعا کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً عورتوں کو تو بچوں کی دعائیں ضرور ہی دیں گے۔ عورتوں کی یہ رگ بہت کمزور ہوتی ہے جہاں کسی فقیر نے منمنا کر اس کے بچوں کی درازئ حیات کی دعا کی تو وہ فوراً پگھل جاتی ہیں جھٹ گانٹھ سے پیسہ کھول کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہیں۔ بے چاری عورت! عورتوں کے خاوندوں کو دعائیں دینا بھی اسی قدر زود اثر ہے۔ ''بی تیرا سہاگ بنا رہے۔'' اس پر ہندوستانی عورت پھول کر کپا ہو جاتی ہے۔ خاوند خواہ چور، شرابی، رنڈی باز، جو کچھ بھی ہو اس کی سلامتی بہرصورت منظور ہے۔ اس کی سلامتی نہ مانگی جائے تو عورت کی زندگی مصائب میں گرفتار ہو جاتی ہے کہ ساری عمر بے کار گذر جاتی ہے۔ اس لیے عورت کو خاوند کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ خاوند ہو تو بچوں کی بھی کچھ کمی نہیں ہو سکتی۔

عورتیں بھکاریوں کا سب سے آسان شکار ہیں۔ لیکن مردوں کو پھانسنے میں بھی وہ کچھ کم ہوشیار نہیں ہوتے۔ مثلاً اگر وہ کسی نئے جوڑے کو گھومتے ہوئے دیکھ پائیں تو فوراً قریب پہنچ کر کہہ دیں گے۔'' تمہاری جوڑی سدا بنی رہے۔''— عموماً مرد کو اپنی نئی دلہن بہت پیاری ہوتی ہے۔ اگر کوئی ایک مرتبہ بھی ان کے حق میں دعائے خیر کر دے تو فوراً ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ جھٹ ہاتھ پتلون کی جیب میں جا گھستا ہے۔

پنجاب میں مردوں کو جوانی پر ناز ہوتا ہے کسی کو'' پہلوان'' کہہ کر مخاطب کرنا آدھی جنگ جیت لینے کے برابر ہے۔ اپنی اسی کمزوری کو پنجاب والے خوب سمجھتے ہیں اور وہ اسی حربہ کو بڑی کامیابی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً تانگے والا جا رہا ہو راستے میں خواہ یوں ہی دبلا پتلا آدمی کھڑا ہو اور تانگے والا اسے دھتکارنا بھی چاہتا اور لڑائی مول لینے سے بھی کتراتا ہو تو جھٹ کہہ دے گا '' ابے ہٹ پہلوان! بیچ سڑک کے ایسے کھڑا ہے جیسے اپنے گھر کی سڑک ہو۔''

اگر وہ پہلوان کا لفظ استعمال نہ کرتا تو اسی بات پر تو تو میں میں ہوسکتی تھی۔ لیکن صرف ایک لفظ'' پہلوان'' سے سڑک کے بیچ میں کھڑے ہونے والے کا دل اس قدر مسرور ہو جاتا ہے کہ وہ دو چار گالیاں کھا کر بھی خفا نہیں ہوتا۔ اسی طرح جوان کہلوانا بھی فخر کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ اگر کوئی جوانی کی دعا دے دے تو کیا کہنے۔ جوان کچھ نہ کچھ دے ہی بیٹھتا ہے۔'' تمہاری جوانی صدا بنی رہے۔'' اب سننے والا جوان ہو یا نہ ہو وہ اس بات پر پھولا نہیں سماتا۔ بعض اچھے خاصے ادھیڑ آدمی بھی اس جھانسے میں آجاتے ہیں۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کا آئینہ انہیں بتاتا ہے وہ سب جھوٹ ہوتا ہے۔ درحقیقت اس کی صورت سے بڑھاپے کے آثار ظاہر نہیں ہوتے ورنہ یہ فقیر مجھے ایسی دعا ہی کیوں دیتا— وہ سیانے فقیر کی ذہانت اور دور اندیشی سے واقف ہی نہیں ہوتا۔

اسی طرح روپے کا خمار بھی بہت زبردست شے ہے۔ دولت کا ہاتھ آنا اس دنیا میں ہر چیز کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ یہاں تک کہ خدا کی مدد سے بے نیاز ہو جاتا

ہے۔ جب دولت مند شخص خوب اینٹھتا ہوا بازار میں سے چلا جارہا ہو۔ تو اسے کوئی فقیر آگے بڑھ کر کہہ دیتا ہے ''تیری گدی بنی رہے۔'' تو اس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی گو وہ ان باتوں کو چہرے سے ظاہر بھی نہیں ہونے دیتا شاید پہلی مرتبہ کی دعا کے فوراً بعد وہ پیسہ نکال کر بھی نہیں دیتا۔ لیکن فقیروں کے پلّے سے کچھ نہیں جاتا وہ زبان ہلا دیتے ہیں۔ اور سننے والے سمجھتے ہیں کہ اِدھر فقیر نے کچھ کہا اور اُدھر اس کی صدا عرش پر جا پہنچی آخر وہ سیٹھ صاحب کچھ نہ کچھ دے بیٹھتے ہیں۔ ایک دو پیسوں میں ایسی شان دار دعائیں لوٹ نہیں تو پھر کیا ہے۔

اب تک تو ان بھکاریوں کا ذکر تھا جو واقعی عقل مند ہیں اور موقع محل نیز دعاؤں کے مناسب استعمال سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں ان گھڑرریوں کی بھی کچھ کمی نہیں جو دعاؤں کا بہت بے تکا استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے دعاؤں کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ یوں ہی سنی سنائی دعائیں یاد کر لیتے ہیں۔ اور پھر جب کسی شخص کو دیکھ پاتے ہیں تو دھڑ دھڑ دعائیں دینے لگتے ہیں۔ بچوں کے جیتے رہنے سے لے کر گدی بنی رہنے تک سب دعائیں یکے بعد دیگرے دے ڈالتے ہیں اگر کوئی نشانے پر بیٹھ جائے تو بہتر ورنہ منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔

بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جنہیں بچوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ابھی تک وہ اس جذبہ سے خالی ہوتے ہیں۔ نہ ان کے پاس بچے پیدا کرنے کی مشین ہوتی ہے یعنی بیوی اور نہ اتنی توفیق ہی ہوتی ہے کہ شادی کر لیں۔ ان لوگوں کو بچوں کی دعائیں دینا وقت ضایع کرنا ہے۔ اور بعض تو اس قسم کی باتوں سے جھلا جاتے ہیں کہ بھکاری کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ تو خود ہی ابھی بچے ہیں۔ ان کے بچوں کا تو خیر سوال ہی کیا ہے۔ بعض کو بہت تاؤ آتا ہے تو کہہ دیتے ''ہٹ مائی! کوئی نہیں بچہ وچہ......''

تب مائی کو پتہ چلتا ہے کہ اس سے اصل غلطی کیا ہوئی۔ اور وہ بے چاری حیران رہ جاتی ہے کہ اسے کون سی دعا دوں۔ در اصل لوگوں کو اس بات پر طیش نہیں آتا

چاہئے۔

بچّے کے علاوہ بعض کلرکوں یا اسی قسم کے بابوؤں کو بھی بھکاری غلط دعائیں دے ڈالتے ہیں۔ مثلاً ''تیری گدی بنی رہے۔'' سننے والا بے چارا حیران ہوتا ہے کہ گدی کیسی۔ وہ سارا سارا دن دفتر میں قلم گھسنے اور افسروں کی گھڑکیاں اور دھمکیاں سہنے کے بعد کہیں دال روٹی کھا پاتا ہے اور یہ بڑھیا کہتی ہے تیری گدی بنی رہے۔ وہ بے چارا پہلے ہی پریشان ہوتا ہے اسی قسم کی دعائیں ایسی محسوس ہوتی ہیں جیسے وہ بڑھیا اس کا منہ چڑھا رہی ہو ایسے بھکاریوں کو عام طور پر گالی سنی پڑتی ہے۔

ہمارے نانبائی کی دوکان محض دودھ لسی کی دوکان نہیں بلکہ یہاں پر ہندوستان بھر کے قسم قسم کے بھکاری بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ہتھکنڈے واقعی بہت موثر ہیں لیکن ان بھکاریوں کے لیے جو محض دعاؤں پر انحصار رکھتے ہیں باقاعدہ تعلیم و تربیت کا انتظام ہونا چاہئے۔ عقل و ذہانت کی تو ان میں کوئی کمی نہیں ہوتی صرف تنظیم اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کو موقع و محل کے مطابق دعائیں دینے کا سلیقہ سکھایا جانا چاہئے مثلاً کوئی لڑکا امتحان دے کر آیا ہو تو ظاہر ہے اسے زیادہ تر اسی بات کی تشویش ہوگی اگر اس وقت کوئی چرب زبان فقیر یہ دعا دے ''اللہ تعالٰی تجھے امتحان میں پاس کردے۔'' تو یہ لازمی بات ہے طالب علم ضرور اسے کچھ نہ کچھ دے ڈالے گا۔ اس کو اور زیادہ تفصیل کے ساتھ سیکھا جاسکتا ہے۔ بھکاریوں کی تنظیم کر کے اس قسم کے شکار تاڑ لیے جائیں۔ اگر کوئی شخص کسی نوکری کے سلسلے میں انٹرویو کر کے آیا ہو تو اسے دعا دی جائے کہ اللہ تجھے انٹرویو میں کامیاب کرے۔ اگر کوئی شخص کسی جگہ کو جارہا ہو اور گاڑی چھوٹنے والی ہو تو اس کے لیے دعا کی جائے خدا کرے تیری گاڑی تجھے مل جائے۔ اگر کوئی شخص گھر کی طرف لپکا جارہا ہو بادل گھر آئے ہوں بارش کا خطرہ ہو تو اسے دعا دی جائے کہ پرمیشور کرے تو بارش ہونے سے پہلے گھر پہنچ جائے۔ یا گھر پہنچنے سے پہلے پہلے بارش نہ ہو۔ اس قسم کی ہزاروں باتیں ہوسکتی ہیں جن میں دعاؤں

سے کام لے کر فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

یہ تو عام قسم کے بھکاری ہیں جو ہماری نانبائی کی دوکان پر کھڑے رہتے ہیں اور عام طور پر نظر آ جاتے ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ خاص قسم کے بھکاری بھی ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً ایک نہایت مکروہ صورت بھکاری کے بھیک مانگنے کا طریقہ سب سے نرالا ہے۔ اس کا رنگ گلے سڑے چمڑے کی مانند بھدا ہے۔ اس کی ناک بیٹھی ہوئی ہے۔ دانت آگے کو نکلے ہوئے اور بہت زیادہ غلیظ۔ وہ چھتھڑے لٹکائے رہتا ہے جن میں سے بہت سخت بو ہر طرف پھیلتی رہتی ہے۔ اس کے چہرے پر پسینہ کی بوندیں جھلکتی رہتی ہیں۔ پسینہ کے ساتھ اس کے چہرے پر خاص قسم کی چکنائی بھی ملی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس قدر گھناؤنا شخص ہے کہ انسان کا اس کی طرف دیکھنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ اس کا خیرات مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ بغیر منہ سے آواز نکالے چپ چاپ کسی شخص کے سامنے دفعتاً ہی جا کھڑا ہوتا ہے اور پھر بڑھ کر بہت قریب چلا جاتا ہے اس کا منہ بھی انسان کے منہ کے بالکل قریب پہنچ جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اس کے دبے ہوئے نتھنوں میں سے نکلتی ہوئی ہوا ان کے چہرے کو چھوتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے وہ منہ سے کچھ نہیں کہتا بلکہ بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہاتھ آگے بڑھا دیتا ہے۔ ایسے موقع پر اس کے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رکھے بغیر جان نہیں چھوٹتی۔ بلکہ اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ اس سے اس قدر زیادہ گھن آتی ہے کہ انسان اسے دھکا دے کر پرے بھی نہیں ہٹا سکتا۔ یہ آنکھوں دیکھی بات ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی شخص کے سامنے حسب عادت دفعتاً ہی جا کھڑا ہوا۔ اس آدمی کو اس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔ اس نے بڑی نفرت سے اسے پرے ہٹ جانے کے لیے کہا اور ساتھ ہی دو چار گالیاں بھی سنائیں۔ اس پر فقیر نے فی الفور اس کے منہ پر تھوک دیا...... اور پھر چشم زدن میں بھاگ کر گلی میں غائب ہوگیا۔

وہاں اس قسم کے بھکاری بھی آتے ہیں جو ایک طرف چپ چاپ کھڑے

ہوجاتے ہیں۔ وہ کسی قسم کی بے چینی کا اظہار نہیں کرتے کسی کو کسی طریقہ سے بھی دق کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ نہ للچائی ہوئی نظروں سے کسی کے منہ کی طرف تکتے ہیں۔ نہ دعائیں دیتے ہیں وہ مزے سے سائے میں کھڑے رہتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پنکھا ہوتا ہے۔ وہ جانے والے کو پنکھا جھلتے رہتے ہیں اس کی فلاسفی خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ حربہ بھی بہت پر اثر ہے۔ اگرچہ ان کی آمدنی ادھر اُدھر مارے مارے پھرنے والے بھکاریوں سے کچھ کم ہی ہوتی ہے لیکن وہ کم از کم ایک مقام پر آرام سے کھڑے تو رہتے ہیں۔ اور نہ انہیں کڑوی کسیلی باتیں ہی سننی پڑتی ہے۔ ان کی موجودگی کا علم اسی وقت ہوتا ہے جب انسان کو شدید گرمی کے موسم میں سرد ہوا کا احساس ہوتا ہے۔

ان فقیروں نے اپنی قابلیت کے اچھے اچھے ثبوت پیش کیے ہیں۔ اور وہ کسی نہ کسی ڈھنگ سے کچھ لے ہی مرتے ہیں۔ مثلاً ایک اندھا بھکاری آیا کرتا ہے۔ اور نانبائی کی دوکان کے قریب بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بھی کسی خاص شخص کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اس کا روئے سخن سبھی کی طرف ہوتا ہے۔ اس کی آواز خوب بلند اور بھرپور ہے۔ وہ بیٹھا پاٹ دار آواز میں ایک ہی فقرہ دہرایا کرتا ہے۔'' ارے بابا پیاسا ہوں مجھے بھی لسی پلا دو۔ ارے بابا! پیاسا ہوں مجھے بھی لسی پلا دو۔'' وہ بلند آواز میں چلائے جاتا ہے۔ اس کی آواز اِدھر اُدھر سب دوکانوں تک گونج کر پہنچ جاتی ہے اسے بعض اوقات ایک یا ڈیڑھ گھنٹے تک اسی طرح بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ دھوپ کی گرمی میں اس کے سر اور گردن سے پسینہ چھوٹنے لگتا ہے لیکن وہ ایک ضدی بچے کی طرح چلاّئے جاتا ہے۔ یہاں تک کسی شخص کو رحم آجاتا ہے وہ اسے ایک گلاس لسی پلا دیتا ہے۔ اگر اس سے کوئی پھر بھی کہے کہ بابا اور لسی پیو گے۔ تو وہ بلا کسی جھجک کے کہہ دے گا۔ ''بھگت! تمہاری ایسی شردھا تو سو بھی پی لیتے ہیں۔'' اس طرح وہ بھگت کی کامنا پوری کرنے کے لیے ایک گلاس اور چڑھا جاتا ہے۔

جو لوگ وہاں آتے ہیں وہ ان فقیروں کے ہاتھوں بہت تنگ آتے ہیں۔ ادھر وہ

ان فقیروں سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہ گڑ کی مکھی کی طرح ان کے قریب بھنکتے رہتے ہیں۔ اور کئی طرح کی باتیں کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔

''بابا معاف کرو، مائی معاف کرو۔'' یہ تو عام جوابات ہیں جو انہیں دیئے جاتے ہیں۔ لیکن ان اختلافات کے باوجود ان کی آپس میں کچھ یگانگی بھی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک مائی کو کہا گیا کہ مائی معاف کرو تو وہ ناک چڑھا کر اور ہاتھ جھٹک کر کہتی ہے۔ ''معاف کرو۔'' معاف کرو۔ اگر ہم سب کو معاف کر دیا کریں تو پھر کھائیں کہاں سے؟''

پھر وہ آدمی کہتا ہے ''اری بڑھیا ساری عمر کھاتی رہی ہو اب نہ کھاؤ گی تو کیا ہو جائے گا؟ اب دھرتی کا بوجھ کم کرو نا!''

اس پر واقعی بڑھیا کو غصہ آ جاتا ہے اور اگر اسی وقت اس کے ہاتھ پر ایک پیسہ نہ رکھ دیا جائے تو نہ جانے کیا سے کیا بک دے''

کوئی بھکارن بغل میں ایک بچہ لیے آئے گی۔ ''بابو! گدی بنی رہے۔ بچہ بھوکا ہے۔ کچھ کھایا نہیں کل سے۔''

اب وہ آدمی گھوم کر اس کی طرف بڑے غور سے دیکھے گا۔ '' ہوں اچھا تو کس کا بچہ ہے یہ......؟؟

''میرا ہی ہے۔''

''تیرا ہے؟— ایں؟— تجھے بچے دینے کے لیے کس نے کہا تھا۔''

بھکارن چپ رہتی ہے۔

''بتاؤ کس نے کہا تھا بچے دینے کو؟ ایں؟'' وہ کچھ جھینپ جاتی ہے۔ ''بابو جی کسی کے کہنے سے تو بچے پیدا نہیں ہوتے نا؟''

''جی! اچھا تو صاحب پھر کیسے ہو جاتے ہیں یہ بچے ذرا ہم بھی تو جانیں۔''

بھکارن چپ۔

''میں نے کہا بچے پیدا کرنے سے پہلے ذرا ہم سے بھی تو آنکھ ملا لیا کرو۔ پھر دیکھو ہم کیا کیا مال کھلاتے ہیں تجھے اور تیرے بچے کو......''

بھکارن ان باتوں کی تو عادی ہوتی ہیں۔'' ہٹو بابو جی! آپ تو مزاخ کرتے ہیں اتنے بڑے آدمی ہو کر......''

''اجی 'مجاخ'، نہیں کرتا میں— میں تو سولہ آنے بات کہتا ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ بچے پیدا کریں دوسرے اور انہیں کھلائیں ہم۔ ان کے پاس جاؤ نا اور ان سے کہو کہ اب وہ تمہارے بچوں کو بھی کھلائیں۔''

بعض کمسن لڑکیاں، جن کے خد و خال کچھ تیکھے ہوتے ہیں اور جن کی جوانی بالکل ہی ابتدائی منزلوں میں ہوتی ہے اور جنہیں بازار کے پنواڑیوں اور چھابڑی والوں نے عجیب عجیب نظروں سے دیکھ کر بگاڑ دیا ہوتا ہے کسی شخص کے قریب پہنچتی ہیں اور ہاتھ پھیلا کر کہتی ہے۔'' ہے بابو گدی ہے رہے۔ کل سے بھوکی ہوں۔''

وہ آدمی اپنے دوست کو کہنی مار کر کہتا ہے۔ دیکھا استاد! شگوفہ ہے شگوفہ...... کیوں ری کیا نام ہے تیرا؟''

پھر وہ لوگ للچائی ہوئی نظروں سے اس کی پھوٹتی جوانی کے چھوٹے ابھاروں پر نظر گاڑ دیتے ہیں۔ ''کیوں ری کوئی لڑکا لڑکی نہیں جنا تو نے۔ کیوں شرماتی ہے۔ تو تو ڈھیر کے ڈھیر بچے دے گی۔'' لڑکی شرما کر ناز و ادا دکھاتی ہوئی کھڑی رہتی ہے۔'' بابو جوانی بنی رہے......''

اس پر بابو صاحب خوب اینڈ کر لوفروں کے لہجے میں کہتے ہیں ۔''اری! میری جوانی بنی رہنے سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

پھر وہ پیسہ دیتے وقت لڑکی کے ہاتھ کو چھو لیتا۔'' ادھر آیا کرو نا ہماری دوکان کے پچھواڑے...... ہماری بات سن کے کہ جوئی مل گیا اُستاد ہم سا، تو یاد رکھیو پھر بڑے بڑے سیٹھ روپیوں کی تھیلیاں لیے پھر تیرے پاس آیا کریں گے۔''

ادھر اُدھر کے کچھ لوگ یہ باتیں سن کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ وہ خوب دانت نکال نکال کر خوب ہنستے ہیں اور بعض منہ بنا کر رخ پھیر لیتے ہیں۔

ان میں کوئی جنٹل مین پتلون کی کریز درست کرتے ہوئے کہتے ہیں۔'' ارے صاحب! یہ بھکاری بھی عجب لعنت ہیں۔ جہاں دیکھو پلیگ کے چوہوں کی طرح انسان کا پیچھا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں ذرا شرم نہیں آتی۔ اجی قصور سماج کا ہے جو انہیں درست کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتا۔ کسی غیر ملک میں کوئی شخص آپ کو بھیک مانگتا ہوا نہیں دکھائی دے گا وہاں یہ باتیں سرکاری طور پر منع ہیں اگر کوئی اس طرح کرے بھی تو اسے جیل میں ڈال دیا جاتا ہے قانون سخت سے سخت سزا دیتا ہے۔ یہ لوگ انسانیت کے نام پر دھبہ ہیں۔ نہ معلوم چیونٹیوں کی طرح کہاں سے نکل آتے ہیں۔ اگر آپ ابھی یہاں کھانا تقسیم کیجئے تو ہزاروں بھکاری اکٹھا ہو جائیں گے۔ روٹی کی تو انہیں بیس بیس میل سے بو آجاتی ہے......''

کوئی اور صاحب کہتے ہیں''اجی آپ کو معلوم نہیں کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے۔''

سب یہ جاننے کے لیے کہ دہلی میں کیا ہو رہا ہے ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

'' جی وہاں سب بھکاریوں کو جمع کر کے ایک خاص جگہ رکھا جاتا ہے ان سے ہر قسم کا کام لیا جاتا ہے۔ چھوٹی موٹی چیزیں بنوائی جاتی ہیں اور پھر اُنہیں بیچ دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ خود اپنی کمائی سے روٹی کھاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی بازار میں بھیک مانگتا ہوا دکھائی دے تو اُسے بڑی سخت سزا دی جاتی ہے اور اگر وہ شخص اس سزا کے باوجود بھی بھیک مانگنے سے باز نہ آئے تو پھر اُسے گولی سے اڑا دیا جاتا ہے۔ یہ کہہ کہ وہ چاروں طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے ہیں......

اتنے میں ایک اور سادھو وہاں آنکلتا ہے۔ اس سادھو کو آج تک بھیک مانگتے کسی نے نہیں دیکھا۔ نہ معلوم وہ کہاں سے کھاتا کیسے گزارا کرتا ہے بس جب دیکھو ہنستا رہتا

ہے۔ اس کے سر پر لمبی لمبی جٹائیں ہیں جو پیٹھ پر لٹکتی رہتی ہیں۔ اُس نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے۔ داڑھی بہت بڑی نہیں۔ اس کا چہرہ اور داڑھی گرد میں اٹے رہتے ہیں اس کے جسم پر صرف کمر سے ایک کپڑا لپٹا ہوا ہوتا ہے۔ پاؤں میں گھنگھرو بندھے ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں لوہے کی ایک لمبی سلاخ ہوتی ہے جو ایک سرے پر خوب تیز ہوتی ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں آٹھ دس انگل لمبی ایک بنسری۔ وہ اسی بنسری سے صرف ایک ہی سر نکالتا ہے۔ جب دیکھو وہی ایک دھن بجائی جارہی ہے۔ وہ چوک میں پہنچتا ہے تو بنسری منہ سے لگا کر ناچنے لگتا ہے۔ بنسری کی دھن بھی بڑی دل کش ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ اُس کا سیدھا سادا رقص بھی خوب مزا دے جاتا ہے۔ لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے اس کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں۔ وہ دیر تک رقص کرتا رہتا ہے۔ آخر کار جب وہ تھک جاتا ہے تو ناچ ختم کر دیتا ہے اور جھک جھک کر سب کو آداب عرض کرتا ہے۔ اگر کوئی اُسے پیسہ دینا چاہے تو انکار کر دیتا ہے اور ہنس کر کہتا ہے ''نا بابا! ہم بھکیروں کو مایا جال میں مت پھنساؤ۔''

اس کی یہ بے نیازی دیکھ کر کئی لوگوں کے شردھا کے مارے سر جھک جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اُس گھور کلجگ میں بھی ایشور کے اصلی بھگتوں کی کچھ کمی نہیں لیکن کوئی مادہ پرست سوچنے لگتا ہے کہ آخر یہ کھاتا کہاں سے ہے۔ کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ لیکن بہتوں کا خیال یہ ہے کہ وہ سرکاری جاسوس ہے۔

میں تو ان بھکاریوں کی لیاقت کا قائل ہو چکا ہوں۔ ان میں بعض بڑے بڑے فلاسفر بھی ہوتے ہیں۔ ایسی دل لگتی کہتے ہیں کہ انسان سن کر دنگ رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک دن علی الصبح لسی پینے کے لیے دکان پر گیا اور لوگ بھی کھڑے تھے اتنے میں ایک بھکاری نے کاسہ گدائی آگے بڑھا دیا۔

ایک صاحب نے چلا کر کہا '' ابے تم کبھی جان بھی چھوڑو گے۔ اِدھر سورج نکلا اور اِدھر یہ پیالہ لے کر مانگنے چل کھڑے ہوئے۔ آسان کام ہے نا۔ کیوں بے شرم نہیں

آتی...... مانگنا بھی کوئی کام ہے ۔ ایں؟''

سب لوگ بھکاری کی طرف دیکھنے لگے جس کی آنکھوں میں ایک گہری اُداسی جھلک رہی تھی۔ اُس نے کاسہ آگے بڑھا کر بڑی سنجیدہ اور پر اثر آواز میں جواب دیا '' بابا! اگر یہ کام اتنا ہی آسان ہے تو لو یہ پیالہ ایک دن بھیک مانگ کر دکھاؤ۔''

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'ہندوستان ہمارا' میں شامل ہے۔

مُنّی کی موت

میرے دوست گوکل داس ودھوا کی بچی مرگئی۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ دوپہر کا وقت۔ صبح سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ دن بھر گھومنے کے بعد تھکا ماندہ میں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ ان دنوں میں کنوارا تھا، آوارہ تھا، بے کار اور بے گھر تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں گزارا کرتا تھا۔ آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ رضائی اوڑھی اور پنگوئین میریز کی ایک کتابHow the japanese fights کھول کر لیٹے لیٹے پڑھنے لگا۔

کتاب دلچسپ تھی۔ جب میں لفٹ کرنل ہیرلڈ داؤد کے بیان کے اس حصہ پر پہنچا کہ...... ''ہم نے صبح پانچ بجے مارچ شروع کیا اور اگلے روز کے دس بجے تک مسلسل چلتے رہے۔ اس عرصے میں ہم نے چھپن میل کا فاصلہ طے کیا...... تو کسی نے دروازے پر دستک دی...... کرنل صاحب جاپانی فوج میں اپنے تجربات بیان کر رہے تھے مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ جاپانی اس قدر سخت جان ہوتے ہیں...... اور پھر میرا ذہن فلسفیانہ قلابازیاں لگانے ہی کو تھا...... ایسے موقعہ پر دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز سن کر دل آزردہ سا ہوگیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا۔ دراڑ میں سے میرے چچیرے بھائی منجیت کا گول مول چہرہ دکھائی دیا۔ وہ مقامی اسکول میں پڑھتا تھا۔ چھٹی کے بعد انگریزی پڑھنے کے لیے

میرے پاس چلا آتا تھا۔

دروازہ کھولا۔

منجیت کے ساتھ ایک اور چھوکرا کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''بابو گوکل داس کی منی مر گئی۔'' وہ ان کے مکان تلے آلو گوبھی کے پکوڑے بیچا کرتا تھا۔

یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا بلکہ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ کیوں کہ اسی روز میں بابو گوکل داس کو دو مرتبہ مل چکا تھا۔ مجھ سے تو انہوں نے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا تھا...... کم از کم وہ یہ تو کہتے کہ بچی بیمار ہے۔ '' مرگئی؟...... کون سی ، منّی ؟''

یہ میری بہت ہی بری عادت ہے کہ میں اپنے دوستوں کے بھائیوں، بہنوں اور بچوں کی تعداد سے ہمیشہ لاعلم ہی رہتا ہوں۔ کئی ایسے ملنے والے بھی ہیں۔ جو مجھے اپنا اچھا خاصہ دوست سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان کے نام تک سے واقف نہیں میرے دوست بابو گوکل داس کے کئی بچے تھے۔ لیکن میں ان کی تعداد سے واقف نہیں تھا۔ میں عموماً ان کے گھر جاتا رہتا تھا۔ کبھی کسی تاریک گوشے میں سے الجھے ہوئے بالوں والی کوئی چھوٹی سی بچی شرماتی ہوئی نکل آتی۔ میں پوچھتا۔ '' بابو گوکل داس! یہ بچی کون ہے؟ ''

'' آپ نہیں جانتے؟ ...... یہ ہے میری لڑکی سرلا......''

مجھے شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ واقعی کس قدر بری بات تھی۔ لیکن مجھے ہمیشہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر تیسرے روز ایک نئی صورت دکھائی دیتی ہے۔ جسے گوکل داس اپنی بچی بتاتے ہیں۔

پکوڑے بیچنے والے لڑکے نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ '' جی ان کی سب سے چھوٹی منی...... گود والی منّی۔''

یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ ان دنوں گوکل داس ہی میرے سب سے عزیز اور ہمدرد دوست تھے۔ وہ دنیا کے کئی اور جھنجھٹوں میں پھنسے ہوئے تھے...... ایسے موقعہ پر منی کی وفات کس قدر دکھ کی بات تھی۔ میں حیران بھی تھا کہ ہمارا رات دن کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور انہوں نے بچی کی علالت کا ذکر تک نہ کیا۔ اس خبر سے ایک ہی گھنٹہ پہلے جب میں بازار سے آرہا تھا تو چوک میں ان کے چھوٹے بھائی نے دکان سے اُتر کر کہا کہ اگر

آپ گھر جا رہے ہوں تو بھائی صاحب کو دکان پر بھیج دیں۔ چناں چہ میں نے یہ پیغام بابو گوکل داس تک پہنچا دیا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے بچی کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ میں نے لڑکے سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔'' وہ بیمار تھی جی۔''

تعجب۔

اچھا جی نمستے ۔ میں جاتا ہوں بابو جی نے کہا تھا کہ میں آپ کو اس بات کی خبر کردوں۔ وہ چلا گیا۔

کھڑکی میں سے ابر آلود آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ نیچے بازار میں سے خوانچے والوں کی صدائیں آ رہی تھیں۔

ہم دونوں چپ تھے۔

پھر میں کپڑے پہننے لگا۔ جب پہن چکا تو میں نے من جیت سے کہا۔تم بیٹھو میں ابھی آیا۔''

سیڑھیاں اترنے کے بعد میں بارش سے بچتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پچھواڑے کی گلی میں پہنچا۔

بابو گوکل داس کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا مکان دراصل ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں ان کا سامان رکھا تھا۔ چھوٹی کوٹھڑی میں تو خیر سارا دن تاریکی چھائی رہتی تھی۔ البتہ بڑے کمرے میں اگرچہ دھوپ کا گزر نہیں تھا۔ لیکن روشنی داخل ہوسکتی تھی۔ بڑے کمرے کے دروازے کے قریب چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔

اس وقت باورچی خانے کے اندر بہت سی عورتیں بیٹھی تھیں۔ باہر جوتے بکھرے ہوئے تھے۔ جب میں بڑے کمرے میں داخل ہوا تو اور بھی چند لوگ جمع تھے۔فرش پر

دری بچھی تھی۔ سامنے بابو گوکل داس نواڑی پلنگ سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ان کی بیوی پیٹھ موڑے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھیں۔ بیوی کے نزدیک ان کی اماں بازوؤں میں منہ چھپائے بیٹھی تھیں۔ ادھر اُدھر ان کے چند رشتہ دار اور دوست دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے بیٹھتے ہی پوچھا۔'' آخر یہ واقعہ کیوں کر پیش آیا۔ مجھے تو بچی کی بیماری تک کی خبر نہیں ملی۔''

انہوں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا۔''منی ہفتہ بھر سے کچھ بیمار تھی۔ بچے بیمار ہو ہی جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے ذکر نہیں کیا اور کوئی خاص بیماری بھی نہیں تھی۔ اس کا منہ پھول گیا تھا۔ میں اسے پرسوں ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ دوا دارو کر ہی رہے تھے بلکہ آج صبح ہم اسے ہارلکس پلاتے رہے...... ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب آپ مجھے بلانے کے لیے آئے تھے۔ اس وقت وہ آرام سے سو رہی تھی۔ آپ کا پیغام سن کر میں دکان تک گیا واپس لوٹا تو رستے میں چھوکرا ملا، کہنے لگا کہ منی بولتی نہیں...... نہ سانس لیتی ہے یہ سن کر میں بھاگا بھاگا گھر آیا۔ دیکھا تو......''

انہوں نے یہ باتیں رقت انگیز لہجہ میں رک رک کر بیان کیں۔

جوں ہی محلے والوں کو اس موت کی خبر ملی۔ وہ اوپر تلے آنے شروع ہو گئے۔

ہر نو وارد بچی کی غیر متوقع موت پر اظہار تعجب کرتا۔ اور جواب میں بابو گوکل داس کو وہی بات دہرانی پڑتی۔'' جی منی ہفتہ بھر سے بیمار تھی۔ اور کوئی خاص بیماری بھی نہ تھی......''

موت کے بعد عموماً مرحوم کے خصائل وغیرہ کا ذکر چھیڑ کر افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لیکن منی بہت ہی چھوٹی عمر میں دنیا سے رخصت ہوگئی تھی۔ بہت کم لوگوں نے اس کی صورت دیکھی تھی۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا۔ خود مجھے ننھی کی صورت یاد نہیں تھی۔ اس لیے اس موقع پر سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ سب لوگ خاموش رہ کر سوگ

منائیں۔ لیکن اتنے انسانوں کی مکمل خاموشی غیر شعوری طور پر ہر ایک کے لیے پریشان کن تھی۔

کچھ دیر بعد حکم چند آ گئے۔ یہ بھی بابو گوکل داس کے خاص دوستوں میں سے تھے حکم چند دنیا کا سرد و گرم دیکھے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے کے گہرے خطوط اور مجموعی تاثر سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا تھا.....وہ سر پر کلاہ والی طرہ دار پگڑی باندھتے تھے۔ ان کی مونچھیں ایسی تھیں جیسے دانت صاف کرنے کا برش۔ مضبوط جبڑا منہ کے دہانے کی بناوٹ سے ان کی قوتِ ارادی کا پتہ چلتا تھا۔ چناں چہ جب وہ آئے تو باوجودیکہ ان کا چہرہ دوسروں کی بہ نسبت کم افسردہ نہ تھا۔ انہوں نے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد فوراً عملی پہلو کی طرف دھیان دیا...... طے پایا کہ تانگوں کا انتظام کیا جائے اور بچی کو لے جا کر دریا برد کر دیا جائے۔

بابو صاحب کے بڑے بھائی صاحب بھی وہاں بیٹھے تھے۔ انہوں نے دکان کے ملازم نتھو رام کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ قصابوں کے محلے کی نکڑ سے ایک مٹکا خرید کر دریا پر پہنچ جائے۔

نتھو رام کچھ ایسا ذہین بھی نہیں تھا۔ اس لیے یہ بات سمجھنے میں اسے اچھی خاصی دقت پیش آئی۔ کئی ایک سوالات کر ڈالے۔ بالآخر جب بات سمجھ میں آ گئی تو پیسے لے کر رخصت ہوا۔

اب لوگ اُٹھنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ بابو گوکل داس کسی کام سے نیچے چلے گئے تھے۔ گلی میں کسی شخص کے سوال کے جواب میں کہہ رہے تھے۔ ''جی منّی ہفتہ بھر سے بیمار تھی۔ اور کوئی خاص بیماری بھی نہیں تھی۔ اس کا منہ بہت زیادہ پھول گیا تھا......'' ان کے لہجے میں تاثر کی وہ شدت نہ رہی تھی...... شاید بار بار وہی بات دہرا کر آخر میں ان الفاظ کے درد اور کسک میں کمی پیدا ہو گئی تھی۔

جب لوگ اٹھنے لگے تو میں لپک کر پہلے ہی چلا آیا تا کہ منجیت کو رخصت کر کے

اپنا کمرا مقفل کردوں۔

جب تالہ لگانے لگا تو منجیت نے اداس نظروں سے میری طرف دیکھا...... ''آج ہم لوگ سنیما دیکھنے کے لیے جانے والے تھے......کل آپ نے کہا تھا......''

اس کے خشک ہونٹوں میں سے اس کے سپید سپید دانت دکھائی دیئے۔ اس نے جھجکتے ہوئے یہ الفاظ کہے جیسے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ اس بے محل گفتگو کی در اصل کوئی ضرورت نہ تھی۔

جب میں نیچے آیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ پکوڑے بیچنے والے چھوکرے نے کہا کہ وہ چوک سے آگے نہ گئے ہوں گے۔ میں بھاگم بھاگ چوک میں پہنچا۔ لیکن وہاں ان میں سے کوئی بھی نہ دکھائی دیا۔ میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔

پچھلے برس بابو گوکل داس کے بچے کے مونڈن پر بھی میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس بات کی انہوں نے بہت سخت شکایت کی تھی۔ لیکن خیر وہ خوشی کا موقعہ تھا۔ اس مرتبہ میرا وہاں پہنچنا بہت لازمی تھا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں سائیکل پر بھی جاسکتا ہوں۔ حالانکہ میری سائیکل بھی بہت بری حالت میں تھی۔ میل بھر جانے میں دو تین مرتبہ تو اس کی چین ہی اتر جاتی تھی۔ اب اس کے سوائے چارہ بھی کیا تھا۔ چناں چہ سائیکل اٹھائی اور چل دیا۔

بارش بند ہوچکی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سائیکل کی چین حسب توقع تین چار مرتبہ اتری میرے دل میں ایک ہی لگن تھی کہ کسی نہ کسی طرح وقت پر پہنچ جاؤں، اگر کہیں دیر ہوگئی تو مفت میں ان سے شرمسار ہونا پڑے گا—— میرے ذہن میں اس قسم کے خیالات کا ہجوم تھا کہ سامنے تانگے میں بابو حکم چند کی پگڑی کا لہراتا ہوا شملہ دکھائی دیا۔ میری جان میں جان آئی۔ ان کے ساتھ ایک اور بابو صاحب بھی بیٹھے تھے۔

جب قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ گوکل داس جی کو واپس گھر بھیج دیا گیا تھا۔ اور

گنتی کے چند لوگ آگے نکل گئے تھے۔

عام طور پر شہر سے باہر نکلنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ نہ جانے کتنے عرصے کے بعد شہر سے باہر گیا تھا۔ وہ جگہ نئی نئی سی دکھائی دینے لگی۔

پکی سڑک چھوڑ کر ہم کچی سڑک پر ہو لیے۔ آگے دریا تھا۔ گیلی ریت ارد گرد دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑے چوبی پھاٹک میں سے گذرنے کے بعد دریا کا پانی دکھائی دینے لگا۔

پانی اترا ہوا تھا۔ اس لیے ہم لوگ اس جگہ پہنچے جہاں پانی کافی گہرا تھا تا کہ مٹکا ڈبویا جاسکے۔ پرلے کنارے پر پرانے زمانے کی کوئی ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آرہی تھی۔ اس کے قریب سے اونچے اونچے کانٹے دار درختوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا تھا اگرچہ اس وقت ہوا بڑے زور کے ساتھ چل رہی تھی۔ لیکن وہ درخت بالکل ساکن اور جامد کھڑے تھے۔ نہ وہ ہوا سے متاثر نظر آتے تھے نہ سردی سے۔

ہمارے قریب ریت پر سرکنڈوں کو کھڑا کر کے ایک اوٹ سی بنا لی گئی۔ اوٹ کے قریب ایک چار پائی پڑی تھی۔ اور اس پر بیٹھے ہوئے دو تین مسلمان...... غالباً ملاح خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان کے پاؤں کے قریب زمین پر لکڑی کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر تلے دھرے تھے۔ ان میں سے آگ کے شعلے لپک لپک کر نکلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے جب کبھی ہوا کا کوئی نہایت تیز جھونکا آتا تو آگ غرّا کر بھڑک اٹھتی اور وہ جٹا دھاری سادھو جو نیچے بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اچک کر پیچھے ہٹ جاتا۔

ابھی تک نتھو رام مٹکا لے کر وہاں نہ پہنچا تھا۔ حکم چند اور میں باتیں کرتے ہوئے ذرا پرے چلے گئے۔ وہ کہنے لگے۔ اب تو مٹکے کا رواج بھی نہیں رہا...... آپ سمجھے نا سولہ برس سے اس شہر میں ہوں...... چھوٹے بچوں کو بڑی سی ہانڈی میں رکھ کر ڈبو دیا جاتا ہے۔

اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ دور سے نتھو رام مٹکا کندھے پر دھرے آتا دکھائی دیا۔

مٹکا پہنچ جانے پر پھر ہنگامہ شروع ہوا۔ بابو گوکل داس کے بڑے بھائی نے سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی بچی کو اٹھایا۔ حکم چند نے رائے دی کہ بچی کو دریا میں ایک غوطہ دے کر مٹکے میں رکھا جائے۔ جب اسے غوطہ دیا گیا تو کپڑا گیلا ہو کر اس کے بدن سے چپک گیا اور ننّی گوشت کا ایک لوتھڑا دکھائی دینے لگی۔ اسے مٹکے میں ڈال دیا گیا اور پھر مٹکے کا وزن بڑھانے کے لیے اس میں بہت سی ریت ڈال دی گئی اور آخر میں چاولوں کی کھیلیں مٹھیاں بھر بھر کر مٹکے میں بکھیر دی گئیں۔

اس سرد اور بوجھل شام کو جب مچھیرا بچی کا مٹکا کشتی پر رکھ کر گہرے پانی کی طرف چلا تو میرا دل موت کے خیال سے مغموم ہو گیا۔

ہم دور کھڑے کھڑے سب کارروائی دیکھتے رہے۔ مٹکا بہت بھاری ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے سرکا کر پانی میں ڈالا۔ مٹکے کے منہ پر ایک موٹا سا کپڑا بندھا تھا۔ اس لیے پانی...... اندر داخل نہ ہوسکا۔ چناں چہ کپڑا پھاڑ دیا گیا۔ اور جب مٹکے میں پانی بھر گیا تو وہ آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور چند بلبلے پانی کی سطح پر تیرتے رہ گئے۔

جب وہاں سے واپس لوٹے تو ایک رجسٹر پر مرحوم بچی کا نام درج کیا گیا اور پھر سب لوگ جلدی جلدی تانگوں پر بیٹھ کر گھر کو چل دیے۔

حکم چند اور میں آخری تانگے پر سوار ہو گئے۔ میری سائیکل خراب تھی۔ اس لیے تانگے پر بیٹھ گیا۔ حکم چند میرا سائیکل تھامے پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور...... وزن برابر رکھنے کے لیے میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑا نیا تھا پہلے تو اس نے کچھ ہٹ کی اور پھر چل کھڑا ہوا۔

جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو پھر بوندا باندی ہونے لگی۔ ہمارے تانگے پر

چھت نہیں تھی۔ بابو حکم چند کے پاس چھتری تھی۔ وہ تان لی گئی۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ ایسے موقعوں پر سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ شہر کی گہما گہمی سے دور وہ جگہ کچھ تو ویسے ہی سنسان تھی اور کچھ ہمارے دل بوجھل ہو رہے تھے۔ میں نے بات چھیڑنے کی غرض سے کہا۔'' بابو حکم چند جی! آج تو غضب ہی ہوگیا۔ بچی کی موت اس قدر خلاف توقع تھی۔ میں نے جب یہ خبر سنی تو دل کو یقین ہی نہ آیا......''

حکم چند اپنی ٹوتھ برش کی مانند سخت مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ''بالکل یہی قصہ میرے ساتھ پیش آیا۔ آج میں بابو گوکل داس کے لیے ایک مکان کا پتہ لگانے کے لیے گیا تھا۔ جب واپس آیا تو نوکر نے یہ خبر سنائی اور میں دم بخود رہ گیا۔''

مکانوں کا ذکر چھڑا تو میں نے کہا۔'' آج کل مکانوں کی بھی بہت سخت قلت ہے۔''

'' جی ہاں...... اور پھر آپ سمجھئے کہ بعض موقعوں پر اگر مکان نہ ملے تو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ آپ ہی کہیئے بھلا بابو گوکل داس کا اس مکان میں گزارا کیوں کر ہو سکے گا۔ ان کو تو بہرحال بڑا مکان ملنا ہی چاہئے۔''

میں ان کی بات نہ سمجھ پایا— نظر اٹھا کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے میری لاعلمی بھانپ کر سرگوشی میں کہا ''بابو گوکل داس کے گھر میں...... امید سے ہیں نا!...... بس ایک ڈیڑھ ماہ ہی کی بات تو ہے۔''

یہ کہہ کر ان کے لبوں پر امید و مسرت کی ایک موہوم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ ''سنہرا دیس'' میں شامل ہے۔

بابو مانک لعل جی

مانک لعل عرصہ سات سال سے لکشمی کیمیکل ورکس میں بحیثیت کلرک ملازم تھا۔

وہ موٹا اور بے ڈول سا شخص تھا۔ اس کا جسم پلپلا، رنگ مٹیالا، آنکھیں زیادہ لکھنے پڑھنے کی وجہ سے چندھیائی ہوئی، کمر قدرے جھکی ہوئی۔ اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں نیچے کی طرف گھوم کر اس کی باچھوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ خشخاشی بالوں والے سر پر گاندھی ٹوپی، آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ، گاڑھے کا کرتا ململ کی دھوتی، اور پاؤں میں عموماً سیاہ رنگ کا پمپ شو پہنتا تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو اس کے ہاتھ میں لکڑی کے دستے والی چھتری ضروری ہوتی۔ وہ ناک کی سیدھ میں گردن آگے کو بڑھائے لپکتا ہوا چلتا تھا۔ اس کتے کی طرح جو کسی جانور کی بو پا کر سیدھا اس کی کمین گاہ کی طرف بڑھتا چلا جائے۔

سورج نکلتے ہی وہ صدر بازار کی طرف چل کھڑا ہوتا۔ اور پھر رات ہوجانے پر لوٹتا تھا۔ جس رفتار اور انداز میں وہ جاتا اسی طرح واپس چلا آتا۔

دکان میں اس کے علاوہ سات ملازم اور تھے۔ ایک اکاؤنٹنٹ' باقی چھ ملازم ادھر اُدھر کے کاموں کے لیے۔

بڑے لالہ اپنی میز کے قریب کرسی بچھائے پان چبایا کرتے۔ ان کا مرغوب بڑا آنکھیں روشن، کنپٹیاں چکنی، نتھنے پھولے ہوئے، مونچھیں الہ دین کے چراغ کے جن کی

طرح خوب بڑی بڑی اور پھیلی ہوئی۔ ان کی گدی کے نیچے گوشت پر تین چار بل پڑے رہتے تھے۔ وہ کرسی پر پاؤں سمیٹے اس طرح بیٹھتے تھے جیسے چارپائی پر بیٹھے ہوں۔ خوب گرج دار آواز میں بولتے اور نت نئی گالیاں سناتے۔

ان کے قریب چھوٹی میز پر اکاؤنٹنٹ بڑی تمکنت اور خاموشی سے بیٹھا کام میں مصروف رہتا۔ لالہ اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرتے تھے۔ شاید اس کا کام ہی کچھ ایسا تھا کہ کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

باقی نوکر ادھر اُدھر کے کاموں میں لگے رہتے۔ کوئی بوتلوں پر کارک لگا رہا ہے کوئی لیبل چپکا رہا ہے، کوئی پیٹیاں بند کر رہا ہے۔ کوئی دوائیاں گھوٹ رہا ہے۔ کوئی گولیاں بنانے والی مشین کا دستہ گھما رہا ہے۔

ان سب میں مانک لعل ہی کی زیادہ شامت آتی تھی۔ مانک لعل بڑے لالہ کی عین سیدھ میں دکان کے پرلے کونے میں تخت پوش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے سامنے تخت پوش پر ایک چھوٹی سی ڈسک دھری ہوتی۔ ڈسک پر کاغذات کا انبار اور ادھر اُدھر بکھرے ہوئے بہی کھاتے۔

بڑے لالہ کو اگر کوئی بات بھی دریافت کرنی ہوتی۔ تو مانک لعل ہی کو للکارتے۔ ''کیوں بے منکے! وہ بلٹی واپس کیوں آئی؟— کوہاٹ کو تین وی پی روانہ کر دیئے— میں جو ڈھائی انچ کیلوں کا بکس لایا تھا وہ کیا ہوا؟— ابے میری کھڑاؤں کدھر ہیں؟— تو مہروالوں کے ہاں گیا تھا؟— ٹھیلے والوں کو تاکید کر دی تھی۔'' غرض دنیا بھر کی کوئی بات ایسی نہ تھی جس کی جواب طلبی مانک لعل سے نہ کی جاتی۔ شاید لالہ، مانک لعل کو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سمجھتے تھے۔ کہ دنیا بھر کی جو بات چاہو دریافت کرلو۔ اور پھر ستم ظریفی یہ تھی کہ لالہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مانک لعل کے پاس ہر بات کا معقول جواب بھی ہونا چاہئے۔

مانک لعل سب سے پہلے دکان پر پہنچتا۔ اس وقت نوکر جھاڑو دے رہا ہوتا۔ وہ صفائی سے فارغ ہوتا تو مانک لعل اپنی ڈسک کے قریب بیٹھے بیٹھے سوچتا کہ گرد اڑ کر بڑے لالہ کی میز پر جا پڑی ہے۔ نوکر کس قدر بے وقوف ہے۔ اسے اتنی بھی تمیز نہیں کہ

فرش پر جھاڑو دینے کے بعد کم از کم بڑے لالہ جی کی میز ہی صاف کردیا کرے چناں چہ یہ سوچ کر وہ ڈرتے ڈرتے بڑے لالہ کی میز کے قریب جاتا اور دیکھتا کہ واقعی میز کی ہر چیز پر گرد کی باریک سی تہ جم گئی ہے۔ وہ دز دیدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتا جیسے وہ چوری کرنے جارہا ہو۔ پھر جھاڑن لے کر بڑی احتیاط سے میز کی ہر شے صاف کردیتا۔

رفتہ رفتہ دکان میں چہل پہل بڑھ جاتی۔ باقی نوکر بھی پہنچ جاتے۔ دس بجے کے قریب لالہ بھینسے کی طرح گردن ہلاتے ہوئے آتے۔ اکاؤنٹنٹ ان کے ہمراہ ہوتا۔ لالہ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بڑی گھل مل کر باتیں کرتے تھے۔ اہم کاموں میں اسی کا مشورہ طلب کرتے۔ ویسے عام گفتگو میں بھی اسے تم یا تو کہہ کر مخاطب نہ کرتے تھے۔ آتے ہی بڑے لالہ پہلے تو دکان کے اندر والے کمروں کا مختصر سا چکر لگاتے۔ پھر نوکروں کو مختلف ہدائتیں دینے کے بعد واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھتے۔

انگوچھے سے گردن اور پیشانی پونچھتے ہوئے وہ میز پر پڑی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیتے۔ یکا یک انہیں کل کی ڈاک کا خیال آجاتا۔ جو اکثر وہ گھر ہی پر بھول آتے تھے۔ لیکن سمجھتے یہ کہ وہ خطوط میز ہی پر پڑے تھے۔ وہ للکار کر کہتے۔ ''منکے۔''

مانک لعل دسویں پاس کرنے کے فوراً ہی بعد بڑی سفارش سے لالہ کے ہاں ملازم ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک لالہ اسے ''منکا'' ہی کہہ کر پکارتے تھے۔ مانک لعل اپنی ڈسک پر جھکا ہوا کام میں مصروف ہوتا تھا۔ لالہ کی آواز سنتے ہی ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ''جی! لالہ جی! جی......''

بڑے لالہ بڑا سا منہ پھیلا کر کہتے۔ '' کیوں بے! آج صبح میری میز کس نے صاف کی تھی؟''

وہ ہکلا کر کہتا۔ '' لالہ جی! جی لالہ جی!''

لالہ جی اس پر کڑی نظریں گاڑ کر کہتے۔ '' ابۓ جی لالہ جی' کے بچے! میری میز کو کس نے چھوا تھا۔''

''جی لالہ جی...... میں نے ذرا گرد جھاڑی تھی۔''

''میں پہلے ہی جانتا تھا۔ تو نہ گرد جھاڑے گا تو اور کون جھاڑے گا؟— ابے گرد جھاڑی یا سب چیزیں ہی جھاڑ ڈالیں؟''

مانک لعل کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ لالہ حلق سے آواز نکال کر کہتے۔ ''ابے گدھے! تجھ سے کس نے کہا تھا کہ میری میز کی گرد جھاڑا کر۔''

اس طرح مانک لعل کو سیوا کا میوہ ملتا۔ اس کے سپرد ایک قسم کا کام بھی تو نہ تھا بلکہ اس سے دنیا بھر کے کام لیے جاتے تھے۔ لالہ کہتے ''منکے! ابے ٹھیلے والوں کو کیا ہوگیا؟ پیٹیاں پڑی سڑتی ہیں۔''

مانک لعل کے ہاتھ اٹھ کر جڑ جاتے۔ ''جی لالہ جی...... میں...... میں''

''ابے میں میں کیا کرتا ہے۔ جا پتہ لگاتا جا کر...... میں میں...... میں میں۔''

مانک لعل اسی وقت شو پہن کر ہاتھ میں چھتری لیتا اور گردن آگے کو بڑھائے ٹھیلے والوں کی طرف روانہ ہوجاتا۔ جب وہ ٹھیلے والوں کے قریب پہنچتا۔ تو دور ہی سے اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے۔

ٹھیلے والے سب کے سب مسلمان تھے۔ وہ لوگ بہت مضبوط اور اکھڑ تھے۔ سر اُستروں سے منڈوائے ہوئے میلے تہبند باندھے ایک دوسرے کی رانوں پر ہاتھ مار مار کر ہنستے۔ ان کے منہ کے دہانے خونخوار درندوں سے مشابہ تھے۔ مانک لعل ان کے ہاں جانے سے بہت کتراتا تھا۔ وہ عموماً ان کے اڈے سے ادھر ہی پنواڑی کی دکان پر رک جاتا پسینہ پونچھتا۔ اپنے جوتوں پر سے گرد جھاڑتا۔ پان کی گلوری کلے میں دبا کر بتیسی نکالتے ہوئے پنواڑی سے پوچھتا۔ ''کہو بھائی! کوئی دنگہ فساد تو نہیں ہوا نا!...... بھئی یہ ٹھیلے والے تم جانتے ہی ہو......''

جب پنواڑی سے اسے تسلی بخش جواب ملتا تو وہ ایک لمبی اور گہری سانس لیتا۔ اور سپاری کے پانچ سات ٹکڑے...... چباتے ہوئے آگے روانہ ہوجاتا۔ جب ٹھیلے والوں

کی وحشی صورتیں دکھائی دیتیں تو دور ہی سے قدم لڑکھڑانے لگتے۔ چھتری کے پیچھے چھپا ہوا اس انداز سے آگے بڑھتا جیسے خطرے کی بو پاتے ہی بگٹٹ بھاگ نکلے گا۔

لیکن وہ بے چارا اس قدر بے ضرر طبیعت کا مالک تھا کہ کسی شخص کو اسے ایذا پہنچانے کا خیال تک نہ آسکتا تھا۔ جب وہ ٹھیلے والوں کے چودھری عبد اللہ کو دیکھتا تو خوب کھکھیا کر ہنستا اور اپنی چندھی آنکھوں سے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتا کہ جواب میں وہ بھی ہنستا ہے یا نہیں...... عموماً چودھری اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتا تھا۔ وہ بلند آواز میں پکار کر کہتا۔ '' آیئے بابو جی! ارے بھائی بابو جی کے لیے کرسی لاؤ۔''

مانک لعل '' بابو جی'' کے الفاظ سن کر بہت خوش ہوتا۔ چھتری بند کرتے ہوئے بکری کی طرح ممیا کر کہتا۔ '' ارے بھائی کرسی کی کیا ضرورت ہے۔ میں یہیں بیٹھ جاؤں گا۔''

لیکن جب تک ایک بازو والی ٹوٹی پھوٹی کرسی نہ آجاتی وہ کھڑا رہتا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ کہتا۔ '' اجی چودھری جی کہاں رہتے ہو۔ کبھی دکھائی نہیں دیتے۔''

اس کے بعد مانک لعل اصل مدعا بیان کرتا۔ تو اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے ٹھیلے والے کہتے۔ ''بابو! تمہارے لالہ کا مجاج ٹھکانے نہیں رہا۔ جب جاؤ گالیاں بکنے لگتا ہے......''

مانک لعل سہم جاتا۔ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ان لوگوں سے یہ بھی بعید نہیں کہ چپکے سے چاقو نکال کر پیٹ میں بھونک دیں۔ جب وہ تصور میں اپنی لاش دیکھتا تو اس کا دل ڈوبنے لگتا۔

پھر وہ بڑے لالہ کی حمایت میں کچھ نہ کچھ کہتا۔ '' لالہ دل کے برے نہیں۔ ہاں زبان پر قابو نہیں...... اس کے بعد وہ نتھنے پھلا کر اپنی طرف اشارہ کرکے کہتا۔ اور تو اور وہ مجھی کو سرد گرم کہنے سے نہیں چوکتے۔'' اور پھر آنکھیں نکال کر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا۔''...... میں بھی اکڑ جاتا ہوں بعض دفے۔''

"ٹھیلے والوں میں سے کوئی کھانس کر تھوکتے ہوئے کہتا۔" بابو جی! بڑے لالہ کا مجاج تو ہم ایک ہی دن میں ٹھکانے لگا دیں! جی بس تمہارے لحاج سے آنکھ نہیں اٹھتی۔"

اس پر مانک لعل ریشہ خطمی ہوجاتا۔

اگر کبھی دکان میں بیٹھے بیٹھے بڑے لالہ کو کوئی بات یاد آجاتی مثلاً آج بچے روٹی کھائے بغیر ہی اسکول چلے گئے ہیں تو وہ پھر مانک لعل کو آواز دیتے۔"منکے"۔

ان کی آواز کے ساتھ ہی مانک لعل بدک جاتا۔ جس ہاتھ میں قلم ہوتا اس کی انگلیاں ڈھیلی پڑجاتیں۔ فوراً اٹھ کر دھوتی سنبھالتا ہوا لالہ کے قریب جا کھڑا ہوتا...... ادھر لالہ آواز دے کر بھول جاتے کہ اُنہوں نے ہی اسے بلایا تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہوجاتے اور مانک لعل ان کی میز کے قریب چپ چاپ کھڑا رہتا کہ لالہ کا کام ختم کر کے خود ہی کچھ کہیں گے۔ چند لمحوں کے بعد لالہ سر اٹھاتے اور تعجب سے پوچھتے۔ "کہو کیسے کھڑے ہو۔"

مانک لعل دل کڑا کر کے کہتا۔" جی لالہ جی۔ آپ ہی نے تو آواز دی تھی مجھے۔"

پیش تر اس کے کہ اُن کے منہ سے کوئی مفرح گالی نکلے انہیں اصل بات یاد آجاتی۔"ارے ہاں! کاشی اور مینو روٹی کھائے بغیر ہی اسکول چلے گئے ہیں۔ تم گھر سے روٹی لے جاؤ اور انہیں کھلا کر فوراً واپس آجاؤ۔"

مانک لعل حسبِ عادت لپک کر جاتا اور ان کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتا۔ پہلے تو گھر کی نوکرانی کالی کلوٹی بارہ سالہ لڑکی آن صورت دکھاتی۔ مانک لعل کو دیکھ کر نہ معلوم اس کی باچھیں چر کیوں جاتیں۔ وہ اس چھوکری کے سامنے بڑی سنجیدگی اور وقار سے گفتگو کرتا اور اسے مرعوب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ لیکن وہ مردود دیدے چمکائے ہی جاتی۔ کالے بھجنگ چہرے میں بے طرح پھٹے ہوئے منہ کے دہانے میں سے سپید سپید دانت دکھائی دیتے۔ ایک تو کم بخت بات ہی نہ سمجھ پاتی تھی۔ اور دوسرے اس کا دھیان بھی اور ہی کسی طرف ہوتا تھا۔ کبھی اپنی چوٹی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ کبھی دروازہ پکڑ کر

ادھر اُدھر جھول رہی ہے۔ بڑی مشکل سے کہیں اندر جاکر اس کے آنے کی خبر دیتی پلپلے ٹماٹر کی سی لالائین دروازے کے قریب آن کھڑی ہوتی۔

مانک لعل زیادہ سے زیادہ لالائین کے پھولے ہوئے گورے گورے ہاتھ یا کہنیوں تک بازو ہی دیکھ پاتا تھا۔ لالائین پوچھتی۔ "اجی روٹی لے جانے کے لیے آپ کو بھیجا ہے انہوں نے۔"

مانک لعل اس میں اپنی تضحیک کا پہلو سمجھ جاتا۔ اور کھانس کر کہتا۔ "آخ...... اخ...... خ خود ہی چلا آیا۔ میں میں نے لالہ سے کہا۔ میں ہی بچوں کو روٹی دے آتا ہوں اور پھر انہیں دیکھ بھی آؤں گا۔ دھوپ میں نہ کھیلتے ہوں کہیں۔ آج کل دھوپ تیز ہے موسم بھی اچھا نہیں۔

لالائین، کالی چھوکری کو آواز دے کر کہتی۔ "اری منیب جی کو مونڈھا لاکر دے۔"

مانک لعل دھوپ ہی میں چھتری تان کر مونڈھے پر بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھار لالائین بڑے اصرار سے اپنی دانست میں میٹھے سوڈے کا ادھیا بھی پلا دیتیں۔ لیکن وہ بیش تر کھاری ہوتا۔ غالبًا چھوکری دو پیسے میں سے ایک پیسہ بچا کر ایک پیسہ کا کھاری سوڈا لے آتی۔

یہی نہیں مانک لعل اپنے سے کم درجے کے نوکروں کی خوشنودی کا بھی خیال رکھتا تھا۔ نوکر اس کی ذرّہ بھر بھی عزت نہ کرتے تھے۔ کبھی لالہ چلّا کر کہتے۔ ابے حرام زادو! ابھی تک پیٹی میں کیل بھی نہیں جڑے۔"

اور سب تو کان دبا کر ادھر اُدھر سرک جاتے۔ البتہ مانک لعل جھٹ اٹھ کر پیٹیوں میں کیل جڑنے لگتا اور جس وقت وہ بے چارا کیل جڑ رہا ہوتا تو دبی دبی نظروں سے دوسرے نوکروں کی طرف بھی دیکھے جاتا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کرتا کہ وہ لوگ بھی ان کی مدد کریں۔ لیکن وہ سب ایسے منہ پھیر لیتے جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔ پھر اگر لالہ کی اس پر نظر پڑ جاتی تو اپنی گرج دار آواز میں کہتے۔ "منکے! کیل جڑ رہے ہو کیا؟"

وہ مسکین آواز میں جواب دیتا۔ جی لالہ!

پھر وہ تھوڑی دیر تک منتظر رہتا کہ شاید لالہ دوسرے نوکروں پر خفا ہوں کہ وہ اس کی مدد کیوں نہیں کرتے۔ لیکن لالہ بس اتنی سی بات پوچھ کر اپنے کام میں منہمک ہوجاتے۔

لیکن جب کبھی نوکروں کا اپنا کام آن پڑتا تو وہ ذرا سا خوشامدانہ لہجہ، اختیار کر لیتے ادھر مانک لعل فوراً ہتھیار ڈال دیتا۔ اپنے فرصت کے گھنٹے ان ہی کاموں میں صرف کردیتا کسی کی انجن مارکہ گھڑی مرمت طلب ہے۔ کسی کو نیا جوتا لے کر دینا ہے۔ کسی کی دھوتی پھٹ گئی ہے۔

تہوار کا دن ہوتا تو سب ملازم مانک لعل کو آگھیرتے۔ مشورہ کرتے کہ دوسرے دن کی چھٹی منائی جائے۔ دوسری دکانوں پر بھی کام بند رہے گا۔ بڑا شان دار میلہ لگے گا۔ وہاں عورتیں خوب بن ٹھن کر آئیں گی۔ خوب مزے سے گذرے گی۔

اب سب میں خوب کھچڑی پکتی۔ مانک لعل کی تھوڑی بہت خوشامد کی جاتی۔
''اجی بابو جی!— لالہ آپ کا کہنا کہاں موڑیں گے۔ ہماری طرف سے کہہ دو نا کہ ڈولی مولی کا میلہ ہے اور دکانیں بھی بند رہیں گی۔ آپ بھی چھٹی کر دیجئے نا!''

ادھر نوکروں کے خوشامدانہ گلے۔ ادھر بڑے لالہ کا خوف۔ مانک لعل عجب مخمصے میں گرفتار ہوجاتا۔ بالآخر وہ کہتا۔ '' بھئی! دیکھو اصل طریقہ یہ ہے کہ ایک عرضی اس مطلب کی لکھ دی جائے۔ اس پر سب لوگ دستخط کریں۔ اور میں وہ عرضی لالہ جی کے سامنے پیش کردوں گا۔''

چناں چہ عرضی لکھی جاتی۔ سب لوگ دستخط کردیتے یا انگوٹھے لگا دیتے۔ لیکن مانک لعل کبھی دستخط نہ کرتا۔ وہ ڈرتا تھا مبادا بڑے لالہ سمجھیں کہ وہی سب نوکروں کو بہکاتا ہے۔

جب بڑے لالہ دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آتے تو میز پر عرضی پڑی دیکھ کر

پکارتے۔ ''منگے!''

مانک لعل بھاگ کر ان کے قریب جاتا اور ہاتھ سہلاتے ہوئے نوکروں کا مطالبہ بیان کرتا۔ چناں چہ چھٹی منظور ہو جاتی۔

دوسرے روز سب لوگ تو مزے میں چھٹی مناتے۔ لیکن مانک لعل حسب معمول کپڑے پہنتا اور لالہ کے گھر پہنچ کر آواز دیتا۔

لالہ جی صحن میں بیٹھے بیٹھے پکارتے ''منگے!''

مانک لعل باہر ہی زمین پر بچھا جاتا۔ ''جی لالہ جی۔''

لالہ جی فوراً کالی چھوکری کے ہاتھ دکان کی چابیاں باہر بھیج دیتے۔ اور آواز دے کر کہتے۔ ''جھاڑو واڑو لگا دو۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔''

اس دن بجائے نوکر کے دکان میں مانک لعل ہی جھاڑو دیتا۔ پھر لالہ آتے۔

''بھئی ان پیٹیوں میں سارسپریلا کی شیشیاں بند کردو۔'' یا چٹھیوں کے انبار کی طرف دیکھ کر کہتے ''منگے یہ دوچار چٹھیاں پڑی ہیں۔ ان کے جواب ہی لکھ ڈالو۔'' اس کے بعد وی پی کرانے کے لیے ڈاک خانے بھیج دیتے۔ یہ کام ختم ہوتا تو بنک سے بلٹیاں لانے کے لیے روانہ کردیتے۔ اس ہیرا پھیری میں چار بجنے کو ہوتے یعنی مکمل چھٹی سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دفعتاً چونک کر آواز دیتے۔ ''بابو مانک لعل جی۔''

کبھی کبھی بڑے لالہ اسے مانک لعل جی کہہ کر بھی پکارتے تھے۔ مانک لعل کو ان کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ بڑے لالہ اس کو اس قدر احترام سے بلاتے تو وہ نہال ہو جاتا۔ اس کے دل کی ساری کدورت اور جسم کی تکان دور ہو جاتی۔ وہ ادھر اُدھر جھانک کر دیکھتا کہ کسی اور نے بھی سنا ہے یا نہیں۔ چناں چہ ایسے موقعوں پر وہ خاص طور پر میٹھی آواز میں جواب دیتا۔ ''جی لالہ جی!''

یہ کہہ کر وہ لالہ جی کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ اس وقت اس کی ناک کی نوک پر خون کی سرخی جھلکتی ہوتی۔ بڑے لالہ فراخ دلی سے کہتے۔ بھئی بابو مانک لعل جی! جاؤ تم

بھی چھٹی مناؤ۔ ارے بھئی کام دام تو ہوتا ہی رہے گا۔ جاؤ موج کرو۔"

یوں تو مانک لعل میرے پڑوسی ہی تھے۔ لیکن ہمارے تعلقات استوار اس وقت ہوئے تھے جب مجھے اپنی بچی کے لیے اورٹین کی ضرورت پڑی۔ جنگ کی وجہ سے کہیں دستیاب نہ ہوسکی۔ تو میں نے مانک لعل سے کہا اور اس نے بڑے لالہ سے کہہ کر مجھے ایک ڈبہ دلوا دیا۔

اس کے بعد ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ عموماً وہ کسی شخص سے راہ و رسم نہ رکھتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا۔ البتہ مجھے اپنی بعض باتوں میں راز دان بنانے میں چنداں ہرج نہ سمجھتا تھا۔

اُس کے گھر میں اس کی بیوی' دو بچّے' بوڑھا باپ اور ایک بیوہ بہن تھی۔ باپ کی بینائی بہت کمزور تھی۔ بیٹھا رام نام جپتا اور ناریل کے دم لگاتا۔ بیوی غلیظ نتھنوں والی ایک باتونی عورت تھی۔ بچے چھچھوندروں کی طرح مارے مارے پھرتے۔ بہن کا کسی غیر مرد سے یارانہ تھا۔ وہ بڑی منہ زور اور با ذوق عورت تھی۔ شکل و صورت تو خیر غنیمت ہی تھی۔ البتہ ناز و ادا کی کمی نہ تھی۔ خوب چکنی چپڑی بنی ٹھنی رہتی۔ دن بھر مٹک مٹک کر ادھر اُدھر گھوما کرتی۔ جب چلتی تو اس کی ایڑیاں زمین کو نہ چھوتی تھیں۔ اسے لذیذ کھانے پکانے میں بڑی مہارت تھی۔

مانک لعل بہن کے عشق سے ناواقف نہ تھا۔ لیکن کہہ کچھ نہ سکتا تھا۔ وہ سب سے ڈرتا تھا۔ بیوی سے' باپ سے' بہن سے' بچوں سے غرض ہر ایک سے دب کر رہتا۔

جب وہ شام کے وقت تھکا ماندہ گھر واپس آتا تو جوتے اتار کر چار پائی پر بیٹھا پاؤں سہلایا کرتا۔ بچے ٹین بجاتے ہوئے باپ کی چارپائی کے چکر کاٹتے۔ جب نہادھو کر وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اس کی بیوی اس کی بہن کی لگائی بجھائی کرتی۔ اور وہ ہوں ہاں کرتا ہوا جلدی جلدی کھانا ختم کر کے صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹ جاتا۔

اس کی بہن اس کی برملا تعریف کرتی۔ کہتی۔'' میرا بھیا تو ہیرا ہے ہیرا' بھاوج ناک سکوڑ کر کہتی۔'' ہاں ہاں ہیرا نہ ہوتا تو تو اس طرح بغلیں بجاتی ہوئی محلہ بھر کا کونا کھدرا نہ سونگھتی پھرتی۔''

اس پر نند بگڑ جاتی۔ وہ بھی بڑی لڑاکا تھی۔ طعنہ زنی اور جلی کٹی سنانے میں وہ بھی بھاوج سے کم نہ تھی بلکہ دو جوتے آگے ہی تھی۔ اس نے بھاوج کا جھوٹ موٹ کا عاشق گھڑ لیا تھا۔ جب بھاوج اسے زیادہ دق کرتی تو وہ اسے اس کے فرضی عاشق کے طعنے دینے لگتی۔

اس بات پر وہ جل بھن کر کباب ہوجاتی۔ آخر اس دیدہ دلیری کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ جب نند کی زبان لتر لتر چلنے لگتی تو بھاوج سے کچھ جواب ہی نہ بن پڑتا۔ یہاں تک کہ وہ رونے لگتی۔ پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتی ہائے میرے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے۔ جو اس کے پلّے بندھی۔ اس سے بہتر تھا ماں باپ نے افیون ہی کھلا دی ہوتی۔

یقیناً یہ بڑی دکھ کی بات تھی کہ پتی برتا عورت پر غیر مرد سے راہ و رسم کا الزام لگایا جائے۔ بھاوج میں ہزار عیب سہی لیکن تھی وہ پاک باز۔ جب اس کا خاوند گھر آتا تو وہ رو رو کر اسے اپنا دکھڑا سناتی۔ مانک لعل بے توجہی سے سنا کرتا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ اپنی بہن سے خوف کھاتا تھا۔ بہن سے زیادہ اسے اس کے عاشق سے ڈر لگتا تھا۔ اگر وہ آنکھوں میں کاجل لگائے گلے میں سونے کا تعویذ لٹکائے کہیں اینڈ اینڈ کر گھومتا ہوا نظر آجائے تو بجائے اس کے کہ اس کی رگِ حمیت پھڑکے وہ خود ہی نظر بچا کر ادھر اُدھر کھسک جاتا۔ ساتھ والی ویران باغیچی کے اس گوشے سے بھی وہ واقف تھا۔ جہاں اس نے عاشق و معشوق کو بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ کان لپیٹ کر چپکے سے اس طرح گذر جاتا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

اسی پر بس نہ تھی بلکہ وہ اپنی بیوی کی نظر بچا کر بہن کو جیب خرچ کے لیے روپیہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بہن اپنے آشنا سے تعلق نہ رکھے۔

بھی چھٹی مناؤ۔ ارے بھئی کام وام تو ہوتا ہی رہے گا۔ جاؤ موج کرو۔"

یوں تو مانک لعل میرے پڑوسی ہی تھے۔ لیکن ہمارے تعلقات استوار اس وقت ہوئے تھے جب مجھے اپنی بچی کے لیے اورلٹین کی ضرورت پڑی۔ جنگ کی وجہ سے کہیں دستیاب نہ ہوسکی۔ تو میں نے مانک لعل سے کہا اور اس نے بڑے لالہ سے کہہ کر مجھے ایک ڈبہ دلوا دیا۔

اس کے بعد ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ عموماً وہ کسی شخص سے راہ و رسم نہ رکھتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا۔ البتہ مجھے اپنی بعض باتوں میں راز دان بنانے میں چنداں ہرج نہ سمجھتا تھا۔

اُس کے گھر میں اس کی بیوی' دو بچے' بوڑھا باپ اور ایک بیوہ بہن تھی۔ باپ کی بینائی بہت کمزور تھی۔ بیٹھا رام نام جپتا اور ناریل کے دم لگاتا۔ بیوی غلیظ نتھنوں والی ایک باتونی عورت تھی۔ بچے چھچھوندروں کی طرح مارے مارے پھرتے۔ بہن کا کسی غیر مرد سے یارانہ تھا۔ وہ بڑی ہنسوڑ اور با ذوق عورت تھی۔ شکل وصورت تو خیر غنیمت ہی تھی۔ البتہ ناز و ادا کی کمی نہ تھی۔ خوب چکنی چپڑی بنی ٹھنی رہتی۔ دن بھر ملک ملک کر ادھر اُدھر گھوما کرتی۔ جب چلتی تو اس کی ایڑیاں زمین کو نہ چھوتی تھیں۔ اسے لذیذ کھانے پکانے میں بڑی مہارت تھی۔

مانک لعل بہن کے عشق سے ناواقف نہ تھا۔ لیکن کہہ کچھ نہ سکتا تھا۔ وہ سب سے ڈرتا تھا۔ بیوی سے' باپ سے' بہن سے' بچوں سے غرض ہر ایک سے دب کر رہتا۔

جب وہ شام کے وقت تھکاماندہ گھر واپس آتا تو جوتے اتار کر چار پائی پر بیٹھا پاؤں سہلایا کرتا۔ بچے ٹین بجاتے ہوئے باپ کی چارپائی کے چکر کاٹتے۔ جب نہادھو کر وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اس کی بیوی اس کی بہن کی لگائی بجھائی کرتی۔ اور وہ ہوں ہاں کرتا ہوا جلدی جلدی کھانا ختم کر کے صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹ جاتا۔

اس کی بہن اس کی برملا تعریف کرتی۔ کہتی۔'' میرا بھیا تو ہیرا ہے ہیرا' بھاوج ناک سکوڑ کر کہتی۔'' ہاں ہاں ہیرا نہ ہوتا تو تو اس طرح بغلیں بجاتی ہوئی محلہ بھر کا کونا کھدرا نہ سونگھتی پھرتی۔''

اس پر نند بگڑ جاتی۔ وہ بھی بڑی لڑاکا تھی۔ طعنہ زنی اور جلی کٹی سنانے میں وہ بھی بھاوج سے کم نہ تھی بلکہ دو جوتے آگے ہی تھی۔ اس نے بھاوج کا جھوٹ موٹ کا عاشق گھڑ لیا تھا۔ جب بھاوج اسے زیادہ دق کرتی تو وہ اسے اس کے فرضی عاشق کے طعنے دینے لگتی۔

اس بات پر وہ جل بھن کر کباب ہو جاتی۔ آخر اس دیدہ دلیری کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہئے۔ جب نند کی زبان لتر لتر چلنے لگتی تو بھاوج سے کچھ جواب ہی نہ بن پڑتا۔ یہاں تک کہ وہ رونے لگتی۔ پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتی ہائے میرے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے۔ جو اس کے پلّے بندھی۔ اس سے بہتر تھا ماں باپ نے افیون ہی کھلا دی ہوتی۔

یقیناً یہ بڑی دکھ کی بات تھی کہ پتی برتا عورت پر غیر مرد سے راہ و رسم کا الزام لگایا جائے۔ بھاوج میں ہزار عیب سہی لیکن تھی وہ پاک باز۔ جب اس کا خاوند گھر آتا تو وہ رو رو کر اسے اپنا دکھڑا سناتی۔ مانک لعل بے توجہی سے سنا کرتا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ وہ اپنی بہن سے خوف کھاتا تھا۔ بہن سے زیادہ اسے اس کے عاشق سے ڈر لگتا تھا۔ اگر وہ آنکھوں میں کاجل لگائے گلے میں سونے کا تعویذ لٹکائے کہیں اینڈ اینڈ کر گھومتا ہوا نظر آ جائے تو بجائے اس کے کہ اس کی رگِ حمیت پھڑکے وہ خود ہی نظر بچا کر ادھر اُدھر کھسک جاتا۔ ساتھ والی ویران باغیچی کے اس گوشے سے بھی وہ واقف تھا۔ جہاں اس نے عاشق و معشوق کو بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا تھا۔ لیکن وہ کان لپیٹ کر چپکے سے اس طرح گذر جاتا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

اسی پر بس نہ تھی بلکہ وہ اپنی بیوی کی نظر بچا کر بہن کو جیب خرچ کے لیے روپیہ بھی دے دیا کرتا تھا۔ اگرچہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بہن اپنے آشنا سے تعلق نہ رکھے۔

لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا۔ جیب خرچ دینے میں بھی یہی مصلحت تھی کہ اس کی بہن خوش رہے اور اپنے عاشق سے تعلق توڑ لے۔

چاندنی راتوں کو میں اپنی چھت پر سے جھانک کر دیکھتا تو مانک لعل چارپائی پر لیٹا نظر آتا۔ اس کا کدو کی طرح گول سر اور بالشت بھر کی ٹانگیں قینچی کی طرح پھیلی ہوئی دکھائی دیتیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی باریک آواز میں چلا کر کہتا۔ '' کہیے''

وہ زیادہ باتیں نہ کرتا تھا۔ کبھی کہتا۔ '' ابی کھڑا دیں بڑی مہنگی ہوگئی ہیں۔'' یا '' ارے صاحب کہیں سے تلسی جی کا پودا لا دیجئے نا!'' اور اگر کہیں اس کی بیوی یہ بتانے کے لیے کہ ان کا پودا بالکل خشک ہوگیا ہے کچھ کہنے لگتی تو وہ اسے کم از کم اس بات پر سرزنش کرنے سے ہرگز نہ چوکتا۔ '' للّے کی ماتا! تجھے میں نے اتی دفے منع کیا ہے کہ تو مردوں کی بیچ میں متی بولا کر۔''

ایک مرتبہ میں صدر بازار سے گذر رہا تھا۔ دو تین روز سے مانک لعل سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سوچا چلو ملتا جاؤں۔۔۔ دوکان پر پہنچا تو دیکھا مانک لعل حسب معمول اپنے ڈسک پر جھکا ہوا ہے۔ چہرہ بھی کچھ اترا ہوا ہے۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور جھکے جھکے سرگوشی میں بولا۔ '' آپ بیٹھے رہیے۔ لالہ روٹی کھانے کے لیے جانے والے ہیں پھر ہم باتیں کریں گے۔''

لالہ کے چلے جانے کے بعد اس نے کہا کہ اس ملازمت سے بے زار ہو چکا ہوں۔ جلد از جلد خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تجویز پیش کی سول سپلائیز کے محکمے میں میرا کچھ رسوخ ہے۔ کیا تعجب اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔ وہ اس پر رضا مند ہوگیا۔ میں نے مزید تسلی دی اور جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو اس نے بار بار تاکید کی کہ میں اسی دن ملازمت کی بابت پتہ لگاؤں میں نے وعدہ کیا اور چلا آیا۔

لیکن اس دن میں اس قدر مصروف رہا کہ مانک لعل کا کام نہ کرسکا۔ سوچا دوسرے دن چلا جاؤں گا۔ شام کے وقت بازار سے گذر رہا تھا کہ مانک لعل ایک دوکان

کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ میں نے نظر بچا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اور آواز دے کر بلا لیا۔ بڑا خوش وخرم نظر آرہا تھا۔

چہک کر بولا ۔'' یہ ہمارے بڑے لالہ جی کے بچے ہیں۔ یہ کاشی اور یہ ٹینو۔ انہیں بنیائنیں خرید کر دے رہا ہوں۔''

بچے چیزیں خرید کر ہنستے کھیلتے ہوئے گھر کی جانب چل دیئے۔ ہم دونوں باتیں کرتے رہے۔ میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں ملازمت کی بابت نہ پوچھ بیٹھے۔ لیکن اس نے کہا۔'' اگر آپ کسی کام سے جارہے ہیں تو چلیے۔ مجھے ابھی کچھ دیر لگے گی۔ میں ان بچوں کو گھر تک چھوڑ آؤں۔''

جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو بولا۔''اور ہاں وہ ملازمت......'' میں گھبرایا عذر کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔'' ابھی رہنے دیجئے میں نے موجودہ ملازمت چھوڑنے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔'' پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔

'' بڑے لالہ دل کے اتنے بُرے نہیں...... آج میری ان سے جھڑپ ہوگئی تھی...... میں نے کہا لالہ جی آپ مجھے بہت دق کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر مانک لعل نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ جیسے کوئی بڑی ہی مسرت انگیز بات اس کے سانے میں کروٹیں لے رہی ہو۔

بڑی محبت سے مانک لعل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔'' شام کے وقت جب میں پاشی کی سائیکل میں ہوا بھر رہا تھا۔ تو لالہ نے مجھے آواز دی۔۔۔ '' بابو مانک لعل جی!'' جب میں ان کے قریب پہنچا تو بولے۔'' آج بچوں کو جوتے اور بنیائنیں خرید دیجئے۔ میں اور کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا بابو مانک لعل جی!''

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ ''سنہرا دیس'' میں شامل ہے۔

سہارا

ابھی ابھی اس کی ماں انہیں ملنے کے لیے آئی تھی۔ کیول کرشن کا خیال تھا کہ آج ماں کے ساتھ وہ کھری کھری باتیں کرے گا۔ لیکن اس کی بیوی نے سب کام بگاڑ دیا۔ وہ اپنے دبلے پتلے ہاتھ سے ایک ابھری ہوئی رگ کو انگلی سے دباتا اور پھر چھوڑ دیتا۔ دبے ہوئے مقام پر دفعتاً خون آن جمع ہوتا اور وہ جگہ پھر ابھر آتی تھی۔ بظاہر تو وہ اس کھیل میں مصروف تھا۔ لیکن اس کے کان اپنی ماں اور بیوی کی باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے اور کبھی کبھی وہ دبی نظروں سے ان کی طرف دیکھ بھی لیتا۔ دونوں ساس بہو کیسے سر سے سر جوڑے باتیں کر رہی تھی۔ بھلا کوئی رتنی (بیوی) کو پوچھے کہ تو غسل خانے سے کپڑے دھوتے دھوتے اٹھ کر کیوں چلی آئی۔ اگر کہیں وہ خود آواز دے دے تو کیسے کڑک کر جواب دیتی۔ ''آپ دیکھتے نہیں میں کپڑے دھو رہی ہوں۔ ادھورے چھوڑ کر کیسے چلی آؤں؟— مردود اب کیسے چلی آئی۔ اور کم بخت نے بات بھی چھیڑی تو کیا، وہی رات والی بات۔

رات والی بات تو یوں ہی معمولی ہی سی تھی۔ لیکن رتنی کو پرماتما دے۔ صبح کتنی ہی مرتبہ اس بات کا ذکر کر چکی ہے۔ اٹھتے ہی پہلے گلی پار پڑوسن کو کھڑکی میں کھڑے ہو کر سارا واقعہ دہرایا گیا۔ پھر بھنگن آئی۔ اسے یہ بات سنائی گئی پھر نہ معلوم کس کس کو اور

اب ماں کو سنا رہی ہے۔
بات کیا تھی۔ رات کے دو بجے کے قریب اندر والے کمرے میں کچھ کھٹکا سا ہوا۔ قریب کی چارپائی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی بیوی نے اس کا کاندھا ہلا ہلا کر اسے جگا دیا۔ اور سرگوشی میں بولی۔ ''اندر کوئی آدمی گھس آیا ہے۔''
یہ سن کر وہ ڈر گیا۔ اس نے کان دھر کر سنا۔ واقعی کوئی شخص اندر گھس آیا تھا۔ دبی دبی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بیوی کے گہنے اور نقدی اسی کمرے میں رکھی تھی۔ اس کی اپنی چار پائی کمرے کے ایک کونے میں تھی اور اس کی بیوی کی چارپائی کمرے کے دروازے کے عین سامنے تھی۔ بیوی نے کہا کہ جب وہ آدمی اس کی چارپائی پر سے گذرا تو اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بے چارا حیران تھا کہ اب کیا کرے۔ ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ اس نے بیوی کو اپنی چارپائی پر بلا لیا۔ وہ اس کی رضائی میں آن گھسی۔ وہ بظاہر بیوی کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن خود بیوی سے بھی زیادہ سہا ہوا تھا۔ بیوی کو اپنے قریب پا کر اس کا حوصلہ کچھ استوار ہوا۔ اس نے پوچھا— '' ٹارچ کہاں ہے؟'' بیوی نے جواب دیا مجھے معلوم نہیں۔ شکر ہے اس وقت روشنی نہیں تھی ورنہ اس کی بیوی کہیں اس کی صورت دیکھ پاتی تو حیران رہ جاتا۔ ظاہر ہے اس قدر خوف کے مارے اس کا چہرا بری طرح اتر گیا ہوگا۔ اس کے ہاتھ تک کانپ رہے تھے۔ بھلا لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹارچ کیسے ملتی۔ ادھر آوازیں اور زیادہ مشکوک ہوتی جارہی تھیں۔ اس نے بیوی سے پوچھا کہ سوتے وقت دروازے کو تالا لگا دیا تھا؟ بیوی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اتنے میں ٹارچ بھی مل گئی۔ درحقیقت وہ اس قدر خوف زدہ ہو رہا تھا کہ ٹارچ تک روشن کرنے سے کتراتا تھا۔ وہ بیوی سے لپٹا ہوا تھا۔ بیوی نے کہا آخر آپ اس قدر ڈرتے کیوں ہیں۔ مجھ سے لپٹے جارہے ہیں۔ اس پر اس کی رگِ حمیت پھڑکی۔ بولا واہ! میں کیوں ڈرنے لگا میں تو تمہیں تسلی دینا چاہتا ہوں اور پھر اس نے ٹارچ ایک لمحہ کے لیے روشن کی اور پھر بجھا دی۔ آنکھ جھپکتے میں اسے معلوم ہوگیا کہ دروازہ کھلا ہے۔ اس کے معنی صاف تھے۔ یعنی چور تالہ توڑ کر اندر داخل ہوا تھا۔ اب تو اس کی گھگی بندھ گئی۔ اور بیوی سے بھی یہ بات چھپانے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ وہ سوچنے

لگا کہ کدھر جائیں کسے آواز دیں۔ ادھر اس کی بیوی نے اس کے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ٹارچ لے کر رضائی میں سے تھوڑا سا منہ باہر نکالا اور ٹارچ کو ایسے آگے بڑھایا جیسے وہ کوئی پستول ہو۔ اور پھر بٹن جو دبایا تو اندر والے کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ کیول کرشن کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا۔ کوئی شخص دکھائی نہ دیتا تھا۔ البتہ تڑاخ سے ایک آواز آئی۔ اب اس نے بھی گردن بڑھائی شاید چور دروازے کے پیچھے کھڑا ہو۔ لیکن آواز بڑے پلنگ کے نیچے سے آ رہی تھی۔ پھر بڑی احتیاط سے پلنگ کے نیچے روشنی ڈالی گئی۔ وہاں بھی کچھ نظر نہ آیا...... اور دوسرے لمحہ میں ایک موٹی تازی بلی منہ میں چوہا لیے لپک کر باہر نکلی...... توبہ توبہ ہرے رام ہرے رام...... بجلی روشن کی گئی۔ چور دور کا نشان تک نہ تھا۔ کمرے میں ہر چیز صحیح و سالم پڑی تھی لیکن کیول کرشن پسینے میں تر ہو گیا تھا۔

احتیاطاً اندر والے کمرے میں صندوق وغیرہ کھول کر سب چیزوں کی تسلی کر لی گئی اور پھر کیول کرشن نے شیر بن کر بیوی سے پوچھا۔ ''تم نے رات دروازہ بند نہیں کیا تھا نا!''

اب بیوی کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ یوں ہی لیٹے لیٹے دروازہ بند کرنے کے خیال ہی میں سو گئی تھی۔

بس یہ تھا اصل قصہ — اور بیوی اسے سناتی نہ تھکتی تھی۔ اور پھر اس دوران میں اس کی بزدلی کا ذکر بھی کر دیتی اور اسے اس بات پر غصہ آتا تھا اسے معلوم تھا کہ وہ ایک ڈرپوک شخص ہے۔ اس کے ملنے والے بھی اس حقیقت سے واقف تھے۔ آخر وہ تھا ہی کیا یک مشت بال دو پر اختلاج قلب کا مریض۔ نظر اس کی کمزور تھی۔ بھوک بھی کم لگتی تھی۔ ایک جان اور سو روگ والا معاملہ تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کے دل میں یہ خیال بیٹھ جائے کہ وہ بزدل ہے۔

رتی یہ قصہ کیا لے بیٹھی ۔ بس رامائن ہی چھیڑ دی اس نے اور پھر ماں تھی کہ

قدم قدم پر سوالات پوچھتی اور ہر سوال کے جواب میں خوب کھلکھلا کر ہنستی تھی۔

کیول کرشن دل ہی دل میں یہ بات بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اس طرح وہ فضا پیدا نہ ہو سکے گی جو وہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ پچھلے دو تین روز سے اس کا دماغ ابالے کھا رہا تھا۔ آج وہ ماں سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ دل کا غبار نکال دینا چاہتا تھا۔ وہ کسی کا بھی لحاظ کرنے کو تیار نہ تھا۔ جب اور سب لوگوں نے مل کر اس کو تباہ کرنے کی ٹھان لی تھی تو وہ کیوں نہ ان کے منہ پر یہ بات کہہ دے۔ لیکن اس کے لیے سنجیدہ فضا درکار تھی۔ اور یہاں قہقہوں پر قہقہے اڑ رہے تھے۔ بوڑھی ماں کو اصل راز کھلنے پر اس قدر زور کی ہنسی چھوٹی کہ بس پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئی۔

بات ختم ہوئی تو کیول کرشن نے خوب اچھی طرح ماتھے پر بل ڈال لیے۔ اور چہرہ خشمگیں بنا لیا۔ وہ دونوں ابھی تک ہنس رہی تھیں۔ لیکن یہ ان پر ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اسے ان کی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اور وہ اس وقت بہت سنجیدہ ہے۔ بالآخر اس کی بیوی نیچے غسل خانے میں چلی گئی۔

وہ ایک پرانی آرام کرسی پر سر پیچھے کر کے نیم دراز ہوگیا۔ اور پھر کھوئی نظروں سے چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ بچوں کا شور اور قہقہوں کی آوازیں اس کے کانوں سے دور ہوتی چلی گئیں۔ قہقہے کس قدر بے معنی اور حقیر ہوتے جا رہے تھے۔ زندگی اپنے پورے بوجھ اور فرسودگی کے ساتھ اپنی تلخ حقیقت کو اس کے ذہن پر واضح کیے جا رہی تھی۔ وہ عارضی ہلکی فرحت جو ان کی باتوں سے فضا میں پھیل چکی تھی اڑتے ہوئے کہرے کی طرح معدوم ہوتی جا رہی تھی۔ وہ بے کنار اداسیوں اور بے پایاں خاموشیوں میں اترتا چلا گیا۔ کوئی ایسا فلسفہ نہ تھا جسے سامنے رکھ کر وہ زندگی کے مسائل پر غور کر سکے۔ یا جو واقعات پیش آ چکے تھے۔ اور جس طرح سے زندگی گذر رہی تھی۔ اس سے بلند تر ہو کر یا اس سے علاحدہ ہو کر کچھ سوچ سکے یا سمجھ سکے کیوں کہ وہ تو جیسے گھمسان کی لڑائی کے میدان کے عین بیچ میں کھڑا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ اس کے ہاتھ میں دوسروں کو

مارنے یا خود کو بچانے کے لیے کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن اس حقیقت سے آنکھیں کیوں کر بند کی جاسکتی تھیں کہ وہ بھی مرتے کھپتے گرتے پڑتے لوگوں کے ہجوم میں شامل تھا۔ ماں اور بیوی کی ہنسی سے بلند تر شوران کی ہنسی کی آوازوں کو جیسے پاؤں تلے روندتا ہوا فضا پر چھا رہا تھا۔ یا ایک ابرِ سیاہ تھا کہ سارے آسمان کی وسعت پر محیط تھا۔

یہ سوچنا تو والدین کا کام ہے کہ جب ان کی اولاد جوانی کی عمر میں داخل ہو تو وہ اس کے رجحانِ طبع کے مطابق اس کے لیے کوئی رستہ تجویز کریں۔ لیکن اسے ایسا کوئی موقع نہ ملا۔ بس اس کی شادی کر دی گئی اور اس نے بھی فوراً بچے پیدا کرنے شروع کر دیئے۔ پھر اس نے زندگی کی ٹھوکریں کھانی شروع کیں۔ کئی پیشے اختیار کیے۔ جگہ جگہ گھوما اور بالآخر اپنے سب سے بڑے بھائی کی قیادت منظور کرلی۔ وہ کل چار بھائی تھے دو اس سے بڑے تھے اور ایک اس سے چھوٹا۔ سب سے بڑا بھائی جیون داس بڑا چلتا پرزہ تھا۔ اسے تجارتی لائن میں کافی تجربہ حاصل تھا۔ اس نے وسیع پیمانے پر فرنیچر کا کاروبار شروع کردیا تھا۔ اسے خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور چند ہی برس میں اس نے دکان اور شو روم کے لیے علاحدہ بلڈنگ اور دو مکان بھی کھڑے کر لیے۔ اور پھر اس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنے سب سے چھوٹے بھائی کے ساتھ شہر کے اندر دکان شروع کردے۔ چناں چہ انہوں نے دکان لے لی۔ اس میں کیول کرشن نے بڑی محنت سے کام کیا۔ اگر چہ اس کا چھوٹا بھائی اس کے ساتھ شامل تھا لیکن ابھی وہ نوجوان تھا اور کھلنڈری طبیعت کا مالک، اس کے کھانے کھیلنے کے دن تھے۔ چناں چہ سارا بوجھ کیول کرشن کے کندھوں پر تھا اور اس نے اسے خوب اچھی طرح نبھایا۔ پانچ چھ برس میں دکان خوب چمک اٹھی۔ اب ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔

اس کے بڑے بھائی ہی نے اسے دکان کھولنے کا مشورہ دیا اور اب جب دکان چل نکلی تو نہ معلوم کیوں وہ اس سے حسد کرنے لگا۔ کیول کرشن نے کئی مرتبہ اس بات کو محسوس کیا لیکن اس نے ہمیشہ اسے اپنا وہم سمجھ کر اپنے ذہن سے پرے ہٹا دیا۔ لیکن

ایک روز اسے یہ بات تسلیم کرنی ہی پڑی۔ شاید اس کا یہ سبب تھا کہ وہ بڑے بھائی سے اب مرعوب نہیں ہوتا تھا۔

چھوٹے بھائی کی منگنی ہوچکی تھی۔ ادھر وہ جوان ہوا تو ادھر لڑکی بھی شادی کے قابل ہوگئی۔ اس موقع پر لڑکی کے والد نے اعتراض کیا کہ ان دونوں بھائیوں کی اکٹھی دکان ہے یہ درست نہیں۔ کیوں کہ شادی کے بعد آپس میں جھگڑے پیدا ہونے کا خدشہ ہے۔ اس لیے انہیں علاحدہ ہوجانا چاہئے۔

لڑکی کے باپ کو مشورہ دینے والا اس کا اپنا بھائی تھا۔ جسے وہ اپنا کرم فرما سمجھتا تھا۔

یہ بات سن کر اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ پودا جسے اس نے اپنے جگر کے خون سے سینچ سینچ کر تناور درخت بنایا۔ اب اسی کے سایے میں بیٹھنے کا اسے کوئی حق نہ رہا تھا۔ اب اپنے ہی عزیز اسے ٹھوکریں مار مار کر وہاں سے نکال دینا چاہتے تھے۔ وہ خود بال بچے دار شخص تھا۔ آخر کامیابی کہیں پگڈنڈی پر گری پڑی تو مل نہیں جاتی۔ سالہا سال کی محنت کے بعد کہیں کاروبار کا سلسلہ استوار ہوتا ہے۔ آخر وہ اب اپنے اس بنے بنائے کام کو چھوڑ کر اور کون سا روزگار شروع کرے۔

اس نے بڑا واویلا کیا۔ خوب لے دے ہوئی۔ لڑکی کا باپ بھی سچا تھا کہ بجائے اس کے کہ مفت میں آئندہ جاکر جھگڑا ہو اس کا پہلے ہی سے سدِ باب ہوجانا بہتر تھا۔ شاید وہ اس باب میں نرم ہو ہی جاتا لیکن اس کو شہ دینے والے بھی اپنے ہی محترم بھائی صاحب تھے۔ جنہوں نے نہ صرف اسے الٹی پٹی پڑھائی بلکہ اب اعلانیہ اس کی طرف داری بھی کر رہے تھے۔ باقی رشتہ داروں میں بھی بڑے بھائی کا رسوخ تھا۔ زیادہ سے زیادہ ان میں کوئی ایک آدھ غیر جانب دار رہ گیا۔ باقی سب لوگ کیول کرشن پر زور دیتے رہے کہ وہ کچھ روپیہ لے کر دکان سے علاحدہ ہوجائے لیکن روپیہ کو لے کر چاٹے...... اس کی مستقل روزی تو ہاتھ سے گئی نا۔ اس نے بھری برادری میں بڑے بھائی

سے مخاطب ہو کر کہا کہ بے شک تو نے چھوٹے بھائی کی بھلائی تو سوچ لی۔ کچھ میری بابت بھی غور کیا۔ یا مجھے تباہ کر کے ہی تجھے خوشی حاصل ہوگی؟" اور تو اور خود اس کی ماں لگی سمجھانے " بٹیا! غور تو کرو چھوٹے بھائی کی شادی کا معاملہ ہے۔ تو پھر بھی بڑا ہے۔ اگر اس کے حق میں دکان چھوڑ دے تو سب لوگ تیری ہی تعریف کریں گے۔"

...... اس طرح سب نے گھیر گھار کر اسے دکان سے علاحدہ ہونے پر رضا مند کرلیا۔ وہ سب کچھ جانتا بوجھتا ہوا اس بات پر مجبور ہوگیا۔

دکان چھوڑ دینے پر اس کی زندگی کے تاریک دن شروع ہوگئے۔

اس نے ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے۔ جنگ کا زمانہ، نئی دکان کا ملنا ناممکن ہر شے یا تو نایاب یا حد سے زیادہ مہنگی۔ اس کے بعد ڈیڑھ برس سے جس طرح وہ زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ اس بات کا اندازہ کچھ اس کا دل ہی لگا سکتا تھا۔ بیوی بہت دکھی ہوتی تو رو دھو کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی۔ چھوٹا بھائی جس کے حق میں اس نے دکان چھوڑی تھی۔ بڑا شریف النفس نوجوان تھا۔ وہ حتی الامکان اس کی دل جوئی کرنے کی کوشش میں لگا رہتا۔ اس زمانے میں تنگ دستی کی انتہا ہوگئی۔

ایک ہی کام کا اسے تجربہ تھا۔ اس نے اپنے تنگ مکان کی ڈیوڑھی میں کاری گر لگا کر کام دھندا شروع تو کردیا لیکن با موقع دکان نہ ملنے کی وجہ سے اسے بہت سخت مصیبت کا سامنا تھا۔ جب شو روم ہی نہ ہو تو مال کہاں رکھے۔ ادھر اُدھر سے آرڈر لاتا اور مال سپلائی کرتا۔ بال بچے دار شخص تھا گھر والوں کی فکر علاحدہ کھائے جاتی تھی۔ دن کو آرام نہ رات کو چین، بس زندگی وبال تھی۔

ان سب پر طرہ یہ کہ بڑے بھائی کی اڑتی اڑاتی خبریں...... آج اس نے یہ کہا اور آج اس نے وہ بات کہی۔ اس کا بڑا بھائی اب بھی اس کی تذلیل کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ کیول کرشن کے دل میں بھائی کی طرف ایک نہیں بے شمار گھاؤ تھے۔ چند ماہ پہلے جب اس کا شیر خوار بچہ وفات پا گیا تو اسے شمشان بھومی تک لے

جانے پر کوئی تانگہ والا رضا مند نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بھائی کا تانگہ قریب کھڑا تھا۔ لیکن اس نے پھوٹے منہ سے ایک مرتبہ بھی یہ نہ کہا کہ چلیے اپنے تانگے پر ہی لے چلیں۔

ایک روز پہلے جب وہ بازار میں چھوٹے بھائی کی دکان پر گیا تو اس نے حسب معمول ادھر اُدھر کی باتیں بتائیں۔ منجملہ اور باتوں کے یہ بھی بتایا کہ صبح کے وقت بڑا بھائی آیا تھا یوں ہی بے سر پیر کی ہانکنے کے بعد اس نے اسے بہت سی نصیحتیں بھی کیں اور کہا کہ تم کیول کرشن سے زیادہ گھل مل کر نہ رہا کرو...... جو بات پوچھنی ہو مجھ سے دریافت کیا کرو۔ اگر میں نہ ہوتا تو تم دکان کے واحد مالک کبھی نہ بنتے وغیرہ۔

یہ بات سن کر کیول کرشن کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ نحیف جسم میں لگی جلدی بجھتی بھی نہیں۔ لیکن سلگتا ہے تو اپنا جسم کسی کا وہ کچھ بگاڑ ہی نہیں سکتا۔ تاہم دوسرے روز ماں آنے والی تھی اور وہ ایک مرتبہ اپنے اپنے دل کی بھڑاس نکال لینا چاہتا تھا۔

اس طرح جبکہ وہ خاموشی سے چھت کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی ماں اور بیوی کی ہنسی بھی ختم ہو چکی تو ماں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بیٹا! چھت کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ میں نے تمہیں کئی مرتبہ سمجھایا ہے کہ یوں چپ چاپ منہ اٹھائے آسمان کی طرف مت دیکھا کرو۔ یہ اچھا شگن نہیں ہوتا۔''

اس نے اس بات کا کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ اسے کوئی جواب سوجھا ہی نہیں ...... وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ بس ایک دم ہی برس پڑے۔

اس نے ماں کی بات سن کو یوں ہی بے اعتنائی سے اپنے کندھوں کو حرکت دے دی۔

ماں اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''ہائے رام کیسے خشک ہو گئے ہیں بال۔ تو صبح سے نہایا بھی نہیں کیا۔ نہا لیا کر...... ہے ہے تیرے سر میں سکری پڑی ہوئی ہے۔ یہ تو بہت بری معلوم ہوتی ہے۔

تو اندر باہر ننگے سر گھوما کرتا ہے۔ کوئی دیکھ لے تو کیا کہے۔ اب تو بال بچے دار آدمی ہے۔ اپنا کچھ تو خیال رکھا کر......"

"بس رہنے دیجئے ماں......" اس نے ذرا جھنجلا کر کہا۔

"رہنے کیا دے۔ دہی منگوا کر سر دھو ڈال۔ پھر لگا آنولے کا تیل اور دیکھ آنکھوں کو کیسی طراوت حاصل ہوتی ہے۔ ٹھہر تو دیکھوں کہیں کوئی جوں ووں نہ پڑ گئی ہو۔"

"بس رہنے بھی دیجئے ماں جی کہہ دیا نا! کوئی کام کی بات کیا کیجئے۔ لے کر بیٹھ گئیں میرے بالوں کو۔" اس نے جھلا کر ماں کا ہاتھ پرے دھکیل دیا۔

ماں ایسی جلدی خفا ہونے والی نہیں تھی۔ منہ میں زبان ادھر اُدھر گھما پھرا کر بولی......" تجھے میں نے منع کیا ہے کہ مت دیکھا کر اس طرح چھت کی طرف کیا رکھا ہے۔ ادھر...... یوں ہی بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ یہ اچھا شگن نہیں ہوتا۔"

اس نے غرا کر جواب دیا۔" تو مجھے کیا لینا شگن سے۔ میرے اچھے شگن تو ہو چکے بس۔"

"رام کا نام لے۔ کیسی باتیں کرتا ہے چھوکرا۔ آخر ہوا کیا ہے......"

"بہت ...... دیکھ لیا رام کا نام لے کر ہم نے اس موٹے بیل کو بھی تو کہو نہ کہ لے رام کا نام......"

"کون موٹا بیل۔"

"میں کیا جانوں۔"

"اے ہے...... کیوں بڑے بھائی کو کہہ دیا ہے بیل۔"

"ہاں اسی کو کہہ رہا ہوں تو پھر؟"

"رام تیری دہائی...... گھور کلجگ آ گیا ہے۔ وہ بیدوں میں لکھا ہے کہ بیٹا باپ پہ حکم کرے گا اور ماں پر جوتا چلائے گا۔ گوئیں گو کھائیں گی......"

اس پر کیول کرشن کو واقعی تاؤ آ گیا۔ "بڑی آئی ہیں بید بچارنے...... تو کیا بیدوں میں یہ نہیں لکھا کہ بڑے بھائی جو پتا سمان ہونے چاہئیں چھوٹوں کا حق کھا جائیں گے۔ ان کی بنی روز بگاڑیں گے۔ ان کو در بدر ٹھوکریں کھاتے دیکھ کر بغلیں بجائیں گے۔ان کو تباہ کر کے اپنے گھروں میں گھی کے دیئے جلائیں گے۔"

ماں نے ذرا ترش ہو کر جواب دیا۔ "چھوکرے تو تو ہوا سے لڑے ہے۔ آ کھر کس نے تیرے منہ سے نوالہ چھین لیا۔ تیرے ہاتھ سلامت رہیں اٹھا اور کھا۔"

کیول نے آنکھیں نکال کر کہا۔ آج تو آپ بڑے بیاکھیان دینے آئی ہیں۔ آپ ہی کہئے کہ آپ نے بس دوسروں ہی کو جنم دیا تھا۔ مجھے نہیں دیا تھا۔ میں آنکھوں میں کھٹکتا ہوں کیا دنیا بھر کے الزام مجھی پر تھوپ دے ہے۔ بس میں ہی ہوں سب کے دل کا بوجھ۔ مجھی سے تنگ آئے ہوئے ہیں سب لوگ میرے تو ہاتھ پاؤں چلتے بھی تم لوگوں کو اچھے نہیں لگے۔ اور ماؤں کا خون سفید ہوتے تو ہم نے کبھی دیکھا نہ سنا۔ لیکن وہی کلجگ والی بات ہے۔ گائے بے چاری تو پھر پشو ہے وہ تو گوکھا بھی لے تو کیا جب ماں ہی اپنے بیٹے کو بٹیا نہ سمجھے تو کوئی کیا کرے...... ہاں اب تو میں بچی بات کہنے سے کیوں چوکوں۔"

"ہے ہے رے کیول تجھے کسی نے کوئی لکڑی تو نہیں سنگھا دی کہیں۔ کیا بول رہا ہے۔ کچھ کھمر بھی ہے۔ آج تو ماں کو بھی چٹ پٹ باتیں سنائے جارہا ہے۔ ہاں ہاں اب تو میں تیری ماں بھی نہ رہی۔ تیرا گو مت اٹھایا اور آج تو ہی یہ باتیں کہنے لگا۔ کچھ ہوش کی دوا کر۔"

"کیا جانئے کس نے گو موت اٹھایا۔ آپ تھیں یا کوئی اور" کیول نے چیخ کر جواب دیا۔

"آج تو دماگ ٹھکانے نہیں تیرا۔ جو منہ میں آئے بکے جارہا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہی تو بک رہا ہوں۔ میں تجھے ماں کیسے سمجھ لوں...... تجھے مجھ سے

کچھ ہمدردی بھی ہے۔ دکان کا حصہ بتانے کو بھی آپ ہی بڑھ بڑھ کے باتیں بناتی رہیں۔ بڑے کی چکنی چپڑی باتوں میں تو آ گئیں فوراً بس میں ہی تھا ایک بری جن۔ جسے کوئی چھونا بھی پسند نہ کرے۔ ساری مصیبت میرے گلے سے منڈھ دی۔ میرے پلّے میں جو تھا وہ چھین لیا۔ میرا خیال کسی کو بھی نہ آیا۔ کیا میرے پیٹ نہیں تھا۔ میرے بال بچے نہیں تھے۔ چار بچوں کا باپ ہوں اس وقت گھر میں جورو بھی ہے۔ تو بتاؤ میری بنی بنائی روزی پر ڈاکہ ڈالنے سے آپ کو یا اوروں کو کیا مل گیا۔ ادھر میری حالت دن بدن خراب ہوتی جارہی ہے آپ ہی کی ماں تھیں تو میرا خیال بھی کیا ہوتا۔ مجھ سے بیر کیوں کمایا آپ نے۔ اور اب چلی تھیں وہاں سے ماں بن کر......"

"بیٹا تیرے سر پر تو بھتنا سوار ہے۔ تیری تو بدھی ہی بھرشٹ گئی ہے......"

کیول اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ پھر وہ کرشن جی کی اس تصویر کے قریب کھڑا ہوگیا۔ جس میں ننگی عورتیں چھاتیوں کو ہاتھوں سے چھپائے عجب پریشانی سے تالاب میں کھڑی تھیں اور کرشن جی شرارتاً ان کے کپڑے لے کر درخت پر چڑھ گئے تھے۔ تصویر کچھ ٹیڑھی ہوگئی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے درست کیا۔ اور پھر ماں کی بات سن کر سانپ کی طرح لہرا کر پلٹا اور منہ سے کف اڑاتے ہوئے بولا۔ "ہاں ہاں مجھی کے سر پر بھتنا سوار ہے۔ اور اس آدمی کی بدھی بھرشٹے گی کیوں نہیں جس کا سب کچھ اپنوں ہی نے لوٹ لیا ہو— اور ماں پھر آپ کہیں گی کہ میں زبان سنبھال کر نہیں بولتا۔ سچ ہے غریب کا کوئی بھی نہیں۔ دوست اور بھائی کیا ماں باپ تک اپنا ناطہ توڑ لیتے ہیں۔ تجھے بھی وہی بھلا لگتا ہے جس نے شہر میں مکان کھڑے کر لیے ہیں۔ خواہ اس نے یہ سب کچھ نہ صرف غیروں بلکہ اپنوں ہی کا گلا کاٹ کاٹ کر بنایا ہو۔ اگر آپ اس کی طرف دار نہ ہوتیں تو آپ اس کی ہاں میں ہاں کیوں ملاتیں۔ مجھے دکان سے بے دخل کر کے در در کی ٹھوکریں کیوں کھلاتیں......"

"ہے ہے کیول بیٹے دکان کسی غیر کے قبضے میں تو نہیں چلی گئی۔ وہ بھی تو تیرا

ہی چھوٹا بھائی ہے۔ وہ بے چارا دنیا کے اونچ نیچ کیا جانے۔ اگر اس کو بنا بنایا کام مل گیا تو بھی کیا ہرج ہے۔ تو تجربے کار ہے سمجھ دار ہے تیرے لیے کیا بات مشکل ہے۔ وہ بے چارا کل کا چھوکرا ٹھہرا......"

"ہاں تو چھوٹے بھائی سے مجھے کوئی شکایت نہیں آخر ہم دونوں ساتھ ساتھ کام کر ہی رہے تھے نا؟ کوئی میں سادھو مہاتما تو نہیں کہ بس سب کچھ تیاگ کر ایک طرف ہو بیٹھوں اور رام نام کی مالا جپنے لگوں۔ اگر مجھے بھکاری ہی بنانا تھا تو عورت میرے گلے کیوں منڈھی آپ نے۔ میری شادی کر کے ایسے الگ جا کھڑی ہوئی ہیں جیسے اب مجھ سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ اب مجھے پہچانتی بھی تو نہیں...... کیا میرے بچے نہیں ہیں۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ وہ کسی اچھے سے سکول میں پڑھیں یا بگھی کی سواری کریں اور اچھے اچھے کپڑے پہنیں...... ان کے بچے تو رہیں راج کماروں کی طرح اور میرے بچے چیتھڑے لٹکائے پھریں......"

ماں نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "نہ معلوم اسے کبھی کبھی کیا ہو جاتا ہے۔ بابا اب گڑے مردے اکھیڑنے سے کیا فائدہ؟ آپ ہی لکو بنو گے۔ اپنا ہی دل جلاؤ گے کسی کا کیا بگاڑ لو گے۔ ہوش کی دوا کرو۔ کیوں مفت میں اپنی جان ہلکان کیے ڈالتے ہو۔"

"میں مروں گا تو اس بدمعاش کی چھاتی پر چڑھ کر مروں گا۔ اور مر کر بھی اسے چین سے نہ رہنے دوں گا۔ بھوت بن کر اس کے پیچھے پڑ جاؤں گا۔ جب میری ہی بربادی ہوگئی تو پھر مجھے کسی اور کی تباہی کی کیا پروا۔ میں تو پرماتما سے یہی پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ پاجی کل کا مرتا آج ہی مرے......"

"چھوکرے کچھ پرماتما کا خوف کھا۔ زبان کو لگام دے۔ جو منہ میں آتا ہے سو بکے جاتا ہے......"

"تو کیا پرماتما بس ہمارے ڈرانے کے لیے رہ گیا ہے۔ تم لوگوں کو اس کا کچھ خوف نہیں۔ جب آپ کے چہیتے بیٹے نے میری بربادی کا سامان کیا تھا اس وقت ایشور

کا خوف نہ کھایا۔ اب مجھے ایشور سے ڈراتی ہیں۔ کیا جانوں پر ماتما ہے بھی یا یوں ہی ڈھکوسلا ہی ہے۔ جب لوگ ایسے ایسے گھور پاپ کر کے بھی بگھیوں پر سوار گھومتے پھرتے اور عیش اڑاتے ہیں تو بے چارا پرماتما کہاں رہ گیا۔ یا پھر افیون کھا کے پڑا ہوگا پینک میں۔ میرا تو جی چاہتا ہے۔ پھونک دوں اس گھر کو اور یہ سب الا بلا جلا ڈالوں۔ بیوی بچوں کو دھکیلوں کنوئیں میں اور خود سنکھیا کھا کر پڑ رہوں۔ میرے بنا دنیا میں کچھ کم تو نہ ہو جائے گا۔ میں جانتا ہوں ہمیں تو کوئی رونے والا بھی نہ ہوگا۔''

بڑھیا نے ہاتھ جھٹکا کر کہا۔'' مریں تیرے دشمن۔ اب تو بکنا بند کر دے۔ سر میں درد ہونے لگے گا۔ پھر بیٹھا رہے گا دن بھر سر پکڑے ہوئے— آ کھر جب ایک بات ہو ہی گئی تو سمجھ لے کہ جو نصیب میں تھا سو ہو گیا۔ اب اس طرح چلانے اور شور مچانے سے کیا گجرا دن واپس آجائے گا۔ بڑے بھائی کو تو تو پانی پی پی کر کوستا ہے۔ صبح شام دن رات سوتے جاگتے تجھے بس اور کوئی کام سوجھتا ہی نہیں۔ جو اِتنا دماغ کہیں اور کھرچ کرے تو اب تک نیا کام بھی چلا لیا ہوتا......''

''کام کیا خاک چلے گا میرا جب کہ وہ مجھے برباد کرنے کے بعد اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ نہ معلوم کون سے جنم کا بیر نکال رہا ہے کم بخت— نئے سورج نئی بات سنتا ہوں۔ میرے گاہکوں کو بہکاتا رہتا ہے۔ جہاں بیٹھتا ہے میری برائی کرتا ہے۔ مجھے بدنام کرنے کا کوئی موقع تو وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ رگڑ سے تو چندن میں بھی گرمی آجاتی ہے۔ میں تو پھر انسان ہوں۔ روز روز اپنی برائی سن کر کہاں تک برداشت ہو جب میں اس سے کچھ نہیں کہتا تو پھر اسے کیا حق ہے کہ خواہ مخواہ میرے کام میں ٹانگ اڑائے اور لوگوں میں مجھے بدنام کر کے میری ساکھ بگاڑے۔''

ماں چارپائی پر جا بیٹھی اور چھوٹے لڑکے کو گود میں لے کر کہنے لگی۔'' بیٹا لوگ تو آگ لگا کر تماشہ دیکھتے ہیں۔ سیانے آدمی باہر والوں کی باتوں پر دھیان نہیں دیا کرتے۔ اگر کوئی کچھ بکتا ہے تو بکنے دو تمہاری بلا سے۔ تم کسی کے گھر سے لے کر کھاتے ہو کیا؟''

اس بات پر کیول خشک پتے کی طرح جل اٹھا۔ ''ماں جی طرف داری کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں آخر کیا ہوگیا ہے آپ کو...... اچھا اب مراری کوئی غیر ہے۔ وہ بھی تو میرا چھوٹا بھائی ہی تو ہے۔ کل اس نے مراری کو کہا کہ جو بات پوچھنی ہو مجھ سے پوچھا کر کیول کی باتیں مت سنا کر...... میں نے ہی تجھے اس دکان کا مالک بنایا ہے، کیا اس قسم کی باتیں کرنا اس کے لیے مناسب ہے لیکن وہ تو ہے...... پاجی، کمینہ، چور، بدمعاش......''

کیول مارے غصے کے سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ اس کے دانت بھینچے ہوئے تھے۔ مٹھیاں کسی ہوئی پتلی پتلی کلائیوں کی نسیں ابھری ہوئی۔

ماں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''ہائے میں مرجاؤں تو نے اسے بدمعاش کہا۔ آ کھر تو بھی تو اسی باپ کا بیٹا ہے۔ پہلے بھی ایک دفعہ تو نے اسے گالیاں دیں۔

کیول کڑک کر بولا۔ ''ہاں کہا تھا میں نے۔ بدمعاش ہی ہوگا! میں میں...... اس نیل کو جان سے مار دوں گا چور کو گولی سے اڑا دوں گا......''

ماں کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اور کیول اپنی کرخت آواز کی گونج سے خود ہی لرز گیا...... اور پھر وہ دفعتاً رک گیا۔ اس کے سارے بدن میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اسے اپنی بے بضاعتی، لاچاری اور کھوکھلے پن کا شدید احساس ہوا۔ یہ بات اس پر اچھی طرح واضح ہوگئی تھی کہ جس جگہ وہ کھڑا تھا۔ وہاں اس کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ کوئی شخص اس کی ہاں میں ہاں ملانے کو تیار نہ تھا۔ اس کے برعکس اس کے بھائی کے سینکڑوں طرف دار تھے۔ تصور میں اس نے اپنے بھائی کو ایک بلند مقام پر سنہرے سنگھاسن پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہی موٹا بھدا گورا چٹا سرخ رنگ کا پلپلے جسم والا شخص جس کے لبوں پر طنز اور حقارت کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ جو اس کے بے معنی اور کھوکھلے غصے کی زد سے باہر بڑے محفوظ مقام پر بیٹھا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں کچھ ایسی بے اعتنائی تھی جیسے اسے وہ حقیر چیونٹی سے بھی کم تر دکھائی دے رہا

ہو...... کیول کرشن نے خود کو سچ مچ زمین پر رینگنے والے حقیر ترین کیڑے سے بھی کم تر پایا۔ اس کے اندر اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ اپنے دل میں بھی اس بات کی تردید کر سکے بلکہ یہ خیال اور زور پکڑتا گیا۔ اور اسے ڈوب جانے کا احساس ہونے لگا۔ جیسے گاڑھے کیچڑ میں دھنستا چلا جارہا ہو۔ پاؤں نکالنے کے لیے ٹھوس زمین کا کوئی ٹکڑا تک نہ دکھائی دیتا ہو۔ لمحہ بہ لمحہ وہ ڈوبتا جارہا ہو...... پھر وہ لڑکھڑا گیا...... ہوا میں اس طرح بازو ہلانے لگا جیسے کسی چیز کو پکڑنا چاہتا ہو...... اس کا سر چکر کھا گیا۔ اس نے بہ مشکل اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے اپنی دو دبلی پتلی کمزور بچیوں کی طرف دیکھا اور ہکلاتے ہوئے بولا ۔

''مجھے ان بچیوں کا خیال ہے۔ جب یہ بڑی ہوجائیں گی تو ان کی شادی کرنی ہوگی...... اگر ان کے نام اتنا روپیہ جمع کروا سکوں کہ بڑی ہو کر ان کی شادی ہوسکے تو میں ابھی جاکر اس سور کے پیٹ میں چھرا گھونپ دوں۔''

اس کے کانوں میں نامعلوم مقام سے قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جو لمحہ بہ لمحہ بلند ہوتے جارہے تھے۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ ''سنہرا دیس'' میں شامل ہے۔

سورما سنگھ

پچھلی گرمیوں میں جب میں تفریح کے لیے پہاڑ پر گیا تو وہاں لوگوں کا غیر معمولی رش پایا۔ کوئی ہوٹل، کوئی مکان یا دھرم شالہ خالی نہ تھی۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد کہیں گوردوارے میں جگہ ملی۔ ایک معمولی سا کمرا تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ۔ گوردوارے میں تین روز تک تو مفت رہنے کی اجازت تھی۔ اور اگر اس کے بعد کوئی شخص قیام کرنا چاہے تو پھر دکشنا لی جاتی تھی۔ جنگ سے پہلے تو چار آنے یومیہ بھی شکریے کے ساتھ قبول کر لیتے تھے۔ لیکن اب جو پوچھا تو دو روپیہ فی یوم کے حساب سے پیشگی دکشنا کا مطالبہ کیا گیا۔ کہنے کو تو دکشنا، لیکن زبردستی اور پیشگی۔ چوں کہ گھر سے پہاڑ پر ایک ڈیڑھ ماہ گذارنے کے خیال سے آیا تھا تو لوٹ کر کیسے جاتا۔ چناں چہ دکشنا ادا کردی گئی۔

اتنے یا اس سے زیادہ کرایہ پر اگر ہوٹل میں جگہ مل جاتی تو وہ اور بات تھی وہاں خدمت کے لیے نوکر اور دیگر سہولتیں بھی میسر ہوتی ہیں۔ لیکن اس وقت تو اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہ رہا۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ میرے ساتھ میرا چھوٹا بھائی بھی تھا۔

کمرے میں دو کھڑکیاں تھیں۔ ان کھڑکیوں کے سامنے ہم نے اپنی چارپائی بچھا

دی۔ ایک نوکر بھی مل گیا۔ باورچی خانے میں اکٹھے دو من کوئلے ڈلوا لیے۔ دو وقت کھانا بھی پکنے لگا۔ خالص گھی ہم اپنے ہمراہ ہی لیتے گئے تھے — میرا پروگرام یہ تھا کہ دن بھر تو چارپائی پر لیٹے لیٹے پڑھا کرتا۔ شام کو چار بجے کے قریب سیر کے لیے نکل جاتا۔ کچھ دیر سیر کرنے کے بعد کسی انگریزی سینما میں کوئی پکچر دیکھ لیتا۔ بس کم و بیش یہی میرا معمول تھا چھوٹے بھائی کو دو چیزوں کا بہت شوق تھا۔ گھوڑے کی سواری کرنے کا اور اسکیٹنگ کا۔ دن کا کچھ وقت پڑھنے میں گزارنے کے بعد وہ اسکیٹنگ یا گھوڑ سواری کے لیے چل کھڑا ہوتا۔ کبھی کبھی اگر دیکھنے کے قابل کوئی پکچر آتی تو ہم دونوں پکچر دیکھنے کے لیے چلے جاتے تھے۔ اس طرح سے ہماری زندگی گزر رہی تھی۔

چوں کہ میں دن بھر کمرے ہی میں رہتا تھا۔ اس لیے اگر کبھی پڑھتے پڑھتے تھک جاتا تو پہاڑوں کے مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے باہر نکل آتا۔ ہمارے کمرے کے آگے بڑھا ہوا چھوٹا سا چھجا بھی تھا۔ میں جنگلے پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہو جاتا اور ایک دوسرے کے پیچھے لپکنے والے بادلوں کا تماشا دیکھا کرتا۔ ہمارے کمرے کے ساتھ ہی ایک اور چھوٹا سا کمرا تھا۔ وہاں ایک لمبی داڑھی والا سکھ رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دو شخص اور بھی آن رہتے تھے۔ ہمارے کمرے کے آگے کافی بڑا برآمدہ تھا۔ چند کوٹھڑیاں بھی تھیں۔ اس برآمدے میں گوردوارے کا باورچی خانہ تھا۔

ہمارے کمرے سے اوپر والی منزل پر بھی متعدد کمرے بنے ہوئے تھے اور نیچے کی منزل پر بھی کمرے تھے یعنی ہمارا کمرا درمیانی منزل پر تھا۔

جب میں اپنے کمرے کے آگے چھجے پر کھڑا ہوتا تھا تو مجھے ادھر اُدھر کی باتیں سننے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ گورو کا لنگر (کچن) محض باورچی خانہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ اسے گوردوارے کا دار العوام کہہ لیجیے یا کلب گھر، بس دونوں کا کام دیتا تھا۔ غالباً اسی جگہ میں نے پہلے پہل دو تین مرتبہ سورما سنگھ کا نام سنا تھا۔

جس طرح مسلمانوں میں اندھے شخص کو حافظ جی کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے اور ہندوؤں میں سورداس جی کہہ کر اسی طرح سکھوں میں اسے سورما سنگھ کہتے ہیں۔

یوں تو سورما کے معنی بہادر کے ہوتے ہیں۔ اور بہادر شخص کی بابت انسان یہی

تصور کرسکتا ہے کہ وہ ایک مضبوط، طاقت ور اور با رعب شخص ہوگا۔ اسی طرح جسے سورما سنگھ نام کی وجہ تسمیہ نہ معلوم ہو تو وہ کسی گرانڈیل سکھ کا تصور ہی باندھے گا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ سورما سنگھ ایک چھوٹے سے قد اور اکہرے بدن کا شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے بہت گہرے گہرے داغ تھے۔ اس کی آنکھوں میں سفیدی ہی سفیدی تھی۔ پتلیاں تقریباً غائب تھیں۔ اس کا منہ ذرا سا کھلا رہتا تھا۔ اس کے بالوں کا بڑا سا جوڑا بھی اونٹ کے کوہان کی طرح پگڑی میں سے اٹھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ سر کے پیچھے گدی کے قریب کے بال اس سے سمٹتے نہیں تھے۔ اور اس کی پگڑی میں سے نکل الٹ کر گردن پر گرے رہتے تھے۔ وہ منہ اوپر کو اٹھائے ہوئے چلتا تھا۔ وہ غریب تھا، محتاج تھا، بے کار تھا اور شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ غیر شادی شدہ تھا۔

وہ کچھ عرصے سے مستقل طور پر گوردوارے میں رہتا تھا۔ اس کی رہائش کے لیے کوئی کوٹھڑی مخصوص تو نہ تھی۔ جہاں جگہ ملتی پڑ رہتا۔ کسی برآمدے میں یا اجازت ملنے پر کسی مسافر کے کمرے میں، یا پھر ہال کمرے میں۔ اسے دو وقت چائے اور کھانا لنگر سے مفت ملتا تھا، وہ دن بھر ہاتھ میں ایک ٹیڑھی ترچھی لکڑی لیے گھوما کرتا۔ میں نے اسے بازاروں میں آتے جاتے بھی دیکھا تھا۔ پہاڑوں پر سائیکلیں، موٹریں، تانگے تو خیر ہوتے ہی نہیں۔ پھر بھی گھوڑوں، رکشاؤں اور پیدل چلنے والوں ہی کی کافی بھیڑ ہوتی ہے۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے پروا بڑی تیزی سے چلتا تھا۔ جیسے وہ سب پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ وہ نابینا نہیں ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دور سے اسے چلتا دیکھیے تو کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آتی تھی — اس طرح وہ تین چار مرتبہ خطرناک حادثوں سے بال بال بچ چکا تھا۔ لوگ اسے منع بھی کرتے تھے لیکن جواب میں اس کے ہونٹوں کے گوشوں کی لکیریں اور بھی زیادہ گہری ہوجاتی تھیں۔

ایک روز شام کے وقت سارا دن پڑھنے کے بعد میں تھکا ماندہ سیر کرنے کی غرض سے باہر نکلا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ بارش نے آن لیا۔ میرے پاس چھتری

موجود تھی۔ لیکن بارش کی بوچھاڑ اس قدر تیز تھی کہ میں نے اور آگے بڑھنا مناسب نہ سمجھا۔ چناں چہ لوٹ آیا جب کمرے کے قریب پہنچا تو دیکھا سورما سنگھ میرے دروازے کے آگے والے جنگلے کے قریب کھڑا ہے۔

اس روز ہم دونوں کی آپس میں پہلی دفعہ گفتگو ہوئی۔ سورما سنگھ میرے پڑوسی سردار صاحب کی آمد کا منتظر تھا۔ چوں کہ اس وقت میں بھی تنہا تھا اور سورما سنگھ بھی وہاں کھڑا بارش کی آڑی بوچھاڑ سے بچ نہ سکتا تھا اس لیے میں نے اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ ''باگورو باگورو'' کرتا اندر آیا اور چوں کہ میں نے اسے ذرا احترام کے ساتھ بلایا تھا اس لیے اس نے بھی مجھے ''چند پند سود مند'' سے نوازنا لازمی سمجھا اور پھر اس کے بعد کیف اور وجدان کی مبہم باتیں ہونے لگیں۔ زندگی کی ناپائیداری آتما کی لافانیت، کرموں کے پھل پر اس نے چھوٹا سا لیکچر دیا۔ میں نے بڑے تحمل کے ساتھ سنا کبیر کے دوہوں اور گورو تیغ بہادر کے اشلوکوں کے بعد اس نے ایک شعر گویا کا بھی پڑھا...... اور پھر بلھے شاہ کی تصوف سے لبریز کافیوں پر اتر آیا۔ باہر سے آنے والی بارش کے تراڑوں کی آواز میں اس کی درد بھری صدا بلند ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی آواز میں ایک خاص کرارہ پن اور کسک سی تھی۔ بلھے شاہ کی کافیاں سن کر ایک مرتبہ تو مجھ جیسے مادہ پرست شخص پر بھی وجد سا طاری ہوگیا۔ اس وقت میں سوچنے لگا کہ زندگی کی اقدار زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے خواہ بدل کر کچھ سے کچھ ہوجائیں۔ لیکن وجدان کے ایک لمحہ کی لذت سے کیوں کر انکار کیا جاسکتا ہے۔ یہ گم شدگی کی کیفیت سچ مچ حقیقی معلوم ہونے لگی۔ تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ اس طرح سورما سنگھ کی دردناک لے نے ایسا سماں باندھ دیا کہ ایک مرتبہ تو میں بھی مارکسی راہ مستقیم سے بھٹک گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں دیر تک اس بات پر غور کرتا رہا کہ روحانیت مشرق کی گھٹی میں پڑ چکی ہے آب و ہوا کا اثر کہیے یا اسے ایشیا والوں کے مخصوص مزاج سے تعبیر کیجئے بہرحال دنیا بھر کے سب سے بڑے بڑے نبی اور روحانی رہبر ایشیا نے پیدا کیے اور اس کی تھوڑی سی

جھنک مغرب نے بھی دیکھی لیکن انہوں نے اسے یکسر خلاف مزاج پا کر اسے جھنک کر پرے پھینک دیا۔ اس طرح بہت دیر تک میرا ذہن فلسفیانہ قلا بازیاں کھاتا رہا۔

میرے ساتھ والے کمرے میں جو لمبی داڑھی والے سکھ رہتے تھے۔ وہ خالص پنجابی نہیں تھے۔ ان کا باپ پنجابی تھا اور ماں یو پی کی عورت تھی۔ عین ممکن ہے کہ سائنس کا کوئی ماہر اس کے سر کی بناوٹ اور ناک کی اونچان یا پھیلاؤ سے بتا سکے کہ وہ خالص پنجابی نسل سے نہیں تھا۔ لیکن بظاہر اس میں اور دیگر سکھوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی داڑھی بہت لمبی تھی۔ یعنی تقریباً ناف تک پہنچتی تھی۔ ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ اس لیے داڑھی میں سفید بالوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ چوڑی پیشانی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن کے نیچے تھیلے لٹکتے دکھائی دے رہے تھے۔ موٹے موٹے ہونٹ بڑا سا پیٹ۔ سر پر ڈھیلی ڈھالی بے ڈھب پگڑی۔ گلے میں شیروانی نما عجب بے ڈھنگا کوٹ ان کے حالات سے مجھے زیادہ واقفیت تو حاصل نہیں تھی، بس اس قدر جانتا تھا کہ وہ دن بھر گھوم پھر کر مختلف امراض کی دوائیاں بیچتے تھے۔ اچھے پیسے کماتے تھے اور رات، کو بلا ناغہ شراب پیتے تھے۔ اور اگر کسی روز بہت بڑی رقم ہاتھ لگ جاتی تو پھر گوردوارے میں کڑاہ پرشاد (حلوہ) کرواتے اور اڑوس پڑوس کے لوگوں میں مٹھائی بانٹتے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں گوردوارے کا لنگر خانہ ایک قسم کا کلب گھر بھی تھا۔ بے خانماں غریب لوگوں کو دو تین روز تک کھانا بھی ملتا تھا۔ اس لیے سورما سنگھ کے علاوہ ہر روز نت نئی صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے سوسائٹی میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ہر مذہب اور ہر قوم کے ان لوگوں میں صرف ایک بات مشترک تھی وہ یہ کہ وہ سب کے سب بھوکے تھے۔

لنگر کا کل انتظام دو نہنگ سنگھوں کے سپرد تھا۔ نہنگ بمعنی مگر مچھ۔ یوں تو سکھ جنگجو قوم ہے، لیکن نہنگ وہ سکھ ہوتے ہیں جو سر پر کفن باندھے پھرتے ہیں۔ وہ عموماً گرہستی کے جھنجٹ میں بھی نہیں پھنستے۔ ضرورت سے زیادہ کوئی شے اپنے پاس نہیں

رکھتے، ہتھیار بند رہتے ہیں اور ہر دم تیار بر تیار۔ عام طور پر نیلے رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں۔ سر پر لمبوتری پگڑی جس میں کرشن جی کے سدرشن چکر کی طرح لوہے کے چکر پھنسے ہوتے ہیں۔ گلے میں لوہے کے منکوں کی مالا، یہ موٹے موٹے لوہے کے کڑے، تلواریں، نیزے و دیگر ہتھیاروں سے لدے پھندے رہتے تھے۔ چناں چہ گوردوارے کے لنگر خانے میں بھی اسی قسم کے دو نہنگ سنگھ تھے وہ نوجوان تھے اور خوب موٹے تازے اور تانبے کی طرح سرخ تھے۔ میں ان کی پنڈلیوں کے پھیلاؤ اور کلائیوں کی چوڑائی پر رشک کیا کرتا تھا۔

وہ لوگ تقریباً سارا سارا دن لنگر خانے میں بیٹھے رہتے تھے۔ انہیں کھانے پکانے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ شام کے وقت لنگر خانے کی رونق بڑھ جاتی تھی۔ سورما سنگھ سر شام ہی بھٹی سے کچھ دور ایک چوکور تختے پر بیٹھ جاتا۔ اگر چہ اس کی کوئی شنوائی نہ تھی۔ لیکن وہ انہیں ہدائتیں کرنے سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ دال میں نمک کی اسے ہمیشہ ہی بہت سخت شکایت رہتی تھی۔ دونوں نہنگ سنگھ اس سے چڑتے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان لوگوں کو کھانا پکانے میں کوئی مہارت حاصل نہ تھی۔ وہ لوگ پہاڑوں کے راستے سے ہیم کنڈ جارہے تھے۔ ہیم کنڈ وہ مقام تھا جہاں گورو گوبند سنگھ جی نے پچھلے جنم میں تپسیا کی تھی۔ لیکن گوردوارے والوں نے انہیں اس جگہ روک لیا۔ صحیح طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ وہ لوگ واقعی ہیم کنڈ جارہے تھے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب وہ اگر ذرا بھی بگڑتے تو بس فوراً ہیم کنڈ چلے جانے کی دھمکی دیتے چوں کہ گوردوارے والوں کے پاس اس وقت اور کوئی آدمی تھا نہیں اس لیے ان کے مطالبات مان لیے جاتے تھے۔

اس لحاظ سے دونوں نہنگ واقعی بڑے لاڈلے تھے لیکن سورما سنگھ انہیں ٹوکنے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اس پر وہ طیش میں آکر کہتے ۔"ابے یہاں تیری لگائی بیٹھی ہے روٹی پکانے کو۔"

اس پر کئی آدمیوں کے دانت نکل آتے۔ ادھر اُدھر پتھریلی زمین پر بیٹھے ہوئے

غریب لوگ بڑی دیگ پر نگاہیں جمائے نہنگ سنگھوں کی ہر بات پر اظہارِ خوشنودی کرتے۔ اور پھر ادھر اُدھر منڈلانے والے کتوں کو دھتکارنے لگتے۔

نہنگ سنگھوں کی زبان سے لگائی کا طعنہ سن کر سورما سنگھ کے چہرے پر دفعتاً روحانیت کا نور جھلکنے لگتا، کہتا، کہتا۔" میں کسی عورت سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتا......"

" ہو ہو۔" ایک نہنگ مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہتا۔" تو بات کرنا پسند نہیں کرتا یا عورتیں تجھ سے بات کرنا پسند نہیں کرتیں......"

وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بات سن کر عموماً اس کے کان سرخ ہو جایا کرتے تھے۔ اور وہ بڑی بے اعتنائی سے ہاتھ کی مٹھی پر رخسار رکھ کر منہ پھیر لیتا۔ اور نہنگ سنگھ بھی بس کتھا ہی چھیڑ دیتا۔ حاضرین سے مخاطب ہو کر کہتا۔" اجی سورما سنگھ اس معاملے میں بڑا گھاگ ہے۔ اگر میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو دیر سویر آکر چپکے سے دیکھو کہ بھلا سورما سنگھ کیا کر رہے ہیں۔ اب یہاں صحن میں عورتیں دھوپ کھانے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں۔ تو یہ بھی سنک کر ان کے قریب جا بیٹھتا ہے اسے عورتوں کی باتیں سننے کا بڑا شوق ہے۔ کیوں سورما سنگھ آخر تجھے عورتوں کی باتوں میں کیا لطف آتا ہے...... صحن کے پرلے کونے کی طرف سورما سنگھ مہاراج کی خاص نگاہ رہتی ہے۔ وہاں عورتیں کپڑے وپڑے دھونے کے لیے بیٹھی ہوتی ہیں۔ ایسے موقع پر وہ آدھی ننگی ہی ہوتی ہیں تو بس یہ بھی ان کے قریب منڈلاتے رہتے ہیں۔ کبھی کسی سے چھو جاتے ہیں کبھی کسی پر گر پڑتے ہیں۔ دھنیہ ہو مہاراج دھنیہ ہو!!"

یہ کہہ کر وہ دونوں ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمسکار کرنے لگتے۔ دوسرا نہنگ سنگھ کہتا......

" جی پرسوں ہی کی بات تو ہے۔ وہ سجن سنگھ کے گھر سے ہے نا بھئی۔ وہ خوب موٹی تازی طرح دار عورت ہے۔ وہ بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ ہمارے سورما وہاں نل سے پانی لینے کے بہانے سے گئے اور جان بوجھ کر پھسلے اور عین عورت پر کچھ بے ڈھب طریقے سے گرے کہ بس اٹھنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ وہ عورت بھی ایک ہی لڑاکا ہے۔

اس نے سردار سورما سنگھ کی پگڑی اتار کر جوڑا پکڑ لیا اور کھینچتی غسل خانے سے باہر لے آئی اور ان کی چند یا پر تین چار سلیپر جو دیئے تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ اتنے میں عورت کا خصم بھی پہنچ گیا۔ وہ ٹھہرا خونی آدمی۔ وہ تو انہیں پر لوک کا سیدھا ٹکٹ لے دیتا لیکن لوگوں نے بیچ بچاؤ کر دیا...... پچ پچ سورما سنگھ بھئی ذرا پگڑی تو اتار دیکھیں کتنے بال باقی بچے ہیں......''

اس پر فلک شگاف قہقہے بلند ہوتے۔ اور سورما سنگھ بری طرح کھسیا جاتا۔ اس کا چہرہ سرخ سے سرخ تر ہو جاتا۔

حاضرین میں سے کوئی مسکین آواز میں کہتا۔'' جی آنکھوں سے اندھا ہے اسے کچھ دکھائی تو دیتا نہیں عورت اس کے سامنے الف ننگی بھی کھڑی ہو جائے تو کیا......؟''

یہ بات کہنے سے مقصد سورما سنگھ کی طرف داری نہیں بلکہ نہنگ سنگھوں کو گرمانا ہوتا تھا۔ چناں چہ وہ بڑے راز دارانہ لہجے میں کہتے۔'' ابی نہیں۔ یہ آواز ہی آواز میں سارا مزا لے جاتے ہیں...... یہ عورت کی آواز سے اس کی صورت اس کے جوبن کے ابھار وغیرہ سب چیزوں کا اندازہ لگا لیتے ہیں......''

اس طرح نہنگ سنگھ اس کی خوب مٹی پلید کرتے تھے اور وہ بھی جہاں تک ہو سکتا ان کے خلاف زہر اگلتا تھا۔ چناں چہ ایک رات گیارہ بجے کے قریب دفعتاً مجھے ایک مہیب چیخ کی آواز آئی میں سویا ہوا تھا۔ یکا یک آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد پھر ذبح ہوتے ہوئے جانور کی سی آواز فضا کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ میں فوراً اٹھا......'' لوگو بچاؤ...... میں مر گیا...... مجھے مار ڈالا......''

میں نے ٹارچ ہاتھ میں لی۔ ایک نہنگ نیچے کے کمرے میں سے جھپٹ کر باہر نکلا اور پھر چشم زدن میں تاریکی میں غائب ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

رات کی خاموشی میں چیخوں کی آواز سن کر اور بھی کئی لوگ جمع ہو گئے — کمرے کے اندر سے سورما سنگھ کو باہر نکالا گیا۔ اور پھر اسے اوپر بجلی کی روشنی میں لے

آئے۔ اگرچہ اس کے لیے ہر طرف تاریکی تھی۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔ اسے اب بھی اس بات کا خوف تھا کہ کوئی اسے مار نہ ڈالے۔ اس پر سوالات کی بوچھاڑ ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ رات کی تاریکی میں ایک نہنگ سنگھ نے اسے کمرے میں جا دبوچا اور اس کا ٹینٹوا دبا کر اسے جان سے مار ڈالنے کی کوشش کی۔ اس پر نہنگ سنگھ کو بلایا گیا۔ اب تک کوٹھڑی میں چھپے رہنے ہی سے ثابت تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔ نہنگ سنگھ نے کہا وہ اسے روٹی دینے گیا تھا۔ اس پر کسی نے کہا صاحب یہ سورما سنگھ واقعی انہیں بہت تنگ کرتا ہے بے چارے سارا سارا دن گوردوارے کی سیوا کریں اور پھر اس لاٹ صاحب کے بچے کو کمرے میں کھانا پہنچا کر آئیں۔ اس پر سورما سنگھ نے کہا کہ لنگر خانے میں وہ سب لوگ مل کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں اور نہنگ اسے ہمیشہ بہت تنگ کرتے ہیں۔ کبھی اس کی دال میں پیشاب کر دیتے ہیں اور کبھی روٹیاں جلا پھونک کر اس کے منہ پر دے مارتے ہیں۔ اب جو نہنگ سنگھ مجھے روٹی دینے کے لیے گیا تو کہنے لگا۔ ''ابے حرام زادے حرام خور......''

بہت دیر تک ہنگامہ برپا رہا۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ گرم گرم باتوں کے بعد اب صلح کی باتیں ہونے لگیں۔ سورما سنگھ خوب گلا پھاڑ پھاڑ بلند آواز میں نہنگ سنگھوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ آخر گیانی جی نے اسے منع کیا کہنے لگے کہ اس طرح بہت چیخنے سے گلا بیٹھ جائے گا اور پھر دوسرے روز گوردوارے میں وہ شبد نہ گا سکے گا۔

آخر معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

رات کے وقت آٹھ بجے کے قریب ہم سینما دیکھ کر آرہے تھے راستے میں چھوٹا بھائی تو سکیٹنگ ہال کی طرف چلا گیا اور میں قدم بہ قدم سیر کرتا، اور پہاڑوں کے اتار چڑھاؤ پر ٹمٹماتی ہوئی بتیوں کا تماشہ دیکھتا ہوا نو بجے کے قریب کمرے میں پہنچا۔

دور ہی سے کچھ غیر معمولی شور سنائی دینے لگا تھا۔ قریب پہنچ کر معلوم ہوا کہ آج پڑوس کے سردار جی کے ہاں جشن ہو رہا ہے۔

اپنے کمرے میں آکر کپڑے بدلے اور تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ خیال تھا کہ

جو ناول شروع کر رکھا تھا آج اس کا باقی حصہ بھی پڑھ کر ختم کر ڈالوں گا۔

لیکن بہت جلد ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ آج کچھ پڑھنا ناممکن ہے۔ پڑوس میں ایسی دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی اور مختلف لوگوں کی بے ڈھنگی ملی جلی آوازوں کے شور میں یکسوئی ناممکن تھی۔ کتاب سینے پر دھرے میں ذہنی کش مکش میں مبتلا آنکھیں جھپک رہا تھا کہ میرے دروازے پر دھڑاک دھڑاک دستک کی آواز آئی۔

اٹھا، دروازہ کھولا، دیکھا کہ لمبی داڑھی والے سردار جی ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لیے کھڑے ہیں انہوں نے بتایا کہ آج انہوں نے مٹھائی تقسیم کی تھی۔ یہ میرا حصہ تھا میں نے شکریہ ادا کیا۔ اور پھر یوں ہی بات چیت کرتا ہوا آگے بڑھا۔ ان کے دروازے میں جھانک کر دیکھا تو دونوں نہنگ سنگھ، نیز دو تین اور اشخاص کے علاوہ وہاں سورما سنگھ بھی براجمان تھے..... آج سب نے پی رکھی تھی۔ صراحی جھوم رہی تھی اور پیمانہ وجد میں آیا ہوا تھا۔

لمبی داڑھی والے سردار صاحب نے داڑھی لہلہاتے ہوئے مجھے محفل میں شمولیت کی دعوت دی۔ لیکن میں نے تماشائی بنا رہنا پسند کیا۔

اس وقت کے سورما سنگھ اور روز مرہ کے سورما سنگھ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ پگڑی سر سے اتر کر اس کی ٹانگوں میں الجھی ہوئی تھی۔ داڑھی کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر کے بال کھل کر شانوں پر آن گرے تھے۔ ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ بیٹھا سانڈ کی طرح ڈکار رہا تھا۔ ہوا میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ اس کی بے نور آنکھوں کے سامنے آج پریاں ناچ رہی تھیں۔ سب لوگ اس کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھے تھے اور درمیان میں بیٹھے ہوئے سورما سنگھ نے لہک کر دفعتاً سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔'' ہائے مار گئی.....''

دوسروں نے پوچھا۔'' سچے پادشاہو! کون مار گئی۔''

لیکن سورما سنگھ ہر سوال کے جواب میں حال میں آئے ہوئے بدمست شخص کی

طرح جواب دیتا۔ ''ہائے مار گئی......''

نہنگ سکھوں نے از راہ مذاق ان کی کھوپڑی پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دیتے ہوئے کہا۔ ''اجی سورما سنگھ واہگورو نام کا جاپ کیجئے...... بلھے شاہ کی کافیاں سنایئے......''

پھر بڑی رقت انگیز آواز میں وہ بلھے شاہ کی تصوف سے لبریز کافیاں سنانے لگا...... اس کی آواز میں سوز نہ معلوم کس طرح پیدا ہو جاتا تھا۔ آواز میں درد اور لہجے میں افتادگی ایسی کہ اس تاریک اور غلیظ کمرے میں بیٹھے ہوئے بدمست شرابی سر دھننے لگے— اور پھر گاتے گاتے سورما سنگھ کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

چراغ کی لو ٹمٹما رہی تھی۔

رم جھم رم جھم مینہ برسنے کے بعد بارش رک گئی۔ لیکن ابھی بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا بوجھل تھی۔ دو بجے کا وقت تھا۔ اخبار ایک تو یوں ہی دیر سے آتا تھا۔ دوسرے اس روز مسلسل بارش کی وجہ سے اور بھی دیر سے ملا۔ میں جلدی جلدی سرخیوں پر نظر دوڑا رہا تھا کہ مختلف آوازوں سے ایک مرتبہ پھر گوردوارے کی فضا میں ہلچل پیدا ہو گئی۔

گرم چادر لپیٹتے ہوئے کمرے میں سے باہر نکلا تو عین ہمارے کمرے کے نیچے وادیلا مچا ہوا تھا۔ نیچے اُترا معلوم ہوا وہی سورما سنگھ کے سلسلے میں کوئی جھگڑا ہو رہا تھا۔ گیانی جی بھی کھڑے تھے۔

معلوم ہوا کہ اس کمرے میں دو تین روز سے چند مسافر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ایک شادی شدہ نوجوان عورت تھی، ایک اس کا بڑا بھائی اور ایک چھوٹی سی بہن اور والدین۔ گوردوارے کے باقی کمرے رُکے ہوئے تھے۔ اس لیے اس چھوٹے سے کنبے نے سورما سنگھ کو اپنے کمرے کے اندر گوشے میں بنی ہوئی چھوٹی سی کوٹھری میں رہنے کی اجازت دے دی تھی۔ انہوں نے اس پر رحم کھایا اور اس نے ......

جب میں وہاں پہنچا تو اس وقت کا منظر یہ تھا کہ نوجوان عورت کا باپ تو گھر پر

نہ تھا۔ باقی لوگ بڑبڑا رہے تھے اور بڑا بھائی سورما سنگھ کو چپت لگا رہا تھا۔

اصل واقعہ یوں پیش آیا کہ عام طور پر سورما سنگھ اپنی کوٹھری میں پڑی ہوئی چار پائی پر بیٹھا رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات کوئی نہ کوئی قابلِ اعتراض حرکت کر دیتا۔

اس روز جبکہ عورت کا بھائی بھی بازار گیا ہوا تھا، ماں باورچی خانے میں تھی تو سورما سنگھ نے عورت سے دریافت کیا۔ ''اجی بھلا آپ کی اس وقت عمر کیا ہوگی۔''

اسی بات پر جھگڑا ہوا۔ بھائی بازار سے آیا۔ یہ بات سنی تو سورما سنگھ کے منہ پر طمانچہ مارنے لگا۔ میرے سامنے بھی اس نے دو تین چپت رسید کیے۔

سورما سنگھ کی پگڑی اتر کر اس کے گلے کا ہار ہو رہی تھی۔ گال مارے طمانچوں کے دہک رہے تھے۔ اور مسوڑھوں میں سے خون نکل آیا تھا۔

...... اور وہ عورت! ...... وہ عورت کیا تھی۔ گلاب جامن تھی۔ خوب موٹی تازی صحت ور، گندم گوں رنگ، گول چہرے کے نقوش عام سہی لیکن مدھ بھری آنکھیں سنی تو تھیں لیکن دیکھنے کا اتفاق اسی دن ہوا...... اور جب اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو اس کی آواز کے ترنم سے کمرہ گونج اٹھا۔ میں نے ایک لمحہ کے لیے آنکھیں موند کر اس کی آواز کو سنا...... واقعی ایسی دل کش آواز والی عورت کی عمر جاننے کا کسے اشتیاق نہ ہوگا۔

عورت کی ماں نے چلّا کر کہا۔ ''کلموہے، مشٹنڈے، تجھے شرم نہ آئی۔ ہم نے سورما سنگھ سمجھ کر تجھ پر رحم کھایا اور رہنے کی اجازت دی......''

اس بات پر عورت کے بھائی نے ایک اور چپت رسید کی۔

پلنگ پر بیٹھی ہوئی نوجوان عورت بازو اٹھا کر اپنے رنگ دار جوڑے کو انگلیوں سے گھما پھرا کر درست کرنے لگی۔

سورما سنگھ مار کھانے میں بہت ماہر تھا۔ اس نے رقت انگیز آواز میں کہا۔ ''ماتا جی...... میں نے یوں ہی پوچھا تھا......''

ماتا جی نے چمک کر کہا۔ ''نگوڑے اب باتیں بناتا ہے۔ اگر سردار جی یہاں

ہوتے تو تیری کھال کھینچ دیتے.....''

اس پر سورما سنگھ اچک کر نوجوان عورت کے قریب جا پہنچا۔ اور ٹٹول کر اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیے اور اپنی پیشانی ان پر رکھ دی۔

نوجوان عورت کے بھائی نے اسے جوڑے سے پکڑ کر پرے دھکیل دیا۔ وہ سب لوگ مارے غضب کے لال پیلے ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نوجوان عورت جو نئی شادی شدہ دکھائی دیتی تھی۔ بالکل مطمئن بیٹھی تھی۔ اس کے انداز سے عجب بے اعتنائی ٹپکتی تھی۔ نہ وہ خفا تھی نہ خوش۔ اس دوران میں، بڑے ٹھسّے سے پلنگ سے پاؤں نیچے لٹکائے بیٹھی رہی۔

گیانی جی کو بہت کم غصہ آیا کرتا تھا۔ وہ عجب ڈھیلے ڈھالے سرد مزاج اور ملائی قسم کے شخص تھے۔ لیکن عورت کے پاؤں چھونے پر انہیں بھی جیسے کوئی چبھن سی محسوس ہوئی ہو۔ ''سور، پاجی، کمینے..... ایں؟''

رفتہ رفتہ گالیاں دے دے کر اور مار مار کر سب لوگ تھک سے گئے آخر میں ایک مرتبہ پھر سورما سنگھ نے عورت کے پاؤں پکڑ لیے۔ انہیں بڑی نرمی سے سہلاتے ہوئے اپنا گرم گرم رخسار اس پر رکھ دیا۔

اس وقت وہ ایک پالتو جانور کی طرح دکھائی دیتا تھا — اس نے بلھے شاہ کی کافیوں کی سی رقت انگیز آواز میں چند مبہم الفاظ کہے۔ عورتیں رحم دل ہوتی ہیں..... چناں چہ جب اس کا بھائی ایک مرتبہ پھر سورما سنگھ کی طرف جھپٹا تو وہ بولی۔ ''رہنے دیجئے بھائی صاحب! اور مت ماریئے..... بچارا سورما سنگھ ہے۔''

اس کے بعد نوجوان عورت نے بلا پاؤں پیچھے ہٹاتے ہوئے شیریں آواز اور خالص پنجابی لہجے میں کہا۔ ''ہٹ دے، پرے ہٹ''

یہ افسانہ افسانوی مجموعے 'سنہرا دیش' میں شامل ہے۔

عذاب

جب ایک بہت بڑا ٹرک تیز رفتار سے ان کے قریب سے گذرا تو نہ صرف ان کی سائیکلوں کے ہینڈل لڑکھڑا گئے اور وہ ایک دوسرے سے پرے چلے گئے بلکہ اتنی زیادہ گرد اٹھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

پربھ دیال مضبوط اور دہرے بدن کا نوجوان تھا۔ اس نے سائیکل سنبھالنے کی کوشش کی لیکن اسے ایک مرتبہ تو نیچے اترنا ہی پڑا۔ شاید سنبھلنے میں اسے اتنی دقت محسوس نہ ہوتی۔ لیکن وہ اپنے خیالات میں کھوکر بے دھیان سا ہوگیا تھا۔ وہ اور محل دونوں پہلے بھی ایک دو مرتبہ مل چکے تھے۔ ان دونوں میں کوئی دوستی نہ تھی پربھ دیال گوشہ نشین...... دنیا کی گہما گہمی سے الگ تھلگ تنہائی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ ڈرامے لکھتا تھا۔ لوگ اس کے نام سے واقف تھے۔ لیکن اس بڑے میں بہت کم لوگوں نے اسے دیکھا تھا۔ اور تو اور ادیبوں سے بھی اس کا کچھ ایسا میل جول نہ تھا۔ اسے یہ بات کئی مرتبہ جتائی گئی تھی کہ نیا زمانہ تنہائی پسند لوگوں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ کسی قسم کی صلاحیت ہونا اور بات ہے۔ اور دنیا میں اپنی راہ بنانا یکسر دوسری چیز ہے۔ اس کے لیے لوگوں سے میل جول پیدا کرنا، مظاہروں اور جلسوں میں حصہ لینا نہایت لازی ہے۔ یہ بات اس کے ذہن میں موجود تھی۔ چناں چہ آج جب وہ لاہور سے آئے ہوئے ایک پبلشر سے ملنے

گیا۔ تو وہاں متل بھی آیا ہوا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اسے وہاں دیکھ کر متل کے چہرے کا رنگ کچھ بدل گیا...... شاید یہ اس کا وہم ہو۔شاید وہ زیادہ حساس طبیعت کا شخص تھا۔

پربھ دیال متل سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ وہ دونوں اس پبلشر سے اپنی اپنی کتاب کا معاملہ طے کرنا چاہتے تھے۔ پبلشر اپنے ایک دوست کے ہاں مقیم تھا۔ ظاہر ہے وہاں تو کچھ گفتگو ہو نہیں سکتی تھی۔ چناں چہ وہاں چائے وغیرہ پینے کے بعد یہی طے پایا کہ وہ پبلشر کو جگت ریستوراں میں ملیں اور ذرا تفصیل سے ساری بات چیت ہو جائے۔

متل کی طبیعت بھی کچھ خراب تھی۔ چناں چہ وہ دونوں پبلشر سے رخصت ہو کر سائیکلوں پر سوار ہو کر وہاں سے چل دیئے۔ وہ کہاں جا رہے تھے۔ یہ کچھ طے نہ پایا تھا۔ کم ازکم اس بات سے لاعلم تھا۔ راستے میں متل کچھ مضمحل سا دکھائی دے رہا تھا۔ پربھ دیال نے سمجھا کہ علالتِ طبع کی وجہ سے ایسا ہوگا۔

راستے میں متل نے اپنی کتاب کی بات چیت چھیڑ دی۔ وہ پنجابی میں کہانیاں لکھا کرتا تھا۔ اور اس میں اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ اب وہ اردو میں ترجمہ کر کے انہیں کتابی صورت میں چھپوانا چاہتا تھا۔ اسی لیے وہ اس معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا تھا۔متل نے مختلف قسم کے سوالات کیے۔ بھلا وہ پبلشر عام طور پر ادیبوں کو کتنا روپیہ دیا کرتا ہے۔ اس کی کتاب کا اندازاً وہ کس قدر روپیہ دے دے گا۔ آہ ! کاش ٹیک چند دہلی میں ہوتا تو اس کے توسط سے سارا معاملہ بخوبی طے ہو جاتا۔

ان سب باتوں کے جواب میں پربھ دیال نے بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ یہ بھی ایک سنہرا اصول تھا کہ انسان دوسروں کے معاملات میں دلچسپی لے۔ اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے متل کو اپنی دانست میں بڑے خلوص سے رائے دینی شروع کی۔ وہ دل میں خوش تھا کہ اپنی گفتگو میں اس معاملے کے ہر پہلو کو اجاگر کر رہا ہے۔ لیکن اس وقت جب کہ اس کی گفتگو اختتام تک پہنچنے کو تھی۔ اور وہ کوئی کارآمد نتیجہ نکالنے ہی والا تھا کہ متل نے اس کی بات کاٹ کر جیسے اسے اس کی باتیں ذرہ برابر متاثر نہ کر

رہی ہوں کہا۔ '' اچھا یار میں تنہائی میں بات چیت کروں گا یعنی بالکل اکیلا...... اس طرح دیکھو نا! مفت میں گڑ بڑ ہوتی ہے۔ در اصل تین چار آدمیوں میں بنا بنایا کام بھی بگڑ جاتا ہے...... بس ٹھیک ہے۔ میں ہی اس سے بات چیت کروں گا...... اکیلا......''

اس پر پربھ دیال خاموش ہوگیا۔ وہ حیران تھا کہ مثل نے یہ بات کہی کیوں؟ واقعی یہ عجیب بات تھی۔ کیا یہ بزعم خود ذہین فن کار اس قدر غیر ذمہ دارانہ طور سے گفتگو کرسکتا تھا؟ آخر اس نے اس کے معاملے میں دخل دینے کی کوشش ہی کب کی۔ خود ہی تو مثل نے اس کی رائے دریافت کی۔ اور جب اس نے اسی کے فائدے کی بات بتانی شروع کی تو حضرت پینترا بدل گئے...... وہ نہایت خاموشی سے سائیکلیں چلاتے ہوئے چلے جارہے تھے۔ پربھ دیال اپنے ہی خیالات میں گم تھا۔ وہ خفا نہیں تھا۔ لیکن وہ نہایت سنجیدگی سے اس بات پر غور کر رہا تھا کہ کہیں اسی کی غلطی تو نہیں...... اتنے میں ٹرک گذرا۔ وہ اسی گڑبڑ میں ایک دوسرے سے پرے چلے گئے...... گرد کے بادل ہر طرف پھیل گئے۔

پہلے تو فضا میں پھیلی ہوئی گرد کے بادلوں میں سے بجلی کے قمقموں کی روشنی ٹمٹماتی ہوئی دکھائی دیتی رہی۔ پھر جوں جوں گرد کم ہونے لگی۔ قمقموں کی روشنی بھی زیادہ صاف نظر آنے لگی۔ ادھر اُدھر دیکھا تو پرے مثل دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ استرے سے صفا چٹ ہو رہا تھا اور دل کی ہر کیفیت اس چہرے پر صاف عیاں ہوجاتی تھی۔ وہ اس وقت ہنس رہا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا چہرہ ہر آن نیا ہی رنگ بدلتا تھا۔ پربھ دیال حیران تھا کہ ان حالات میں وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

ہلکا پھلکا مثل پھلانگ کر جھٹ سے سائیکل پر سوار ہوگیا۔ اور پربھ دیال بھی اس کے ساتھ ہولیا۔

کچھ دور تک وہ چپ چاپ سائیکل چلاتے ہوئے چلے گئے۔ پربھ دیال سڑک پر نظریں گاڑے تھا۔ پانی کا چھڑکاؤ ہوچکا تھا۔ کہیں رُکے ہوئے پانی میں مدھم روشنی

جھلملا رہی تھی۔ سڑک پر کئی قسم کی چھوٹی موٹی لکیریں ایک دوسرے سے لپٹتی اور پرے ہٹتی دکھائی دے رہی تھیں۔ جب وہ دونوں بجلی کے کسی کھمبے کے قریب سے ہو کر گذرتے تو ان کے سائے پیچھے ہٹ کر دفعتاً آگے کو بڑھ کر لمبے ہوجاتے۔ جیسے ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہوں۔ دیر تک پربھ دیال یہ تماشا دیکھتا رہا...... پھر اسے کچھ خیال جو آیا تو اس نے پوچھا ''اب ہم کہاں جا رہے ہیں۔''

حسل نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔'' یار آج ہمارے گھر چلو...... میری طبیعت کچھ خراب ہے اور پھر جی اُچاٹ سا ہو رہا ہے۔ بیٹھیں گے کچھ دیر باتیں کریں گے...... کیوں کیا خیال ہے۔''

پربھ دیال عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ اس نے قدرے سکوت کیا اور پھر جواب دیا۔'' جیسا تم مناسب سمجھو کرو...... ہم تو حکم کے بندے ہیں۔''

پھر وہ گفتگو کرتے ہوئے گھنی آبادی سے کافی پرے نکل گئے۔ اب مکمل طور پر اندھیرا چھا چکا تھا۔ وہ کمپنی باغ کے قریب سے ہوتے ہوئے داہنی جانب گھوم گئے۔ سامنے ایک بہت بڑی کوٹھی دکھائی دے رہی تھی۔ پہلے تو پربھ دیال یہی سمجھا کہ شاید حسل اسی کوٹھی میں رہتا ہے۔ لیکن بالآخر یہ راز کھلا کہ حسل کا اس کوٹھی سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تنگ راستے سے ہوتے ہوئے بڑی کوٹھی کے پچھواڑے جا پہنچے۔ وہاں تاروں کی مدھم روشنی میں کوٹھی نما چند مکانات ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو رہے تھے...... دفعتاً ایک مکان کے قریب حسل سائیکل سے اتر پڑا۔ اور سائیکل ایک طرف کو کھڑی کر کے بھاگ کر اندر گھس گیا۔ پربھ دیال نے اپنی سائیکل میں تالا لگایا اور یہ سوچ کر شاید اندر مستورات بیٹھی ہوں۔ وہ چپ چاپ باہر کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد حسل نے سرکنڈوں کی بھاری چق اٹھا کر کہا '' چلے آؤ یار! تم ابھی تک باہر کھڑے ہو۔ یار بڑا تکلف کرتے ہو۔ ارے بھئی اپنا ہی گھر ہے غیر کا تو نہیں......''

پربھ دیال اندر چلا گیا۔

ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ سامنے دو کمرے تھے۔ ایک نسبتاً چھوٹا کمرہ داہنے ہاتھ کی طرف تھا۔ متل اسے چھوٹے کمرے کی طرف لے گیا۔ ''یار! یہ میرا کمرہ ہے میں یہیں بیٹھ کر پڑھا کرتا ہوں۔ اس جگہ سوتا ہوں۔'' کمرے کے اُس سرے پر ایک بہت بڑا پلنگ بچھا ہوا تھا۔ پلنگ کے سرہانے کی طرف ایک چھوٹی سی میز تھی۔ جس پر سادہ میز پوش بچھا تھا۔ فرش پر دری بچھی تھی۔ اِدھر اُدھر چند کرسیاں پڑیں تھیں۔

متل نے ایک آرام کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن پربھ دیال میز کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''لو بھائی! دو منٹ میں آیا۔''

پربھ دیال کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ وہ میز پر پڑی ہوئی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ لکڑی کا بنا ہوا ٹیبل لیمپ تھا۔ انگریزی کے چند ادبی رسائل کے سالنامے ایک کونے میں قرینے سے رکھے تھے۔ کوئی دوات یا کوئی قلم میز پر موجود نہ تھا۔

وہ ایک رسالہ اٹھا کر اس کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا...... ایک رنگین تصویر پر اس کی نگاہیں رک گئیں۔ اس کے نیچے موسیقی لکھا تھا۔ موسیقی کو ایک اداس اور الست عورت کے روپ میں ظاہر کیا گیا تھا۔ لیکن عورت کی چھاتی کو ضرورت سے زیادہ عریاں اور نمایاں کیا گیا تھا۔ حالانکہ اصل شے عورت کے چہرے کے جذبات تھے۔ لیکن دیکھنے والے کی نگاہ رستے ہی میں رک جاتی تھی......

متل ہلکے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا اندر آیا۔ اور پھر ایک سرد آہ کھینچ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ در اصل میری طبیعت بہت خراب ہے......''

'' تکلیف کیا ہے۔''

'' بس پیٹ میں درد ہے۔''

'' کس جگہ؟''

'' اس جگہ ...... ہاتھ لگا کر دیکھو...... اصل بات یہ ہے کہ میں گوشت کھانے کا عادی نہیں ہوں اور اگر کھاتا بھی ہوں تو بہت کم...... لیکن آج صبح ایک دوست کے ہاں

دعوت تھی۔ وہاں بہت لذیذ گوشت پکا ہوا تھا۔ اور پھر اس نے کھلایا بھی بڑے اصرار کے ساتھ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب پیٹ پکڑ کر بیٹھا ہوا ہوں۔

نیل لیمپ کی نسبتاً دھندلی روشنی میں متل کا صاف و شفاف گندم گوں چہرا ایسے دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے چکنی مٹی سے گھڑ کر بنایا گیا۔ اور پھر اس کے چہرے پر درد و کرب کے آثار پیدا ہوئے......

پربھ دیال نے اس کے پیٹ کو چھو کر پوچھا۔ ''کہو تو پیٹ مل دوں۔''

''کیا تم مالش کرنا جانتے ہو۔''

''کچھ کچھ۔''

اس کے بعد متل گھی لینے کے لیے اندر چلا گیا۔ اندر دو تین عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دور سے یہ آوازیں صحرا میں گھنٹیوں کی اڑتی ہوئی صداؤں کی طرح سنائی دیتی تھیں...... پھر وہ ایک چھوٹی سی کٹوری میں گھی ڈالے اندر آیا۔

پربھ دیال پگھلے ہوئے گھی میں انگلیاں بھگو کر اس کے بالوں والے پیٹ پر مالش کرنے لگا۔

متل کو مالش کروانے سے راحت محسوس ہوئی۔ پہلے وہ آنکھیں موندے لیٹا رہا جیسے دل ہی دل میں اس آرام دہ عمل سے مسرور ہو رہا ہو پھر اس نے آنکھیں کھول کر شکر گذار نظروں سے پربھ دیال کی طرف دیکھا۔ پربھ دیال بڑے انہماک سے مالش کرنے میں مصروف تھا۔ جب ان دونوں کی نظریں ملیں تو پربھ دیال کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ناقابلِ بیان لیکن نہایت مسرت انگیز نیز مدہوش کن جذبہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اُترا جارہا ہو۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی نظریں متل کے کورے کوزے کی مانند صفا چٹ چہرے پر جم کر رہ گئیں اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں تک نہ تھیں کہ اس کے دلی جذبات کی پردہ داری کرتیں اور اس وقت وہ اس چہرے سے کس قدر مانوس ہو چکا تھا۔

مالش کے بعد پربھ دیال بولا۔ '' میں ذرا ہاتھ دھوؤں گا......''

متل پلنگ سے اٹھ کر پاؤں سے فرش پر اپنے سلیپر ٹٹولنے لگا۔ '' اچھی بات ...... اچھی بات......'' یہ کہتا ہوا وہ پھر اندر والے کمروں میں گھس گیا۔ پربھ دیال برآمدے میں کھڑا رہا۔ وہ کپڑوں کو تیل سے بچانے کے لیے بازو پھیلائے رہا۔ وہ سمجھا کہ شاید متل اس کے لیے صابن اور پانی لینے کے لیے گیا۔ کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ کچھ بے چین سا ہو کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

معاً متل نے اندر سے جھانک کر کہا۔ '' ارے بھائی باہر کیوں کھڑے ہو...... آؤ...... آؤ نا...... ادھر باتھ روم ہی میں دھولو ہاتھ......''

پربھ دیال نے دہلیز کے اندر پاؤں رکھ دیا...... وہ کئی برس سے تنہائی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ باپ سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس لیے وہ اپنے گھر سے اتنی دور دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ گھر میں اس کی ماں اسے بہت یاد کیا کرتی تھی۔ ایک بہن اس کے من میں بستی تھی۔ کتنے عرصے سے وہ گھر کی جانی بوجھی فضا سے پرے زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ اب جو اس نے دہلیز کے اندر قدم رکھا تو اس گھریلو فضا کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ گھر کے پلنگ اور رسیوں پر لٹکے ہوئے بے ترتیب کپڑے۔ وہ کروٹ کے بل پڑے ہوئے جوتے اور دیوار میں گڑے ہوئے کیلوں سے لٹکتے ہوئے دوپٹے...... اس کمرے سے گذر کر وہ باتھ روم میں داخل ہوا۔ کمرے سے گذرتے وقت اسے کچھ اس قسم کا احساس ہوا کہ بائیں ہاتھ والے پلنگ پر کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ لیکن وہ نیچی نگاہیں کیے ہوئے اس طرف نکل آیا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ منظر اس کی آنکھوں تلے واضح ترین تصویر کی طرح ابھر رہا تھا۔ کیوں کہ اسی طرح اس کی بہن، سردیوں کے موسم میں پلنگ پر دیوار سے ٹیک لگائے، ٹانگوں پر رلی ڈالے زانو پر گورمکھی حروف کا کوئی رسالہ رکھے اسے پڑھنے میں منہمک ہوتی تھی۔ وہ گور مکھی بڑی مشکل سے پڑھ پاتی تھی۔ لیکن اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک صفحہ پڑھنے

دعوت تھی۔ وہاں بہت لذیذ گوشت پکا ہوا تھا۔ اور پھر اس نے کھلایا بھی بڑے اصرار کے ساتھ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب پیٹ پکڑ کر بیٹھا ہوا ہوں۔

ٹیبل لیمپ کی نسبتاً دھندلی روشنی میں متل کا صاف و شفاف گندم گوں چہرا ایسے دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے چکنی مٹی سے گھڑ کر بنایا گیا۔ اور پھر اس کے چہرے پر درد و کرب کے آثار پیدا ہوئے......

پربھ دیال نے اس کے پیٹ کو چھو کر پوچھا۔ ''کہو تو پیٹ مل دوں۔''

''کیا تم مالش کرنا جانتے ہو۔''

''کچھ کچھ۔''

اس کے بعد متل گھی لینے کے لیے اندر چلا گیا۔ اندر دو تین عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ دور سے یہ آوازیں صحرا میں گھنٹیوں کی اڑتی ہوئی صداؤں کی طرح سنائی دیتی تھیں...... پھر وہ ایک چھوٹی سی کٹوری میں گھی ڈالے اندر آیا۔

پربھ دیال پگھلے ہوئے گھی میں انگلیاں بھگو کر اس کے بالوں والے پیٹ پر مالش کرنے لگا۔

متل کو مالش کروانے سے راحت محسوس ہوئی۔ پہلے وہ آنکھیں موندے لیٹا رہا جیسے دل ہی دل میں اس آرام دہ عمل سے مسرور ہو رہا ہو پھر اس نے آنکھیں کھول کر شکر گذار نظروں سے پربھ دیال کی طرف دیکھا۔ پربھ دیال بڑے انہماک سے مالش کرنے میں مصروف تھا۔ جب ان دونوں کی نظریں ملیں تو پربھ دیال کو ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی ناقابلِ بیان لیکن نہایت مسرت انگیز نیز مدہوش کن جذبہ اس کی روح کی گہرائیوں میں اُترا جارہا ہو۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی نظریں متل کے کورے کوزے کی مانند صفا چٹ چہرے پر جم کر رہ گئیں اس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں تک نہ تھیں کہ اس کے دلی جذبات کی پردہ داری کرتیں اور اس وقت وہ اس چہرے سے کس قدر مانوس ہو چکا تھا۔

مالش کے بعد پربھ دیال بولا۔ ''میں ذرا ہاتھ دھوؤں گا......''

متل پلنگ سے اٹھ کر پاؤں سے فرش پر اپنے سلیپر ٹٹولنے لگا۔ ''اچھی بات ...... اچھی بات......'' یہ کہتا ہوا وہ پھر اندر والے کمروں میں گھس گیا۔ پربھ دیال برآمدے میں کھڑا رہا۔ وہ کپڑوں کو تیل سے بچانے کے لیے بازو پھیلائے رہا۔ وہ سمجھا کہ شاید متل اس کے لیے صابن اور پانی لینے کے لیے گیا۔ کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ کچھ بے چین سا ہو کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

معاً متل نے اندر سے جھانک کر کہا۔ ''ارے بھائی باہر کیوں کھڑے ہو...... آؤ...... آؤ نا...... ادھر باتھ روم ہی میں دھولو ہاتھ......''

پربھ دیال نے دہلیز کے اندر پاؤں رکھ دیا...... وہ کئی برس سے تنہائی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ باپ سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ اس لیے وہ اپنے گھر سے اتنی دور دوسرے شہر میں رہتا تھا۔ گھر میں اس کی ماں اسے بہت یاد کیا کرتی تھی۔ ایک بہن اس کے من میں بستی تھی۔ کتنے عرصے سے وہ گھر کی جانی بوجھی فضا سے پرے زندگی کے دن گذار رہا تھا۔ اب جو اس نے دہلیز کے اندر قدم رکھا تو اس گھریلو فضا کی یاد پھر تازہ ہوگئی۔ گھر کے پلنگ اور رسیوں پر لٹکے ہوئے بے ترتیب کپڑے۔ وہ کروٹ کے بل پڑے ہوئے جوتے اور دیوار میں گڑے ہوئے کیلوں سے لٹکتے ہوئے دوپٹے...... اس کمرے سے گذر کر وہ باتھ روم میں داخل ہوا۔ کمرے سے گذرتے وقت اسے کچھ اس قسم کا احساس ہوا کہ بائیں ہاتھ والے پلنگ پر کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ لیکن وہ نیچی نگاہیں کیے ہوئے اس طرف نکل آیا تھا۔ اس نے آنکھ اٹھا کر دیکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ منظر اس کی آنکھوں تلے واضح تریں تصویر کی طرح پھر رہا تھا۔ کیوں کہ اسی طرح اس کی بہن، سردیوں کے موسم میں پلنگ پر دیوار سے ٹیک لگائے، ٹانگوں پر رضائی ڈالے زانو پر گورمکھی حروف کا کوئی رسالہ رکھے اسے پڑھنے میں منہمک ہوتی تھی۔ وہ گورمکھی بڑی مشکل سے پڑھ پاتی تھی۔ لیکن اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ ایک صفحہ پڑھنے

میں دس منٹ صرف ہوجاتے لیکن وہ ہمت نہ ہارتی تھی۔ گھر کے دھندوں سے جب بھی فرصت پاتی پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتی۔

ہاتھ دھو کر دوبارہ اس کمرے میں سے گذرا تو اس نے جرأت کر کے پلنگ کی طرف دیکھا لیکن وہاں کوئی نہ تھا۔ رئی اور دیگر کپڑے کچھ اس انداز سے بکھرے پڑے تھے کہ یہ دھوکا ہوتا تھا۔ جیسے وہاں کوئی بیٹھا ہو...... وہاں کسی کو نہ پا کر اس کا دل جیسے کچھ اداس سا ہوگیا ہو۔

واپس چھوٹے کمرے میں پہنچ کر وہ پہلے کی طرح میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور متل پلنگ پر جا لیٹا۔ اور وہ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

اتنے میں ایک زنانہ آواز بلند ہوئی اور ان کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا اور وہ ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ اس پر متل ہنس پڑا۔ ''میری سسٹر ہے...... بعض اوقات بڑے زور سے چلّاتی ہے۔'' اس کے بعد پھر باتیں کرنے اور قہقہے لگانے کی آوازیں آنے لگیں۔ متل نے کہا۔ ''اچھا تو یار میں کیا کہہ رہا تھا......''

متل نے بتایا اکہرے بدن کا ایک سکھ شخص جو ساتھ والے کمرے میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا اس کا ''بردران لا'' (بہنوئی) تھا۔ پھر اس نے ایک ٹانگ سمیٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اور جذبات میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔ ''بس وہ میرا سب کچھ ہے ہی ازمائی فرینڈ...... میرا بھائی۔ میرا ہمدرد...... میرا سچا خدمت گذار...... بس کچھ ہی سمجھ لو......''

پربھ دیال نے محسوس کیا کہ متل از حد حساس طبیعت کا شخص ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ایک دم ہی کچھ گم سا ہوجاتا...... چناں چہ اب وہ پھر بے معنی اور کھوئی نظروں سے دیوار پر لٹکی ہوئی ایک پرانی سرکی کی طرف دیکھنے لگا۔ جس پر جاپانی طرز کی کوئی عمارت بنی ہوئی تھی۔ اس سے پرے کوئی تالاب، جھیل، سمندر یا دریا سا تھا۔ دریا سے بھی پرے جاپانی طرز ہی کا ایک پہاڑ تھا۔ جس کی چوٹی فوجی یا ما کی چوٹی سے

ملتی جلتی تھی۔

کمرے میں ایک پر اسرار خاموشی سی طاری ہوگئی۔ چھوٹے چھوٹے زردی مائل میالے رنگ کے کیڑے ٹیبل لیمپ کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ پربھ دیال انہیں دیکھتا رہا...... پھر اس نے کہا۔ "اچھا بھائی اب مجھے اجازت دو میں۔"

"ہوں" متل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ "یار نہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" پھر وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے...... "نہیں بھائی!...... یار پربھ دیال تم بھی کیا سوچتے ہوگے...... کہ ہاہا...... کبھی تم یاد کرو گے کہ ہا ہا...... میں متل کے گھر گیا اور اس نے مجھ سے پیٹ پر مالش کروائی ...... لیکن اب تم کھانا کھا کر جانا ......"

"نہیں بھائی تکلف مت کرو۔"

"تکلف نہیں...... واہ وا...... کھانا کھانے کے بعد جانتے ہو کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"ہم دونوں پھر بیٹھ جائیں گے......"

پربھ دیال اس کی منہ کی طرف دیکھتے دیکھتے کچھ تھک سا گیا اور بہت مدھم آواز سے اپنی انگلیاں ایک کتاب کی جلد پر بجانے لگا۔ مٹھی کس کر وہ اپنی انگلیاں یکے بعد دیگرے بڑی تیزی سے چھوڑتا پھر مٹھی بند کرتا پھر...... اس طرح اس قسم کی آواز پیدا ہوتی تھی جیسے کسی فلم کے کسی منظر میں دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دے رہی ہو۔ بالآخر متل نے اپنا فقرہ پورا کردیا۔ "پھر میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں گا کوئی سی کہانی...... یعنی اس میں سے...... جستہ جستہ......"

اندر سے برتنوں کے کھنکھنانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ باتوں کی آواز بھی آرہی تھی شاید اس کی سسٹر اور اس کا "بردر اِن لا" باتیں کر رہے تھے۔ متل نے تھوڑی دیر کے لیے منہ سے سیٹی بجا کر کسی فلمی گیت کی دھن نکالی...... پھر بولا "کھانا لگ رہا

ہے...... ہم سب اکٹھے ہی کھائیں گے......''

پربھ دیال نے متل کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسنے لگا۔'' کیا بات ہے...... ارے بھائی گھر کا معاملہ ہے۔ ہم سب ساتھ ساتھ...... کیا تم شائی فیل کرتے ہو...... ارے نہیں واہ — میں ہوں میری سسٹر...... اور برادر ان لا۔''

پربھ دیال چپ رہا اور متل اٹھ کر سلیپر چٹخاتا ہوا غائب ہو گیا۔

پربھ دیال جمائیاں لیتا رہا۔

جب متل واپس آیا تو اس وقت وہ اس موسیقی والی عورت کی تصویر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ متل اس کے کندھے کے اوپر سے گردن بڑھا کر دیکھنے لگا۔ پھر پلنگ پر بیٹھ گیا...... اور پھر دفعتاً اس کا بازو تھام کر بولا۔'' نہیں یار! تمہیں میں اندر نہیں جانے دوں گا۔ انہیں کھانے دو کھانا۔ تم یہاں میرے پاس بیٹھ کر کھانا کھاؤ گے۔ میں اس جگہ پلنگ پر یوں لیٹ جاؤں گا۔'' پھر ہنسا۔'' اور تم دوست! میرے قریب بیٹھ کر کھانا کھاؤ گے...... اور میں — میں تمہارے لقمے گنوں گا...... ہاہاہا...... ہاہاہا۔'' وہ بے تحاشا ہنسنے لگا۔ جیسے ہنسی روکنا اس کے بس کی بات ہی نہ ہو اور پربھ دیال بھی تن من کا زور لگا کر ہنسنے کی کوشش کرنے لگا۔

متل نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ پہلے مبہم سی آواز میں ان کی آپس میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد دفعتاً متل کی آواز بلند ہوئی۔'' ...... میرا دوست بیٹھا ہے بھائی اس طرف...... تم کیا جانو وہ بڑا قابل شخص ہے بہت بڑا ڈرامہ نگار...... ہندوستان کا سب سے بڑا ڈرامہ نگار...... جبکہ وہ وہاں پر بیٹھا ہے تو بھلا یہاں میرا جی کیسے لگے گا...... اور میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ نہیں بالکل نہیں۔ میرا پیٹ پھر درد کرنے لگے گا...... میں بس اب آرام سے لیٹا رہنا چاہتا ہوں۔ اور اسی لیے تو اپنے دوست کو اپنے قریب رکھنا چاہتا ہوں۔ آج میں تم لوگوں کے پاس ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتا......''

یہ کہہ کر وہ وہیں پر رکا رہا اور پربھ دیال کتاب کی جلد پر انگلیوں سے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز نکالتا رہا۔

تھوڑی دیر بعد متل کا بہنوئی دو رکابیاں لیے ہوئے اندر آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج گھر پر انہیں کھانا پکانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ کیوں کہ کسی سلسلے میں ان کے پڑوسیوں کے ہاں سے آج کھانا آ گیا تھا۔ روغن جوش، کوفتے، نمکین چاول، روٹیاں وغیرہ۔ پربھ دیال نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے نوالا اٹھا کر منہ میں رکھا۔ اور شور بے میں تر نوالہ اس کے حلق میں پھنس کر رہ گیا۔ وہ اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ پانی آئے تو......متل کا بہنوئی پانی کا گلاس لے آیا۔ وہ بڑی میٹھی زبان سے سر ذرا ایک طرف کو جھکا کر بات کرتا تھا۔ ''جی کیوں جی...... کچھ اور ...... جی...... ست بچن جی......''

تنہائی میں وہ کھانا کھاتا رہا تھا۔ اس کی پیشانی گرم ہو رہی تھی۔ کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ ہاتھوں میں لرزش سی محسوس ہو رہی تھی۔

جب وہ کھانا کھا چکا تو متل بھی آ پہنچا۔ ''ایں...... بھئی کھانا کھا لیا...... یہ کیا غضب کرتے ہو...... اتنی جلدی......تم نے آخر کھایا ہی کیا ہے......بھئی دیکھو تکلف کرتے ہو تم......''

پھر ''بہنوئی'' آئے اور فرنی سے لبریز مٹی کی رکابی میز پر رکھ کر چلے گئے۔ پربھ دیال نے دیکھا کہ رکابی میں جمی ہوئی فرنی پر چیونٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اور ''بہنوئی جی'' کی پیاری پیاری داڑھی کے چند بال......

متل نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھنسا کر ان پر سر رکھا اور لیٹے لیٹے چھت کی طرف دیکھنے لگا...... ''ارے ہاں! یار میں تمھیں اب ایک افسانہ سناؤں گا...... میں نے کہا تھا نا!''

یہ کہہ کر وہ پھر اندر والے کمروں میں غائب ہو گیا۔ پربھ دیال پھر جمائیاں لینے لگا اور پھر باتوں کی آوازیں جیسے صحرا میں گھنٹیاں بج رہی ہوں...... مکمل خاموشی میں یہ

آواز واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔

ہاتھ میں فل اسکیپ کاغذوں کی ایک فائل لیے ہوئے متل پھر اندر آیا۔ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر تک صفحات کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ پھر ایک ورق الٹ کر وہ رک گیا اور پربھ دیال کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایسے تیور بنائے جیسے کوئی بہت اہم بات کہنے کو ہو......" پربھ دیال جی!...... بعض اوقات میں یوں محسوس کرتا ہوں جیسے...... جیسے آخر یہ زندگی کیا ہے۔ یعنی اگر میں جنگل میں بیٹھا ہوں اور درخت چپ چاپ کھڑے ان کے گھنے سائے دل پر عجب قسم کی بے رنگ سی کیفیت طاری کر رہے ہوں...... اور اِدھر اُدھر ٹیلے ہوں۔ اور میں اکیلا...... مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے یہ بلبلہ...... آخر کیا رکھا ہے ان سب باتوں میں...... کبھی کبھی مکمل خاموشی میں......"

خاصی بلند زنانہ آواز فضا میں گونج گئی۔ پہلے متل چپ ہوگیا...... پھر ہنس پڑا......" مائی سسٹر......" اس کے بعد وہ پھر ہنسنے لگا۔

اس نے ادھر اُدھر کے اوراق الٹ پلٹ کر کہا۔" اچھا اب میں تمہیں افسانہ...... افسانے میں سے ایک ڈائیلاگ سناتا ہوں...... جنگل میں ہم بیٹھے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ سامنے دریا تھا۔ بلکہ ایک نالہ تھا۔ گائے کا ایک بچھڑا وہاں پانی پی رہا تھا اور گھاس کے تنکے پانی کی ننھی ننھی لہروں پر بہتے چلے جارہے تھے۔ میں نے مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا......"

اس طرح متل ورق الٹ پلٹ کر ادھر اُدھر سے اسے کچھ نہ کچھ سناتا رہا۔

پھر اس نے پربھ دیال کی طرف دیکھا جو کرسی پر کچھ اس انداز سے بیٹھا تھا جیسے اب وہ ابد تک وہیں بیٹھا رہے گا...... یا جیسے کم از کم یہ رات تو اسے اسی جگہ بسر کرنی ہو۔

متل نے پیٹ کو چھو کر کہا۔" یار میرے پیٹ میں پھر درد ہونے لگا۔ اف کیا کروں......"

پربھ دیال بہت دیر سے سوچ رہا تھا کہ اب وہ چلا جائے۔ لیکن ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوجاتی تھی۔ کہ اسے رُکنا پڑتا تھا۔ اب پھر حتل کے پیٹ میں درد ہونے لگا تھا۔ ''اب میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گا۔ کہیں رات کو تکلیف نہ بڑھ جائے۔

یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد پائجامے کی بجائے پتلون پہن کر آ گیا۔ اور بلا کسی مقصد کے یوں ہی کمرے میں ٹہلنے لگا۔ اور پھر سیٹی بجانے لگا۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے پیٹ میں درد ہو رہا تھا۔ وہ پلنگ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ ''یار! تمہاری مالش سے مجھے بہت فائدہ ہوا...... لیکن اب پھر درد ہونے لگا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ڈاکٹر سے مل لینا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ رات کو...... کیوں ٹھیک ہے نا؟''

وہ اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اور پھر واپس آیا پھر باہر کی طرف بڑھا۔ لیکن دروازے میں رک کر بولا۔ '' آؤ یار! چلیں...... تمہارا اکیلے جی نہیں لگے گا...... یوں ہی بیٹھے رہو گے اور سسٹر سے تم شرماتے ہو...... حالانکہ سسٹر بی اے پاس ہے ادب سے اسے بہت دلچسپی ہے۔ خود نہیں لکھتی لیکن اسے پڑھنے کا بہت شوق ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بڑی اچھی نقاد ہے...... وہ ادب کے ہر پہلو پر گفتگو کرسکتی ہے۔ میں ایم اے ہوں تو کیا اس کا نالج اپ ٹو ڈیٹ ہے...... تم حیران رہ جاؤ...... لیکن تم شرماتے ہو یار۔''

پربھ دیال اٹھا۔ جب وہ برآمدے میں سے گذرا تو اندر وہی پرانی گھریلو فضا کی جھلک نظر آئی...... کپڑے سینے کی مشین کٹ کٹ چل رہی تھی...... لحہ بھر کے لیے اسے ایسے محسوس ہوا جیسے کوئی رنگین آنچل سنبھالا جارہا ہو...... جیسے مشین کے سامنے کوئی لڑکی بے پروائی سے پھسکڑا مار کر بیٹھی ہو۔

ایک مرتبہ پھر وہ دونوں سائیکلوں پر سوار ہو کر چل دیئے۔

رات بھیگ چکی تھی۔ سڑک پہ بجلی کے قمقمے نہایت خاموشی سے ٹمٹما رہے تھے۔ اکا دکا مسافر...... یا کسی موٹر کے ہارن کی اڑتی ہوئی سی صدا......

"پربھ دیال!"

پربھ دیال نے آنکھیں اٹھا کر متل کے صفا چٹ چہرے کی طرف دیکھا۔

متل بولا۔" یار تم اتنا شرماتے کیوں ہو؟...... آخر میری سسٹر سے شرمانے کی بات ہی کیا تھی۔"

پربھ دیال نے شرما کر سر جھکا لیا۔

ایک موڑ پر پہنچ کر متل نے کہا۔ اچھا بھائی میں اس طرف جاؤں گا۔ ڈاکٹر جینی کے پاس۔ شاید دکان کھلی ہو......

وہ دونوں الگ ہوگئے۔ متل نے ہاتھ ہلا کر کہا۔" سولانگ...... چیریو پھر ملاقات ہوگی اسی طرح...... کبھی...... بائی چانس...... اتفاق سے جیسے آج......"

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ "سنہرا دیس" میں شامل ہے۔

سنہرا دیس

تھوپ سنگھ ریاست ٹیہری کے ایک غیر معروف گاؤں میں پیدا ہوا بچپن کے بعد لڑکپن بھی اسی جگہ پر گذر رہا تھا۔

جب اس کی عمر چودہ برس کی ہوئی تو اس کی شادی کردی گئی۔ جب اس کی دلہن گھر میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر حیران سارہ گیا۔ وہ دور ہی دور سے بیوی کو دیکھ لیا کرتا۔ اسے اس بات کا کچھ علم نہیں تھا کہ بیوی کس کام میں لائی جاتی ہے۔

سرمئی رنگ اور تیکھے نقوش والی بیوی سر نیہوڑائے زمین کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ اور تھوپ سنگھ اپنی ماں کی آڑ میں کھڑا گھور گھور کر اس کی طرف دیکھا کرتا۔

شادی کے ہنگامے میں تین چار روز تک تو وہ بہت مصروف رہا۔ اسے اردگرد کے حالات کی کچھ خبر نہ رہی۔ لیکن جوں ہی اسے ان باتوں سے فرصت حاصل ہوئی، وہ اپنے پہلے مشاغل میں غرق ہوگیا۔

دامنِ کوہ میں نہایت تندی سے شور مچا مچا کر بہنے والی ندی کے کنارے پر ان کا گاؤں آباد تھا۔ اوپر تلے دھرے ہوئے بے ڈول پتھروں کی دیواریں تھیں۔ جن پر گھاس پھونس کی چھتیں پڑی تھیں۔ بیش تر چھتوں پر بوسیدہ کنستروں کو کوٹ پیٹ کر ڈال دیا گیا تھا۔ ہر جھونپڑے کے آگے ایک چھوٹا سا چبوترا بنا ہوا تھا صبح کے وقت

عورتیں اٹھ کر پہلے ان چبوتروں پر گوبر سے لپائی کرتی تھیں۔ اس کے بعد کسی اور کام کی طرف دھیان دیتیں۔

چودہ سالہ تھوپ سنگھ ابھی بچہ ہی تو تھا۔ ابھی اس کے کھیلنے کودنے کے دن تھے۔ چناں چہ وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ پہاڑوں پر نکل جاتا۔ وہ دور دور کے چکر لگاتے۔ اس دور افتادہ گاؤں میں لڑکوں کو بہت زیادہ کھیل کھیلنے بھی نہیں آتے تھے۔ کبھی پتھر پھینکنے کا مقابلہ ہوجاتا تھا۔ ہر لڑکا گول چپٹے پتھر جمع کرتا اور پھر باری باری پتھر پھینکتے جاتے تھوپ سنگھ دبلا پتلا کمزور لڑکا تھا۔ اس لیے اس کا پتھر بہت دور نہیں جاتا تھا۔ جب دوسرے جیت جاتے تو عموماً باری باری اس کی چوٹی کھینچا کرتے تھے۔ اس بات پر وہ چیخ اٹھتا لیکن اس کے چیخنے کی کسی کو پرواہی کہاں تھی۔

غلیلوں سے چڑیاں مارنے کا کھیل بھی انہیں بہت پسند تھا۔ صرف راجہ ہی کی موٹر باٹیبری تک جاتی تھی، یا سرکاری ٹرک، غلیلوں کے لیے موٹر ٹیوبوں کے ربڑ کی ضرورت ہوتی تھی۔ صرف گھنے سنگھ کا باپ ہی ریاست کے دار الخلافہ میں جاتا اور ربر لاتا۔ اس لیے گھنے سنگھ کو اپنے ساتھیوں میں بہت بڑی اہمیت حاصل تھی۔ لیکن غلیل بنانے کے لیے ربر ہی نہیں۔ بلکہ پھیلی ہوئی اُنگلیوں کی دو شاخوں والی لکڑی کی ضرورت بھی پڑتی تھی۔ اسے چھنگا کہتے تھے۔ تھوپ سنگھ میں اور کوئی خوبی ہو یا نہ ہو لیکن چھنگا کاٹنے میں تو مہارت حاصل تھی۔ چناں چہ جب کسی لڑکے کو نئی غلیل درکار ہوتی یا کسی کا چھنگا ٹوٹ جاتا تو پھر تھوپ سنگھ کی تھوڑی بہت خوشامد کر لی جاتی۔

چند ایک اور کھیلوں کے علاوہ مچھلیاں پکڑنا بھی ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ پہاڑوں میں مچھلیاں بھی کئی طریقوں سے پکڑی جاتی ہیں۔ عام طور پر لڑکے سب سے آسان طریقہ اختیار کرتے تھے۔ ایک بڑے سے کٹورے کے اندر گندھا ہوا آٹا رکھ کر اس کے منہ پر ایک کپڑا باندھ دیا جاتا۔ کپڑے کے بیچوں بیچ ایک سوراخ کردیا جاتا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اس سوراخ کے اندر آٹا کھانے کے لیے چلی جاتیں۔ لیکن ایک مرتبہ اندر پہنچ کر انہیں باہر نکلنے کا رستہ نہ ملتا تھا۔ فوراً کٹورہ باہر نکال کر خشک زمین پر الٹ دیا جاتا۔ پانی بہہ نکلتا اور مچھلیاں تڑپنے لگتیں۔ گاؤں میں کسی کسی کے پاس ہنسی اور مچھلی

پکڑنے کا کانٹا بھی تھا۔

شادی کے چند روز بعد ایک چاندنی رات کو جب تھوپ سنگھ مچھلی پکڑنے کی نیت سے گھر سے باہر نکلا تو چبوترے پر بیٹھے ہوئے اس کے باپ نے ناریل منہ سے پرے ہٹا کر پوچھا۔ ''کہاں جاتا ہے؟''

''ندی کو''

''ندی کو؟ ابے کتے کے پلے اب تو تیری شادی ہو گئی ہے۔ اب بھی مچھلیاں پکڑنے کے لیے جاوے ہے۔''

اس رات باپ نے گھرک کر اسے گھر میں بٹھا دیا۔

اس کے بعد زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے اسے شادی کے طعنے دیے جاتے۔ اس کے بڑے بھائی بھی جو تھوڑا بہت کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ اب اس کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ اس کی بھابیاں چلتے پھرتے کوئی نہ کوئی آوازہ ضرور کستی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ پہلے انہی لوگوں نے مل جل کر اس کی شادی رچائی۔ گانے گائے، ناچ ناچ کر خوشیاں منائیں۔ اب وہی لوگ اس بات پر خفا تھے۔ ہر قدم پر اس کی شادی کا حوالہ دیا جاتا تھا۔ کام کاج کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ چناں چہ اب کھیل کود بند کر کے بڑے بھائیوں کے ساتھ کھیتوں میں کام کرنے لگا۔ لیکن اس کے کام میں سو سو نقص نکالے جاتے تھے۔

ایک روز وہ بہت دل گیر تھا۔ اس نے کھانا تک نہ کھایا تھا۔ باہر ایک ٹیلے پر سر جھکا کر بیٹھ گیا۔

ہر چہار طرف خاموشی طاری تھی۔ تیز دھوپ میں درختوں اور جھاڑیوں کے پتے چمک رہے تھے۔ دور اونچے پہاڑوں کے مدھم خطوط دکھائی دے رہے تھے۔ جن کی چوٹیاں بادلوں میں چھپی ہوئی تھیں ـــ وہ بہت اداس تھا۔ زندگی بالکل خشک اور بے معنی سی دکھائی دیتی تھی۔

اتنے میں اسے آہٹ سنائی دی۔ اس نے گھوم کر دیکھا تو اس کی دبلی پتلی بیوی جو اسی کی ہم عمر تھی جنگلی پودوں کے بیچ میں سے راستہ بناتی ہوئی چلی آرہی ہے۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ بیوی آئی اور اس کے قریب بیٹھ گئی — اسے اپنی بیوی پر غصہ آرہا تھا۔ نہ معلوم کہاں سے آن ٹپکی۔ جب تک وہ نہ آئی تھی۔ وہ چین کی بنسی بجاتا اور پہاڑوں کو پھاندتا پھرتا تھا۔ اس کی بیوی سر جھکائے اس طرح خاموش سی بیٹھی تھی۔ جیسے وہ اس کے دلی خیالات کو بھانپ چکی ہو۔ جیسے وہ خود اپنے وجود پر شرمسار ہو...... تھوپ سنگھ ہمیشہ سے ایک کمزور لڑکا تھا۔ اس کے ساتھی ہمیشہ اس پر رعب جماتے رہتے تھے۔ اور بوقتِ ضرورت اسے پیٹنے سے بھی نہ ہچکچاتے تھے۔ اس لیے وہ مار کھانے اور دب کر رہنے کا عادی ہو چکا تھا۔ گھر میں بھی وہ سب سے چھوٹا تھا اس لیے اس کا کچھ بھی رعب نہ تھا...... لیکن اس وقت جب اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو زمین کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس سے بہت مرعوب نظر آتی تھی۔ اس نے تحکمانہ آواز میں پوچھا۔ ”کیوں آئی ہو؟“

بیوی نے آنچل میں سے روٹیاں اور دال نکال کر اس کے آگے رکھدی۔ اور پھر اس کے منت کرنے لگی کہ وہ روٹی کھالے۔ وہ بڑی مشکل سے رضا مند ہوا۔ نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے بیوی کو پانی لانے کے لیے کہا۔

وہ فوراً اٹھی اور کٹورا لے کر بڑی پھرتی سے ندی کی طرف چل دی۔

اس دن اسے بیوی کی اہمیت کا کچھ احساس ہوا۔ پہلے وہ صرف اپنا ہی خیال کرتا تھا۔ لیکن اب اسے اپنی بیوی کا خیال بھی رہنے لگا۔ بلکہ اگر گھر کا کوئی آدمی اسے کچھ کہہ دے تو اسے اس بات کا اس قدر دکھ نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر کوئی اس کی بیوی کو کچھ کہہ ڈالے تو وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔

اس طرح دو ڈھائی برس گذر گئے — بیوی کبھی میکے چلی جاتی کبھی سسرال چلی آتی۔ تھوپ سنگھ بھائیوں کے ساتھ خوب دل لگا کر کھیتوں پر محنت کرنے لگا۔ بھائی اپنے

بڑے پن کے رعب میں آ کر اس سے سخت محنت لیتے تھے۔ لیکن وہ سب کچھ چپ چاپ برداشت کیے جاتا تھا۔ اس کے دل میں ایک دبی دبی سی خواہش تھی کہ اس کی بیوی گھر میں آرام سے رہ سکے۔ اسے اپنی کچھ ایسی پروانہ تھی۔ لیکن اس کی بیوی اس کی مونس اور غم خوار تھی۔ دنیا میں وہی ایک ایسی ہستی تھی جو اس کی تعظیم کرتی تھی۔ اسے اہمیت دیتی تھی۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کا ہر حکم ماننا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ابھی تک بیوی اس کے لیے ایک راز سر بستہ تھی۔ اسے ان باتوں کے علاوہ کچھ خبر نہ تھی کہ بیوی کسی اور کام میں بھی لائی جاسکتی ہے۔ اب وہ بڑا ہوگیا تھا۔ باتوں باتوں میں اس کے دوست کئی پر معنی باتیں کہہ کر اس کی طرف دیکھتے۔ وہ حیران رہ جاتا جواب نہ دے پاتا۔ پھر وہ لوگ ہنسنے لگتے۔

ایک روز— بھابی نے اس کی بیوی کو کچھ کہہ ڈالا۔ اس نے سن پایا تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے بھابی کو کھری کھری سنا دیں۔ چناں چہ جب اس کا بھائی کھیت سے واپس آیا اور اسے اس بات کی خبر ملی تو چار پائی کا پایہ لے کر اسے مارنے کو دوڑا۔ اگر ماں بیچ بچاؤ نہ کرتی تو یقیناً وہ پٹ جاتا۔ اس جھگڑے کے بعد اس نے سخت ذلت محسوس کی۔ اوّل تو اسے اس بات پر غصہ آیا کہ اب جب کہ وہ اپنے بھائیوں کے حکم کے مطابق ہر کام کرتا تھا۔ اسے دن بھر آدھ گھنٹہ آرام کرنے کی مہلت نہیں ملتی تھی تو اس محنت کے بدلے میں کم از کم اس کی بیوی کو تو دکھ نہ دیا جائے۔ اور پھر آج اس کا بھائی آنکھیں نکالے لکڑی ہاتھ میں پکڑے۔ کیسے غصے میں اس کی طرف جھپٹا تھا۔ کاش وہ خود بھی طاقتور ہوتا تو اس کے بڑے بھائی کو اس کی بیوی کے سامنے اس کی بے عزتی کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔

لڑائی جھگڑے کے بعد وہ خاموشی سے رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل آیا۔

گاؤں سے کچھ پرے ڈھلوان پہ چیڑ کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ ان درختوں کے پتوں میں سے ہوا سائیں سائیں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ مدھم چاندنی میں درختوں کے

سایوں تلے سے ہوتا ہوا۔ تھوپ سنگھ سر جھکائے خاموشی کے ساتھ قدم بہ قدم بڑھتا چلا جارہا تھا...... معاً اسے اس طرح محسوس ہوا جیسے اس کے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی ہو۔ دوسرے لمحہ میں وہ سمجھ گیا کہ اس کی بیوی چلی آرہی ہے۔

درختوں کے جھنڈ میں سے نکل کر وہ ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔ بیوی بھی اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔

سامنے تاریک کھڈیں نظر آرہی تھیں۔ ہر چیز پر خاموشی طاری تھی۔ جیسے کسی نے ان سب پر جادو کردیا ہو۔ ڈھلوان پر اُگے ہوئے جنگلی پودوں کی ملی جلی تیز بو...... پھیلی ہوئی تھی۔ تھوپ سنگھ نے ایک جنگلی پھول کو اپنی کمزور انگلیوں میں مسلتے ہوئے سرمئی رنگ کی بیوی کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور پھر آنکھ جھپکتے میں۔ وہ اس کے گلے سے لپٹ گئی اور اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اس نے اپنے سینہ پر دو گداز چھاتیوں کے دباؤ کو محسوس کیا۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ اس نے پوری قوت سے اپنی بیوی کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ لینے کی کوشش کی۔ آج پہلی مرتبہ وہ اس طرح ایک دوسرے سے بغل گیر ہوئے تھے۔

بہت دیر تک رات کی تنہائی میں کھلے آسمان تلے وہ ایک دوسرے کو نہایت خاموشی سے پیار کرتے رہے۔ انہوں نے ایک دوسرے سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ دونوں کے دل ایک دوسرے کے بہت قریب قریب دھڑکتے رہے اور پھر بیوی کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھے اس نے افق پر نظریں گاڑ دیں۔ جہاں پہاڑ محض چند آڑے ترچھے خطوط کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ وہ ان پہاڑوں سے پرے کبھی نہ گیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ ان عظیم الشان رفعتوں سے پرے ایک سنہرا دیس بستا ہے۔ ان کے ہاں کے بعض لوگ جو اس پار گئے تھے بہت اچھے اچھے قصے سنایا کرتے تھے — اور پھر اسے نجات کا رستہ سجھائی دیا۔ اس کی آنکھوں میں نئی چمک پیدا ہوئی۔

چند روز بعد ان کے گاؤں سے پرے ایک اور گاؤں سے چند لوگ سنہرے دیس

کی یاترا کے لیے جانے والے تھے۔ تھوپ سنگھ ان سے جا ملا اور کہا کہ مجھے بھی لے چلو۔ وہ اس بات پر رضا مند ہو گئے۔

تھوپ سنگھ نے یہ سب باتیں بیوی کو بتائیں۔ اس کی بیوی بہت اداس ہو گئی۔ اس نے بڑے پیار سے خاوند کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا مت جاؤ میں تمہارے پیچھے جان دے دوں گی۔

تھوپ سنگھ نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جواب دیا۔ پگلی! چپ رہ ایسی باتیں مت کہہ میں تمہاری خاطر جا رہا ہوں۔ میں تمہارے لیے اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا۔

اس نے سر ہلا دیا۔ اس کی پریشان زلفیں اور بھی پریشان ہو گئیں۔ ''نہیں مجھے اچھی اچھی چیزیں نہیں چاہئیں......''

اور وہ ضدی بچے کی طرح ہٹ کر بیٹھ گئی۔ تھوپ سنگھ نے اسے اپنی گود میں بٹھا لیا۔ اسے پیار کیا اور پھر کس کس طرح سے اسے سبز باغ دکھائے اور کیسے کیسے ڈھارس بندھائی۔ '' پھر ہم دونوں ساتھ رہیں گے۔ اس گھر میں اور کوئی نہ ہوگا۔ بس تم اور میں۔''

یہ کہہ کر تھوپ سنگھ نے اس کی زلفوں میں منہ چھپا کر اس کی نرم گردن پر ہونٹ رکھ دیئے۔ اسے گدگدی سی محسوس ہوئی۔ اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔

رخصت کے دن تھوپ سنگھ گھر والوں سے چوری طلوع آفتاب سے پہلے اٹھا۔ اور دبے پاؤں جھونپڑی میں سے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی بیوی بھی چلی آئی۔ چیڑ کے درختوں کے جھنڈ میں اس نے پھر اپنی بیوی کو پیار کیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے دنیا میں اور کچھ نہیں چاہیئے۔ اس کا کسی شخص سے کوئی جھگڑا نہیں۔ وہ کسی کو کوئی دکھ نہیں پہنچانا چاہتا۔ بس وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ کوئی ایسا کام ہو جسے کر کے وہ کھانے کے لیے پیسے کما سکے۔ خود کھا سکے اپنی عزیز بیوی کو کھلا سکے۔ اور دن کے کام کے بعد

شام کو وہ اپنی ہنستی ہوئی چنبلی اور ترو تازہ بیوی کو جی بھر کر پیار کر سکے......

وہ کھنڈوں سے اوپر کی طرف اٹھتی ہوئی دھند کو کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔'' اچھا میں جاتا ہوں۔''

اس نے بیوی کا ہاتھ تھامے رکھا۔ دو قدم ہٹ کر اس نے ہاتھ چھوڑنا چاہا لیکن بیوی نے ہاتھ نہ چھوڑا۔ شرما کر آہستہ سے اپنی طرف کھینچا۔ وہ پھر اس کے قریب چلا گیا۔ بیوی نے سر اس کی چھاتی پر رکھ دیا۔ آخر بہت دم دلاسے کے بعد وہ رخصت ہوا۔ جب وہ چند قدم پرے چلا گیا تو اس نے مڑ کر اپنی غم زدہ بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی نے لبوں پر زبردستی کی مسکراہٹ پیدا کرتے ہوئے لیکن ساتھ ہی ساتھ سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔'' ...... اپنے کانوں کو پچھلی طرف سے بلاناغہ دھویا کرنا میل نہ جمنے پائے۔''

تھوپ سنگھ ہنستا ہوا چل دیا۔

تھوڑی دور جا کر وہ گانے لگا۔ کئی سال بعد ایک مرتبہ پھر آزادی کی ہوا میں سانس لینے کا موقعہ ملا۔

پھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ منزل مقصود کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک تو ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ باقی تین جوان ہی تھے لیکن تینوں عمر میں اس سے بڑے تھے۔ وہ لوگ پہلے پہل تو مل جل کر بڑی لے کے ساتھ گاتے رہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کے گانے مدھم پڑ گئے۔ بہت لمبا سفر درپیش تھا۔ متواتر تین دن تک وہ دشوار گذار گھاٹیوں میں سے راستہ بناتے ہوئے چلتے گئے۔ بالآخر تیسرے روز شام کے وقت تھکے ہارے وہ اس پہاڑ تک پہنچے جہاں میدان کے لوگ تفریح کی غرض سے آیا کرتے تھے۔

اس جگہ نئی رونق اور نئی گہما گہمی تھی۔ عمارتیں، رکشا، صاحب لوگ رزق برق ملبوسات، وغیرہ دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

وہ پانچوں ایک بہت پرانی اور شکستہ دھرم شالہ میں رات کاٹنے کے لیے جا پہنچے۔

ٹھنڈے فرش پر رینگنے والے کھٹملوں نے کاٹ کاٹ کر اس کی ٹانگیں لہو لہان کر دیں۔ لیکن جوں ہی آنکھ لگتی وہ تصورات کی رنگین دنیا میں پہنچ جاتا۔

دوسرے روز صبح سے انہوں نے نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ شام تک گھوما کیے۔ لیکن ان میں سے کسی کو کوئی ملازمت نہ ملی --- اب یہ ان کا روز کا معمول ہو گیا کہ صبح سے شام تک ملازمت کی تلاش میں گھوما کرتے تھے۔ لیکن رات کو مایوس ہو کر لوٹ آتے تھے۔ آخر دھرم شالہ میں بھی تین دن کی مہلت ختم ہو گئی۔ انہوں نے دھکے دینے شروع کر دیئے۔

جب کسی جگہ کوئی کام نہ ملا تو اس کے ساتھی مزدوری کرنے لگے۔ وہ پہاڑ سے میدان میں اور میدان سے پہاڑ تک آنے جانے والوں کا سامان ڈھونے لگے۔ وہ چاروں مضبوط تھے۔ بھاری بوجھ اٹھا کر نیچے اوپر آجا سکتے تھے۔ لیکن وہ خود بہت کمزور تھا۔ اس کے ساتھی بھی اس کی زیادہ مدد نہ کر سکتے تھے۔ اور پھر انہیں اپنی پڑی تھی۔ انہیں اس کی زیادہ فکر ہو بھی تو کیوں؟

ایک روز بھوکا پیاسا وہ ایک بہت اچھی دھرم شالہ کے آگے کھڑا تھا۔ وہاں غریبوں کو مفت روٹی بھی مل جایا کرتی تھی۔ وہ اسی بات کا منتظر تھا کہ شاید دو روٹیاں مل ہی جائیں۔ دھرم شالہ میں سے ایک شخص صاحب لوگوں کی طرح کپڑے پہنے باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر ٹھٹکا۔ ''کیوں بے تم نوکری کرے گا؟''

''ہاں جی کرے گا۔''

پھر وہ شخص اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک اور آدمی بیٹھا تھا۔ ایک نوجوان عورت تھی۔ جس کے جسم کا رنگ اس کی بیوی کے رنگ سے کہیں زیادہ گورا تھا۔ اس کی گود میں ایک ننھا منھا گول مٹول بچہ بھی تھا۔

ان کے کمرے میں پہنچ کر...... ان لوگوں نے آپس میں کسی اور ہی زبان میں گفتگو کی۔ پھر اس کی طرف مخاطب ہو کر مختلف قسم کے سوالات پوچھتے رہے کیا نام ہے،

کہاں کے رہنے والے ہو، یہاں کوئی تمہارا اور رشتہ دار بھی ہے۔ وغیرہ وغیرہ بالآخر بارہ روپے ماہوار اس کی تنخواہ مقرر ہوئی۔ کھانا اور کپڑا اس کے علاوہ۔

یوں تو وہ محض دو وقت کھانے پر بھی کام کرنے کو تیار تھا۔ لیکن تنخواہ کا نام سن کر تو وہ بہت خوش ہوا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ مستقل طور پر کام کرنا چاہتا ہے۔ چار دن یہاں کام کیا اور چار دن وہاں...... وہ اس بات کو پسند نہیں کرتا تھا۔

اس پر وہ دونوں مرد ہنس پڑے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف پر معنی نظروں سے دیکھا اور پھر اجنبی زبان میں گٹ مٹ کرنے کے بعد ان میں سے ایک بولا۔ ''تم بالکل فکر نہ کرو۔ ہم اس جگہ کم از کم تین چار ماہ رہیں گے۔ تمہیں کھانا کپڑا اور تنخواہ دیں گے۔ اس کے بعد ہم تمہیں اپنے دیس میں لے جائیں گے — تمہیں ہمیشہ اپنا نوکر رکھیں گے۔''

یہ باتیں سن کر تھوپ سنگھ کے دل کو بڑی مسرت حاصل ہوئی۔ سب کاموں سے فارغ ہو کر رات کے وقت سونے سے پہلے بیوی کو خط لکھنے کا خیال آیا۔ اس نے بابو سے لکھنے کے لیے ہولڈر مانگا۔

''کیا کرو گے۔''

''چٹھی لکھوں گا۔''

''چھٹی۔'' وہ ہنس پڑے۔ ''کسے لکھو گے چٹھی؟''

''اپنی عورت کو۔''

''عورت کو؟ کیا تمہاری عورت بھی ہے۔''

اس نے شرما کر سر جھکا لیا۔ ''جی''

''بھئی ابھی تو تم خود ہی چھوکرے ہو...... کیا تمہاری شادی...... ہو چکی۔''

''جی — میری عورت بھی چھوٹی سی ہے۔''

''کیا بہت چھوٹی ہے۔''

''نہیں جوان ہے میرے برابر۔''

پھر وہ بہت دیر تک اس کی بیوی کی باتیں پوچھتے رہے۔ اس کی شکل وصورت قد اور جسم کی بناوٹ۔

آخر ہولڈر ملا اور اس نے چٹھی لکھی۔

'' میں اچھی طرح سے ہوں۔ پہاڑ پر پہنچ گیا ہوں۔ کوئی فکر مت کرنا مجھے نوکری بھی مل گئی ہے۔ تنخواہ ہوگی۔ کھانا کپڑا بھی ملے گا۔ اور میں تمہیں اگلے مہینے میں روپیہ بھی بھیجوں گا۔ صورتی کے پتہ پر بھیجوں گا۔ تم وہ روپیہ خرچ کرنا۔ جو باقی بچے اسے جمع رکھنا۔ نوکری بہت مشکل سے ملی۔ لیکن اب نہیں چھوٹے گی میں خوب دل لگا کر کام کروں گا۔ تم فکر نہ کرنا مجھے چٹھی لکھنا۔ گھر کا حال لکھنا اور یہ بھی لکھنا کہ میرے چلے آنے کے بعد گھر میں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ اور وہ لوگ کیا کہتے ہیں۔ میں خوب مزے میں ہوں۔ کوئی چنتا نہیں کرنا......''

یہ چٹھی لکھ کر وہ خوش خوش سوگیا۔

دوسرے روز صبح اٹھ کر اس نے انگیٹھی میں کوئلے ڈال کر جلا دیئے۔ پانی گرم کیا، چائے بنائی، بچے کو کھلایا، بازار سے سبزی لایا، بھجیا بنائی۔ روٹیاں پکائیں۔

اس طرح سارا سارا دن وہ کام کرتا تھا۔ کان کھجانے کی فرصت تک نہ ملتی تھی۔ البتہ شام کے وقت جب بابو سیر کے لیے جاتے تھے تو وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے بچے کو اٹھائے چلا جاتا تھا۔ بازار کی ہر شے اور ہر عمارت پر وہ فاتحانہ نگاہ ڈالتا تھا۔ جیسے اس ماہ کی تنخواہ ملنے پر وہ ان سب چیزوں کو خرید سکے گا۔

یوں تو سارا دن کام میں مصروف رہتا۔ لیکن اس کا ذہن آوارہ گھوما کرتا تھا۔ وہ دور دور کی باتیں سوچا کرتا تھا۔ ایک روز بی بی سے کہنے لگا۔'' بی بی جی! جب آپ دیس کو جائیں گے تو میں اپنی عورت کو ساتھ لے جاؤں گا۔''

اس نے یہ بات اس لیے کہی تھی کہ اگر انہیں کوئی اعتراض ہو تو وہ ظاہر کردیں۔

لیکن انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

اس طرح آٹھ دس روز گذر گئے۔ وہ بلا ناغہ اپنے کانوں کو پیچھے کی طرف سے خوب اچھی طرح صاف کرتا تھا۔

ایک روز دوپہر کے وقت جب کہ وہ دھرم شالہ کے صحن میں بچے کو کھلا رہا تھا اور لمبی چوٹی والے خبطی پنڈت جی کھڑتالیں بجا بجا کر گا رہے تھے۔

تم بن کوؤ اور نہ مورا

ہے کرشن جی!

اتنے میں ڈاکیہ" تھوپ سنگھ، کہتا ہوا آیا۔ لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کے نام کی ایک چٹھی تھی۔ وہ چٹھی لے کر بھاگا بھاگا گیا اور بچے کو بی بی کی گود میں سے لیتے ہوئے بولا۔" میری عورت کی چٹھی آئی ہے۔ میں اسے پڑھ لوں جرا۔"

باورچی خانے میں بجھتی ہوئی انگیٹھی کے قریب دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور چٹھی پڑھنے لگا۔

"...... جب سے تم گئے ہو۔ میں بہت اداس ہوں۔ جاتی دفے جس درخت کے قریب ہم تم کھڑے رہے تھے۔ وہاں میں ہر روج جاتی ہوں اور خوب روتی ہوں۔ جس راستے سے تم گئے تھے اس کی طرپ دیکھتی رہتی ہوں کوئی آتا ہو میں سمجھتی ہوں تم آ گئے۔ مجھے روپے کی کچھ جرورت نہیں۔ بس اب بہت نوکری کر لی۔ جتنی تنخواہ ملے لے کر ایک دم چلے آؤ۔ نہیں آؤ گے تو میں آجاؤں گی۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ بالکل نہیں رہوں گی۔ تمہارے جانے کے بعد تمہارے بھائی خوب باتیں بناتے ہیں۔ پتا جی تمہیں گالیاں دیتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں اگر کچھ کما کر لایا۔ تو کچھ نہیں کہوں گا اور اگر کھالی ہاتھ آیا تو سسرے کو گھر میں نہیں گھسنے دوں گا۔ ماں بھی روتی رہتی ہے۔ میں بھی روتی رہتی ہوں تمہیں یاد کرتی رہتی ہوں......"

یہ پڑھ کر اسے بہت خوشی حاصل ہوئی کہ اس کی بیوی اس کی یاد میں روتی رہتی

ہے ___اس نے چٹھی کو کئی مرتبہ پڑھا۔ ہر دفعہ نیا مزا پایا۔ پھر وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ کیسے کیسے خیالات اس کے دل میں آتے تھے۔ صابن کے رنگین بلبوں کی طرح تصور ہی تصور میں رنگ برنگ کے نقشے بنتے تھے اور پھر معدوم ہوجاتے تھے۔ کسی نا قابل بیان جذبہ کے ماتحت وہ سامنے کی دیوار کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔

بیوی کو اس نے دوبارہ چٹھی لکھی۔ ''...... تمہاری چٹھی ملی۔ پڑھ کر بہت کھشی ہوئی۔ تم رویا مت کرو۔ اگر تم رویا کرو گی تو میرا دل نوکری میں نہیں لگے گا۔ اب مجھے گاؤں میں مت بلاؤ۔ وہاں آ کر پھر وہی بکھیڑے شروع ہوجائیں گے کوئی پھائدہ نہ ہوگا۔ گھبرانے کی جرورت نہیں۔ ہمارے بابو بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے مجھے سدا کے لیے نوکر رکھ لیا ہے۔ بہت سریپ ہیں۔ ابھی چار پانچ ماہ تک وہ اسی جگہ رہیں گے۔ اور پھر جب واپس اپنے دیس کو جائیں گے تو مجھے اپنے ساتھ لے جائیں۔ اس بکت تک میں تمہیں روپے بھیجتا رہوں گا۔ تم اچھے اچھے کپڑے بنوا لینا۔ اور پھر تم بھی ساتھ چلنا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ رہیں گے۔ گاؤں میں کچھ نہیں رکھا۔ جب تم یہاں آجاؤ گی تو حیران رہ جاؤ گی۔ کیسے اونچے مکان ہیں۔ یہاں اور گیس کی روشنی ہوتی ہے رات کو۔ گھر کے لوگ جو باتیں بناتے ہیں تو بنانے دو۔ پھکر مت کرو۔ تمہیں صورتی کے پتہ پر روپیہ بھیجوں گا۔ سوائے ماں کے کسی کو نہ بتانا۔ میں بھی تمہیں بہت یاد کرتا ہوں لیکن تم رویا مت کرو___ اور میں کان بھی کھوب اچھی طرح دھویا کرتا ہوں۔ ہر روج۔''

ایک شام کو گھر کے سب لوگ بائسکوپ دیکھنے کے لیے گئے۔ اور کمرے کا دروازہ مقفل کر کے اس سے کہہ گئے کہ وہ بھی ادھر اُدھر گھنٹہ ڈیڑھ کے لیے گھوم پھر آئے۔

چھٹی پا کر وہ بہت خوش ہوا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ملنا چاہتا تھا۔ اور انہیں بتانا چاہتا تھا کہ اب وہ نوکر ہوگیا ہے اور بڑے مزے میں دن گذار رہا ہے۔

وہ لوگ مزدوری کرتے تھے۔ سارا سارا دن بھاری سامان ڈھوتے تھے۔ تب جا کر کہیں پیسے کا منہ دیکھنے کو ملتا تھا۔ ادھر اس کی نوکری شان دار تھی۔ مزے مزے میں

گھر کا کام کاج کرنا، روٹی بندھی بندھائی اور مہینے بعد تنخواہ۔

اس قسم کی باتیں سوچتا ہوا وہ مزدوروں کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔ جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی آج کی رات کھٹول رہیں گے۔ کھٹول ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں سے ڈھائی میل پرے۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کا کچھ بھروسہ نہ تھا۔ لیکن اسے ان سے مل کر اپنے حالات بتانے کا اس قدر شوق تھا کہ وہ لپکتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔ راستے میں بارش نے آن لیا۔ وہ بھاگم بھاگ چلا جارہا تھا۔ دھند اور بالوں میں رستہ بھائی نہ دیتا۔ آخر اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں زیادہ دیر نہ ہوجائے اور اسے خواہ مخواہ نوکری سے جواب مل جائے۔ جب وہ لوٹا تو بارش کے ساتھ ساتھ تیز و تند ہوا بھی چلنے لگی۔ ہوا کے سرد جھونکے اس کی کمزور چھاتی میں بھالوں کی طرح چبھے جارہے تھے۔ اور اوپر سے بارش کی بوچھاڑ۔

کسی نہ کسی طرح سے گرتا پڑتا وہ واپس آیا۔ بہت زیادہ دیر ہوچکی تھی۔ اسے ڈر معلوم ہوا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ لیکن جب وہ دھرم شالہ میں پہنچا تو دیکھا کہ ابھی اس کے مالک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ اس کے دل سے بوجھ ٹل گیا اس نے پرماتما کا شکر ادا کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ بھی آن پہنچے۔ اس وقت وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے انگیٹھی سلگائی۔ کپڑوں سے زیادہ اسے اپنی بیوی کی چٹھی کی فکر تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے سکھایا۔ آگ کی گرمی سے اس کے بدن کی سردی دور ہوئی اور اس حواس ٹھکانے لگے۔

جب کبھی اسے فرصت ملتی وہ انگلیوں پر دن گننے لگتا۔ وہ ہمیشہ حساب لگاتا رہتا تھا کہ اب مہینہ ختم ہونے میں کتنے دن باقی تھے۔ کبھی کبھار وہ بازار میں یوں ہی چلا جاتا اور اپنی بیوی کے لیے کوئی کپڑا یا اور کوئی چیز پسند کرنے لگتا۔ اس قسم کی چیزیں پسند

کرتے وقت اسے اس بات کا اطمینان ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ان میں سے جو شے چاہے گا۔خرید سکے گا۔

ایک روز صبح کے وقت جبکہ وہ بڑے کمرے کے ساتھ والے باورچی خانہ میں بیٹھا چائے بنانے میں مصروف تھا۔ پانی کی دیگچی انگیٹھی پر دھری تھی۔ وہ پانی کے اُبلنے کا انتظار کر رہا تھا............ کہ کچھ آہٹ پاکر اس نے اچک کر ساتھ والے بڑے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو بی بی بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہی تھی۔

اسے کچھ تعجب ہوا۔ اس نے سمجھا کہ شاید آج کمرے کی صفائی ہوگی۔ وہ اٹھ کر بڑے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں مرد بھی تھوڑا بہت سامان باندھ رہے تھے۔ اس نے کھانس کر کہا۔'' بابو جی آج کمرے کی سپھائی ہوگی کیا۔''

بابو نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔''نہیں آج ہم واپس جارہے ہیں۔''

وہ سخت حیران ہوا۔ اس کا منہ سوکھ گیا۔ دونوں بابو مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کے ساتھ گٹ مٹ کر کے باتیں کرنے لگے۔تھوپ سنگھ پیٹھ پر دونوں ہاتھ باندھے عجب بے ڈھنگے پن سے کھڑا تھا۔ اسے جیسے ان کی بات پر یقین نہ آرہا ہو۔

'' کیا آپ لوگ جارہے ہیں۔''

'' ہاں۔'' دونوں بابو بے پرواہی سے اپنے کام میں مصروف رہے جیسے ان کو پہلی بات یاد ہی نہ رہی ہو۔

پھر اس نے سوچا کہ شاید ان لوگوں کو کوئی ضروری کام پڑ گیا ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔'' آپ کہتے تھے ہم تین چار مہینے تک اسی جگہ رہیں گے۔''

'' اب نہیں رہیں گے...... اچھا اب تم چائے بنا ڈالو جلدی سے۔''

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر بڑے بابو نے کہا۔'' تھوپ سنگھ! تم نے ہمارے ہاں کل چودہ دن کام کیا ہے۔ لیکن ہم پندرہ دن کی تنخواہ دیں گے۔''

تھوپ سنگھ بے چارا ہکا بکا کھڑا تھا۔ اسے خواب میں بھی اس بات کا خیال نہ تھا۔

گھر کا کام کاج کرنا، روٹی بندھی بندھائی اور مہینے بعد تنخواہ۔

اس قسم کی باتیں سوچتا ہوا وہ مزدوروں کے ڈیرے کی طرف چل دیا۔ جب وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اس کے ساتھی آج کی رات کھٹول رہیں گے۔ کھٹول ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ وہاں سے ڈھائی میل پرے۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش کا کچھ بھروسہ نہ تھا۔ لیکن اسے ان سے مل کر اپنے حالات بتانے کا اس قدر شوق تھا کہ وہ لپکتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔ راستے میں بارش نے آن لیا۔ وہ بھاگم بھاگ چلا جارہا تھا۔ دھند اور بالوں میں رستہ بھائی نہ دیتا۔ آخر اس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کردیا۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں زیادہ دیر نہ ہوجائے اور اسے خواہ مخواہ نوکری سے جواب مل جائے۔ جب وہ لوٹا تو بارش کے ساتھ ساتھ تیز و تند ہوا بھی چلنے لگی۔ ہوا کے سرد جھونکے اس کی کمزور چھاتی میں بھالوں کی طرح چبھے جارہے تھے۔ اور اوپر سے بارش کی بوچھاڑ۔

کسی نہ کسی طرح سے گرتا پڑتا وہ واپس آیا۔ بہت زیادہ دیر ہوچکی تھی۔ اسے ڈر معلوم ہوا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ لیکن جب وہ دھرم شالہ میں پہنچا تو دیکھا کہ ابھی اس کے مالک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ اس کے دل سے بوجھ ٹل گیا اس نے پرماتما کا شکر ادا کیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ بھی آن پہنچے۔ اس وقت وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے انگیٹھی سلگائی۔ کپڑوں سے زیادہ اسے اپنی بیوی کی چٹھی کی فکر تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے سکھایا۔ آگ کی گرمی سے اس کے بدن کی سردی دور ہوئی اور اس حواس ٹھکانے لگے۔

جب کبھی اسے فرصت ملتی وہ انگلیوں پر دن گننے لگتا۔ وہ ہمیشہ حساب لگاتا رہتا تھا کہ اب مہینہ ختم ہونے میں کتنے دن باقی تھے۔ کبھی کبھار وہ بازار میں یوں ہی چلا جاتا اور اپنی بیوی کے لیے کوئی کپڑا یا اور کوئی چیز پسند کرنے لگتا۔ اس قسم کی چیزیں پسند

کرتے وقت اسے اس بات کا اطمینان ہوتا تھا کہ وہ بہت جلد ان میں سے جو شے چاہے گا۔ خرید سکے گا۔

ایک روز صبح کے وقت جبکہ وہ بڑے کمرے کے ساتھ والے باورچی خانہ میں بیٹھا چائے بنانے میں مصروف تھا۔ پانی کی دیگچی انگیٹھی پر دھری تھی۔ وہ پانی کے اُبلنے کا انتظار کر رہا تھا............ کہ کچھ آہٹ پا کر اس نے اچک کر ساتھ والے بڑے کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا تو بی بی بکھرے ہوئے سامان کو سمیٹ رہی تھی۔

اسے کچھ تعجب ہوا۔ اس نے سمجھا کہ شاید آج کمرے کی صفائی ہوگی۔ وہ اٹھ کر بڑے کمرے میں چلا گیا۔ دونوں مرد بھی تھوڑا بہت سامان باندھ رہے تھے۔ اس نے کھانس کر کہا۔ ''بابو جی آج کمرے کی سپھائی ہوگی کیا۔''

بابو نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''نہیں آج ہم واپس جا رہے ہیں۔''

وہ سخت حیران ہوا۔ اس کا منہ سوکھ گیا۔ دونوں بابو مسکرا مسکرا کر ایک دوسرے کے ساتھ گٹ مٹ کر کے باتیں کرنے لگے۔ تھوپ سنگھ پیٹھ پر دونوں ہاتھ باندھے عجب بے ڈھنگے پن سے کھڑا تھا۔ اسے جیسے ان کی بات پر یقین نہ آرہا ہو۔

''کیا آپ لوگ جا رہے ہیں۔''

''ہاں۔'' دونوں بابو بے پرواہی سے اپنے کام میں مصروف رہے جیسے ان کو پہلی بات یاد ہی نہ رہی ہو۔

پھر اس نے سوچا کہ شاید ان لوگوں کو کوئی ضروری کام پڑ گیا ہو۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''آپ کہتے تھے ہم تین چار مہینے تک اسی جگہ رہیں گے۔''

''اب نہیں رہیں گے...... اچھا اب تم چائے بنا ڈالو جلدی سے۔''

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر بڑے بابو نے کہا۔ ''تھوپ سنگھ! تم نے ہمارے ہاں کل چودہ دن کام کیا ہے۔ لیکن ہم پندرہ دن کی تنخواہ دیں گے۔''

تھوپ سنگھ بے چارا ہکا بکا کھڑا تھا۔ اسے خواب میں بھی اس بات کا خیال نہ تھا۔

تنخواہ کی بات سن کر اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا کہ وہ ان کے ساتھ نہیں جاسکے گا۔ اس نے ڈر کے مارے ان سے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہا۔

قلی آئے اور سامان اٹھا کر چل دیئے۔ بابو نے چھ روپے گن کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔ وہ چھ روپے مٹھی میں دبائے ان کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ جیسے کوئی غیبی طاقت اسے ان کے پیچھے جانے کے لیے مجبور کر رہی ہو۔

ایک جگہ پہنچ کر وہ رک گیا۔ بابو نے مسکرا کر پوچھا۔" اب تم کہاں نوکری کرو گے؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔" اب میں کہیں بھی نوکری نہیں کروں گا۔"

وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ پیچھے سے ماں کی گود میں ہمکتے ہوئے بچے کا گول مول مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

تھوپ سنگھ آنسوؤں سے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے دور پہاڑوں کے معدوم ہوتے ہوئے سلسلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید ان سے بھی پرے سچ مچ کا سنہرا دیس ہو۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

تلچھٹ

یہ درست ہے کہ میرے دوست نوشاد کی بیوی طاہرہ مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی، بلکہ زیادہ صحیح لفظوں میں نوشاد مجھ سے اپنی بیوی کا پردہ نہیں کرداتا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس روز سے پہلے تنہائی میں طاہرہ نے مجھ سے کبھی اس طرح گھل مل کر باتیں نہ کی تھیں۔

پہلے، یہ سمجھا جاتا تھا کہ زیادہ دوست نہ ہوں تو بہتر دوست ایک ہی ہو...... لیکن دوستوں کا حلقہ جس قدر زیادہ وسیع ہو اتنا ہی اچھا سمجھا جاتا ہے۔ میں پسند نہ سہی لیکن۔ مجھے اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کچھ تامل نہیں کہ دنیا میں مجھے اگر کسی سے محبت تھی تو نوشاد اگرچہ اس کی شخصیت میں غیر معمولی بات کوئی بھی نہ تھی۔

ان کے گھر میں میری آمد و رفت عام تھی۔ حالانکہ میں غیر شادی شدہ تھا لیکن اس کے باوجود مجھے ان کے چھوٹے سے گھر میں مکمل آزادی حاصل تھی نوشاد ڈاک خانے میں نوکر تھا۔ دن بھر دفتر میں رہتا۔ شام کو کچھ کھا پی کر میرے ساتھ میر کو چل دیتا۔ اگر چھٹی کا روز ہوتا تو میں ان کے گھر میں پہنچ جاتا۔

اس کی بیوی مجھے بھائی جان کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔ میری موجودگی میں بے

تکلفانہ گھر کے کام کاج میں مصروف اِدھر اُدھر گھوما کرتی...... بار ہا ان کے تنگ باورچی خانے میں ہم سب، یعنی وہ میاں بیوی، ان کے دو بچے اور میں گھس بیٹھتے۔ اس طرح خوب مزے مزے کی باتیں— اگر ننھا کہتا۔ ''امی مجھے طوطا پکا کردو۔'' تو میں بھی ضد کر بیٹھتا کہ میں بھی ''طوطا'' ہی کھاؤں گا۔ طوطے سے مراد آٹے کا بنا ہوا طوطا جو روٹی کی طرح توے پر پکایا جاتا تھا۔ جب میں اس قسم کی باتیں کرتا تو بچے خوب ہنستے تھے۔ ''آپ اتنے برے (بڑے) ہوگئے پھر طوطا کھاتے ہیں؟''

جس خاص روز کا میں ذکر کر رہا تھا اس دن شام کے وقت میں نوشاد کو ملنے کے لیے اس کے گھر پر گیا۔ اس کا مکان اوپر کی منزل پر تھا۔ دو چھوٹے کمرے اور ایک بڑا باورچی خانہ ان کے علاوہ مکان کچھ ایسا اچھا نہیں تھا۔ تاہم میاں بیوی نے مل جل کر اسے اچھا خاصہ سجا رکھا تھا۔ لیکن گلی کی جانب باہر سے یہ مکان بہت غلیظ دکھائی دیتا تھا۔ تنگ و تاریک ڈیوڑھی کے...... دروازے کے دونوں طرف گندے پانی کے نالے گرتے تھے۔

اس وقت قریب کی چھوٹی سی مسجد سے ملا کے اذان دینے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں اوپر پہنچا تو نوشاد کا نام لے کر پکارا تو طاہرہ نے کہا کہ وہ گھر پر نہیں— جب نوشاد گھر پر نہ ہوتا تو میں عموماً واپس چلا آتا تھا...... اس دن گھر میں غیر معمولی خاموشی طاری تھی اور فضا بھی اداس اداس تھی۔

میں واپس لوٹنے لگا تو طاہرہ چق کے پیچھے سے بولی۔ '' چلے آیئے۔''

'' جی نہیں میں اب واپس جاؤں گا۔ مجھے تین چار روز سے ملے نہیں۔ آئیں تو کہہ دیجئے کہ میں آیا تھا...... اچھا اب میں جاتا ہوں......''

یہ کہہ کر میں لوٹنے لگا۔

میرے قدم واپس لوٹے ہی تھے کہ میں آہٹ پاکر گھوم کر دیکھا۔ چق دفعتاً اٹھی...... طاہرہ نے جیسے کچھ کہنے کو منہ کھولا۔ لیکن آنکھیں چار ہوتے ہی— ایک لمحہ بھر کے توقف کے بعد اس نے چق چھوڑ دی۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ عجب ذہنی کش مکش میں مبتلا تھا۔ پاؤں فرش میں گڑ کر رہ گئے تھے۔ دل جیسے کہہ رہا ہو کہ مت جاؤ۔ میں نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔ '' آج بچے بھی نظر نہیں آتے۔ کہاں ہیں وہ؟''

'' جی کھیلنے گئے ہیں...... یہیں باہر...... آپ......''

اس طرح بات کہتے ہوئے میں نے چق اٹھائی اور اندر چلا گیا۔

میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا...... وہ پیڑھی پر بیٹھی تھی...... میں متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ رک رک کر باتیں کر رہی تھی پھر اس کی آواز بھرّا گئی۔

بے کیف شام کے دھندلکے میں اس کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں اور نمناک گال جن پر سے بار بار آنسو پونچھے گئے تھے کس قدر دل کش دکھائی دیتے تھے۔ میں بہت زیادہ متاثر ہوا، بلکہ مجھے یہ کہنے سے بھی باک نہیں کہ وہ مجھے اس روز بہت ہی اچھی معلوم ہوئی۔ اس اعتماد کے ساتھ اس نے مجھے اپنا رازداں بنایا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ رنج و محن کے اس شکنجے کو جس میں اس کا نازک دل جکڑا ہوا تھا، توڑ پھوڑ کر پرے پھینک دوں۔

میں نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے تشفی دی۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو میرا دل بھر آیا...... وہ سر بہوڑائے اداس نظروں سے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آندھی طوفان اور جھکڑ میں گھری ہوئی کبوتری کی مانند۔ ایک مرتبہ تو میرا جی چاہا کہ اس کی پیشانی چوم لوں اور کہوں۔ '' میری ننھی بہن...... تو فکر مت کر...... جب تک میں موجود ہوں تجھے پریشان ہونے کی ضرورت ہی کیا؟— لیکن میں کچھ نہ کہہ سکا اور چپ چاپ چلا آیا۔

بڑی سڑک پر پہنچا اور قدم بہ قدم چلنے لگا۔ گھر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ گھر پر

کیا رکھا تھا۔ دل اداس تھا۔ کوئی پروگرام پیش نظر نہیں تھا۔ سوچا ذرا بڑا سا چکر لگاتا ہوا واپس لوٹوں گا۔ سیر ہو جائے گی اور دل بھی بہل جائے گا۔

نوشاد کی بیوی کی زبانی سب باتیں سن کر مجھے از حد دکھ ہوا۔ مجھے اس بات کی بھی شکایت تھی کہ نوشاد ہر وقت میری دوستی کا دم بھرتا رہا۔ لیکن اپنی پریشانیوں کو زخمی کبوتر کی طرح پروں تلے چھپائے رکھا۔ جس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اسے میری ذات پر کوئی بھروسہ نہ تھا۔ یا اسے اس بات کا یقین نہیں تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کے قابل ہوں بھی یا نہیں۔

جس گھرانے سے مجھے ایسی پر خلوص محبت اور ہمدردی ملتی رہی ہو۔ اس کا مجھ پر بہت حق تھا۔ لیکن کیا میں ہی غافل تو نہیں رہا۔ کہیں نوشاد یہ تو نہیں سمجھ بیٹھا کہ میں سب کچھ جانتے ہوئے بھی غفلت شعاری سے کام لے رہا ہوں۔ لیکن ایسا سوچنا تو یقیناً مجھ پر بہت بڑا ظلم کرنے کے مترادف ہوگا۔ لیکن اگر اس کے دل میں میری بابت اس قسم کے خیالات جاگزیں ہوتے تو وہ مجھے ہرگز ایسی معصوم مسکراہٹ پیش نہ کر سکتا۔ دل میں اس قسم کے خیالات رکھتے ہوئے بھی اگر وہ اس طرح اپنے جذبات کو چھپانے میں کامیاب ہو گیا ہے تو پھر اسے بہت مکار سمجھنا چاہئے۔

میرا دل شکایتوں سے لبریز تھا۔ ہمارا آپس کا رشتہ بہت نازک تھا۔ میں نہایت خاموشی سے محبت کرنے والا شخص ہوں۔ عہد و پیمان اور بلند بانگ دعویٰ کرنا نہیں جانتا۔ اس میدان میں بس کورا ہی ہوں۔ لیکن پہلو میں دل رکھتا ہوں۔ کم از کم اتنی سی بات کا تو نوشاد کو بھی علم ہونا ہی چاہئے تھا۔

اس طرح اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا میں شہر سے باہر نکل گیا۔ سورج اگر چہ غروب ہو چکا تھا۔ لیکن شہر سے باہر ابھی کافی روشنی تھی۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ اس وقت ہوا میں بھی کچھ خنکی پیدا ہو چکی تھی۔ میں نے نامعلوم طور پر مسرت محسوس کی کہ اچھا ہوا جو شہر کی گرد آلود تنگ گلیوں سے باہر نکل آیا— میں چلا جا رہا تھا کہ قریب

پنواڑی کی دکان سے کسی نے میرا نام لے کر پکارا۔ دوسرے لمحہ میں ہماری نظریں ملیں۔۔۔ نوشاد ہی تھا۔

میں اس کی طرف بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمیشہ والی مسرت کی چمک پیدا ہوئی۔

اس نے پنواڑی کو ایک اور پان بنانے کے لیے کہا۔ ہم دونوں کی آپس میں حسب معمول گفتگو ہونے لگی۔ جب وہ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے اسے سلگا رہا تھا اور اس کی ٹوپی میں سے بالوں کا ایک گچھا نکل کر دیا سلائی کی روشنی میں چمک اٹھا تھا۔ اس وقت میں اسے جیسے نئے سرے سے دیکھنے میں مصروف تھا۔ اس کے چہرے پر رنج و ملال کے آثار مفقود تھے۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ اس کی بیوی نے جو گفتگو کی تھی وہ محض ایک فریب تھا۔ اسے کوئی فکر نہ تھی۔ نہ تکلیف تھی نہ پریشانی۔ اس نے بڑی بے پروائی سے سگریٹ کا لمبا کش لیا۔ اور ایک مرتبہ ریل کے انجن کی طرح دھواں چھوڑ دیا۔

میں نے بھی پان منہ میں رکھا اور ہتھیلی پر تمباکو ملتے ہوئے کہا۔ ''کہو بھئی! آج اکیلے کہاں گھوم رہے ہو۔''

سگریٹ کی ڈبیا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بس یوں ہی سوچا چلو باہر کی سیر کر آدیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صاف ستھری ہوا کا اعصاب پر بہت ہی خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ اور تم؟''

''میں پہلے گھر پر گیا معلوم ہوا تم نہیں چناں چہ میں بھی یوں ہی بغیر کسی مطلب کے ادھر چلا آیا یا یہ سمجھ لو کہ تمہاری کشش کھینچ لائی۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ یہاں تو کچھ تاگے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔''

اس پر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اور پھر ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے۔ سگریٹ کا دھواں اڑاتے خراماں خراماں چل دیئے۔

کچھ دور جا کر سڑک دو حصوں میں بٹ گئی تھی۔ ایک تو سول لائنز کی طرف چلی ،

گئی تھی اور دوسری یونی ورسٹی کی عمارتوں کی طرف۔ ان دونوں سڑکوں کے درمیان اسی جگہ سے یونیورسٹی کے کھیلنے کے میدان شروع ہوگئے تھے۔ ہم باتیں کرتے چلے جارہے تھے کہ دفعتاً نوشاد نے میرا ہاتھ دبایا اور ہم رک گئے۔

سامنے میدان کے کونے میں دونوں سڑکوں کے جدا ہونے والے مقام پر ایک بہت بڑا درخت گر پڑا تھا۔ یہ درخت بالکل سوکھا ہوا تھا۔ اس پر کوئی پتی یا ٹہنی نہیں تھی۔ اس کے ایک اوپر کو اٹھے ہوئے ٹہنے پر تین نوخیز لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ انہوں نے بھڑک دار لباس پہن رکھے تھے۔ رنگین دوپٹے سر سے کھسک کر شانوں پر گرے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ قیاس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کالج کی لڑکیاں ہیں۔

شام کی رخصت ہوتی ہوئی روشنی میں، یہ تین بلند مقام پر بیٹھی ہوئی لا ابالی ~~تو~~ خیز اور متناسب الاعضا لڑکیاں عجب بے پروائی کے عالم میں بیٹھی آپس میں چہل کر رہی تھیں۔ ان کے دونوں جانب سڑکوں پر موٹروں، تانگوں، سائیکلوں اور پیدل چلنے والوں کی ریل پیل تھی۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے پروا اپنی دھن میں بیٹھی تھیں۔ وہ حسین اور رنگین پرندوں کی مانند نظر آتی تھیں۔ جو اس شاخ سے نیچے کبھی نہ اتریں بلکہ وہیں سے آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر جائیں گی اور پھر کبھی واپس نہ آئیں گی۔

نوشاد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ یہ کیسا حسین منظر ہے۔ ہندوستان میں ایسے نظارے کم وبیش ہی دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان لڑکیوں نے جرأت کر کے کیسا دل کش منظر پیش کر دیا ہے۔ اور دیکھنے والوں پر اس کا نہ صرف خوش گوار بلکہ صحت مندانہ اثر ہوتا ہے — لو بھئی آج ہمارا اپنے تنگ محلے سے باہر نکل آنا مبارک ثابت ہوا۔"

یہ ایک حقیقت تھی۔ یوں تو ہم پہلے ہی ہنستے کھیلتے چلے آرہے تھے۔ لیکن اس منظر کے بعد تو ہم نے اپنے آپ میں واقعی ایک نئی زندگی کروٹیں لیتی ہوئی محسوس کی۔ شاید میں اکیلا ہوتا تو ان لڑکیوں کی طرف دھیان بھی نہ دیتا یا اگر دیکھ بھی لیتا تو سرسری

نظر سے۔ اور پھر اپنے خیالات میں مگن آگے بڑھ جاتا۔ یہ نوشاد ہی کی خصوصیت تھی کہ وہ عام چیزوں میں بھی حسن اور مسرت کا پہلو تلاش کر لیتا تھا۔ شاید میرا جو اس سے لگاؤ تھا۔ اور وجوہ کے علاوہ اس کی یہ بھی ایک وجہ ہو۔ وہ ہر شے کو نئے معنی بخشتا تھا۔ سرکاری دفتر کا یہ معمولی کلرک زندگی میں مسرت کی تلاش ایک نئے ہی طریقے سے کرتا۔ شراب کے گھونٹ میں اپنے ماحول کو بھولنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ماحول سے لڑنے کی بجائے اس سے سمجھوتہ کر لیتا تھا۔ لیکن یہ کس قدر مشکل کام تھا۔ دکھی انسان ماحول سے لڑتا ہے چیختا ہے چلاّتا ہے۔ لیکن وہ اس میں سکون کا متلاشی تھا۔ شاید اس کا یہی ایمان تھا کہ دکھ کا مداوا نہ ماحول سے علاحدگی میں ہے اور نہ اس کے ساتھ اندھا دھند جنگ میں بلکہ سمجھوتے میں ہے اور پھر سمجھوتے کے لیے کس روحانی عظمت کی ضرورت ہے۔ اور وہ عظمت نوشاد نے کیسے فراہم کی ہوگی۔ اس قسم کے خیالات پہلی مرتبہ مرے ذہن میں پیدا ہوئے۔

جب ہم یونیورسٹی کی عمارتوں کے قریب سے گذر رہے تھے تو نوشاد نے کہا۔'' تمہیں شاید میں بتا چکا ہوں کہ ہم کس کمرے میں پڑھا کرتے تھے...... ادھر رہا وہ کمرا۔ ان کمروں سے جن میں میں پڑھ چکا ہوں عجیب لگاؤ سا ہے۔ جیسے گودِ مادر کا لطیف احساس...... یہاں ہمارے ساتھ مار پیٹ تو ہوتی نہیں تھی۔ کبھی اپنی مرضی کے خلاف یہاں کوئی واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ پروفیسر لکچر دیتے تھے اور ہم پچھلی بنچوں پر بیٹھے اپنی پسند کے ناول پڑھا کرتے تھے۔ اگر استاد کو معلوم بھی ہوجائے تو وہ سرزنش کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ان باتوں کے عادی ہوچکے تھے۔ اور پھر نئے زمانے کا استاد اپنے شاگردوں کی نفسیات کو بھی نظر انداز نہیں کرتا۔ ان کمروں میں ہر آزار سے محفوظ ہر فکر سے دور ہم بڑی دل جمعی کے ساتھ بالزاک کی عجیب وغریب کہانیاں Droll Stories پڑھا کرتے تھے۔ کاسانووا Casanova کے خود نوشت رومانٹک واقعات سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میں نے سروالٹر سکاٹ کی lady of

lahe کا کس انہاک سے مطالعہ کیا تھا۔ جس زمانے کی یہ داستانیں لکھی گئی ہیں نہ معلوم اس قسم کا کوئی دور اس دنیا پر گذرا ہے یا نہیں لیکن کم از کم ان کا ذکر و بیان کیسا سہاؤنا ہوتا ہے۔

اپنی رو میں بہتے ہوئے نوشاد نے ایک لمحہ کے لیے سکوت کیا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''اب بھی کبھی کبھار ادھر چلا آتا ہوں— عمرِ رفتہ کو آواز دیتا ہوں......'' شاید میں بڑی تنقیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا یا شاید اس نے محسوس کیا ہو کہ فضا بہت سنجیدہ ہوتی جارہی ہے بہرحال اس نے پھر بڑی بے تکلفی سے قہقہہ لگایا اور ان باتوں کے اثر سے جو رنگ محل استوار ہوگیا تھا اسے مسمار کردیا۔

اب ہم جس سڑک پر چل رہے تھے۔ اس پر لوگوں کی زیادہ آمد و رفت نہیں تھی۔ سورج کبھی کا غروب ہوچکا تھا۔ سڑک درختوں کے سائے تلے گدلے پانی کی نہر کی طرح چکر کھاتی ہوئی دور تاریکی میں گم ہوگئی تھی۔ اس کی سطح سے باہر کی طرف کو ابھرے ہوئے گول نکیلے پتھر مدھم روشنی میں بلبوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔ اور ہم دونوں چپ چاپ ان پتھروں کو ٹھوکریں لگاتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جن کی بنیادیں کمزور تھیں۔ وہ ایک ہی ٹھوکر سے باہر نکل پڑتے تھے۔ میں نوشاد سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن کیسے کہوں یہی سوچ رہا تھا۔

نوشاد نے سر اٹھایا ہمیشہ کی طرح اب بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

سامنے یونی ورسٹی کے میدانوں سے پرے ''بیکٹ ہال'' ہوسٹل دکھائی دے رہا تھا۔ وہ عمارت خواب ناک فضا میں بے حس پتھر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی قطار در قطار کھڑکیوں میں سے پھوٹ پھوٹ کر نکلنے والی روشنی زندگی کا پتہ دیتی تھی۔

نوشاد نے بازو کی کہنی میرے شانے پر ٹیک دی۔ اور ماچس کی سلائی سے کان

کریدتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔ ''میں اس ہوسٹل میں رہ چکا ہوں کہو تمہیں یہ جگہ پسند ہے۔''

آخر یہ سوال پوچھنے کا اب کیا فائدہ تھا۔ وہ ماضی کی بات ہو چکی۔ لیکن میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب سمجھا۔ ''واقعی خوب جگہ ہے...... شہر سے باہر کھلی جگہ۔''

نوشاد نے میرے قریب سرکتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کھلی جگہ سے محبت ہے۔ جب کبھی میری طبیعت کسی بھی سبب سے مضمحل ہوتی ہے تو میں کھلی ہوا میں چلا آتا ہوں۔ یہاں آنکھوں کے لیے کوئی پابندی نہیں جتنی دور تک چاہے دیکھیں ٹانگوں کے لیے کوئی بندش نہیں جس طرف اور جتنی دور تک چاہیں نکل جائیں...... تنگ گلیاں بھینچے ڈالتی ہیں۔ جیسے انسان شکنجے میں کسا ہوا ہو لیکن ان جگہ خوب پھیل کر بیٹھیں خواہ بے مہار ادھر اُدھر سٹر گشت کریں......''

اس طرح باتیں کرتے ہوئے ہم فٹ بال کھیلنے کے میدان میں داخل ہو گئے۔ پتھریلی سڑک کے بعد دفعتاً جو چھوٹی چھوٹی ہری بھری نرم و نازک گھاس پر پاؤں رکھا تو دل کو نیا ہی سرور حاصل ہوا...... اس خاموش رات کو وسیع میدان میں ہم قدم بہ قدم بڑھے جا رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں نوشاد کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی حرکات اور سکنات سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسی وقت سوائے اس کے کہ وہ خوش اور مطمئن تھا اور بات ظاہر نہ ہوئی تھی۔

ہوسٹل کے قریب کھلی جگہ میں کھیل کی چند چیزیں پڑی تھیں۔ ایک طرف لوہے کی جمناسٹک زمین میں گڑی تھی۔ اس کے سامنے ہاریزینٹل بار ہوا میں جھولتے ہوئے لوہے کے دو رنگ (Ring) ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے مجرموں کو پھانسی دینے کے لیے لٹکائے گئے ہوں۔

نوشاد جمناسٹک سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ''تم نے کبھی جمناسٹک بھی کی ہے؟''

میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا۔ اس پر وہ ہنس پڑا۔ '' بہت کڑی ورزش ہے۔ میں بچپن سے ہی کمزور شخص ہوں۔ طبیعت چونچال ضرور تھی۔ سیر سپاٹے کا بھی بہت شوق تھا لیکن ورزش سے مجھے سخت نفرت تھی۔ اپنے دوستوں کے کہنے سننے پر میں نے دو تین مرتبہ ورزش کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن مجھ سے بات نہیں بن پڑی۔ ایک دفعہ میں نے جمناسٹک پڑونٹر نکالنے کی کوشش تو پھر اوپر نہ اٹھ سکا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دونوں بازو کچھ اس طرح مڑ گئے کہ ایک کلائی اتر گئی اور بھئی اس روز سے میں نے کانوں کو ہاتھ لگا لیا۔

یہ کہہ کر اس نے قہقہہ بلند کیا۔ میں بھی ہنسنے لگا۔ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ '' لیکن ان دنوں دولڑکے بہت ورزش کیا کرتے تھے ان میں سے ایک محمد قاسم تھا اور دوسرا بکرم سنگھ۔ وہ دونوں لمبے قد کے شخص تھے۔ ان کے جسم خوب بنے ہوئے تھے۔ محمد قاسم کا بدن زیادہ خوب صورت تھا۔ بکرم سنگھ کا جسم بھی بہت اچھا تھا۔ لیکن دوہرا ہونے کی وجہ سے وہ کچھ بھاری بھرکم اور بے ڈول سا نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی صورت کے کیا کہنے۔ صورت سے مراد یہ نہیں کہ اس کا رنگ گورا چٹا تھا۔ بلکہ اس کے خدو خال بہت اچھے تھے۔ کیسا مردانہ دبدبہ ٹپکتا تھا...... میرا دوست ہے وہ ...... سنو یار آج کل وہ پڑھتا ہی تو ہے ...... کہا نہ کھیل کود کا دیوانہ اور پڑھنے لکھنے میں صفر۔ بچارہ دو مرتبہ فیل بھی ہوا۔ آج کل لا پڑھ رہا ہے...... شاید تم یہ سن کر ہنسو گے میں کبھی کبھار اسے دیکھنے کے لیے چلا آتا ہوں۔ تم نے شاید اس بات کی طرف دھیان نہ دیا ہو لیکن انسان کے جسم — گوشت پوست میں بھی بہت کافی کشش موجود ہے۔ روحانی طور پر مجھے متاثر کرنے والا تو کوئی ملا نہیں۔ شاید اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ لیکن میں نے ایسے جسم دیکھے ہیں جن کے لیے دل میں پیار اور احترام پیدا ہوتا ہے۔ جسم عورت کا ہو یا مرد کا— لیکن اگر اس پر بھرپور صحت والا گوشت چڑھا ہو تو یقین جانو یہ بھی ایک دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ میں شرط بد کر کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم اسے دیکھ پاؤ تو تم بھی اس بات کا

اعتراف کرو گے۔ یہ نہ سمجھو کہ میں اس وقت کوئی بہت بڑا فلسفہ جھاڑ رہا ہوں۔ مجھے پھونٹ فلسفے سے چڑ ہے۔ آؤ تو بھلا دیکھیں ممکن ہے بکرم سنگھ موجود ہو۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے چل دیئے۔ ہوسٹل کے قریب پہنچ کر زندگی کے آثار نظر آنے لگے۔ اور جب اندر داخل ہوئے تو ـــ زندہ دلوں کے قہقہے بلند ہو رہے تھے، آوازے کسے جا رہے تھے، گانے گائے جا رہے تھےـــ ہوا کی ہر موج میں بھرپور زندگی کروٹیں لے رہی تھی۔

برآمدوں میں سے ہوتے ہوئے ہم ایک دروازے کے آگے جا کر رک گئے۔ نوشاد نے دستک دیـــ کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس پر اندر سے ایک بہت ہی کرخت آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی بندوق فائر کرے۔ "کون؟"

میرے کان اس قسم کے استقبالیہ الفاظ سے یکسر نا آشنا تھے۔ لیکن نوشاد بڑے اطمینان سے کھڑا تھا اس نے ایک مرتبہ پھر دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ اب کے بھاری قدموں کی چاپ سنائی دی اور پھر ایک بڑے دھماکے سے دروازہ کھلا۔ مجھے اپنے سامنے عظیم الجثہ شخص دکھائی دیا ابھی میں اس کی صورت کا جائزہ تک نہ لینے پایا تھا کہ دفعتاً ایک ایسا چھپر پھاڑ قہقہہ بلند ہوا۔ جیسے بم پھٹ پڑا ہو اور دوسرے لمحہ میں نوشاد سطح زمین سے اوپر اٹھا لیا گیا۔ اور اس کے پاؤں فرش سے دوڈھائی فٹ کی بلندی پر لٹکنے لگے۔

پہلے چند منٹ تک کچھ ایسا مہمل شور و غل پڑا کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ آخر ہم کہاں ہیں اور ہم پر کیا گذر رہی ہے۔ آیا ہمارا استقبال ہو رہا ہے۔ یا ہمیں دھتکارا جا رہا ہے۔

آخرکار ہم نے اپنے آپ کو بڑے آرام سے کرسیوں پر بیٹھے پایا اور ہمارے سامنے سردار بکرم سنگھ بیٹھے قہقہے لگا رہے تھے۔

فرش پر دری بچھی تھی۔ دیواروں پر نئی نئی سفیدی کی گئی تھی۔ بستر پر اجلی چادر بھی بچھی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں ساٹھ ساٹھ کینڈل پاور کے دو بلب روشن

تھے۔ ایک بلب تو چھت سے لٹک رہا تھا اور دوسرا ٹیبل لیمپ میں لگا تھا۔ اس قدر تیز روشنی میں کمرہ جگمگا رہا تھا۔ دیواروں پر متضاد قسم کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں چند نہایت حسین اور متناسب الاعضا مادر زاد ننگی عورتوں کی تصویریں تھیں۔ گاندھی، گورو نانک اور گورو گوبند سنگھ کی تصویریں بھی تھیں۔ یہ تصویریں شباب کی مختلف کیفیتوں کی آئینہ دار تھیں۔

پھر دفعتاً میرا ہاتھ دو بڑے کھردرے ہاتھوں نے سمیٹ لیا۔" میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

میں نے نظر اٹھا کر میز بان کی طرف دیکھا...... یہ بکرم سنگھ تھا۔ اس کا چہرہ مجھ سے ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر تھا۔ میں بخوبی اس کے خدو خال کا جائزہ لے سکتا تھا...... اور میں نے صحت ور گوشت کی حدت اور اس سے حاصل ہونے والی ناقابلِ بیان مسرت کو محسوس کیا۔

بکرم سنگھ نے بے باکی سے قہقہہ لگایا۔" جی نہیں آپ لوگ تکلف کرتے ہیں"

اس نے چائے اور پیسٹریاں منگوائیں اور ہمیں بڑے اصرار سے کھلائیں۔ نوشاد سے اس بات کی شکایت کرتا رہا کہ وہ بہت طویل عرصے تک غائب کیوں رہا۔ اس کے بعد بیتے دنوں کی یاد نئے حالات اور واقعات پر تبصرہ ہوا۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہم وہاں سے رخصت ہوئے۔

اب نوشاد خوش خوش دکھائی دیتا تھا۔ اور جب ہم ہوسٹل کی حدود سے باہر نکل آئے تو اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔" کہو یار! پسند آیا ہمارا دوست؟"

میں ہنس دیا۔ اور کہا۔" تمہارے دوست کے وجود کی مندرجہ ذیل الفاظ میں تشریح کی جاسکتی ہے: دھوم دھڑاک اڑا اڑا دھوں چھٹ پھٹ۔"

اس پر نوشاد نے جی کھول کر فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اور بولا۔" تم ایسے موڈ میں بہت کم ہوتے ہو۔ تمہاری بات سے کالج چھوڑ اسکول کے دنوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ لو اسی

خوشی میں ایک سگریٹ پیو۔"

ہم نے سگریٹ سلگائے اور پہلے کی طرح خوش گپیوں میں مصروف سڑک پر جا پہنچے۔

اب نوشاد نوعمر لڑکے کی طرح چہک رہا تھا۔ میں کتنی دیر سے ذرا سنجیدگی کے ساتھ اس سے گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ لیکن باتیں کچھ اس قسم کی ہوتی رہیں کہ میں کچھ نہ کہہ پایا۔ اور پھر مجھے یہ بھی کھٹکا تھا کہ نہ معلوم اس بات کا نوشاد پر کیا ردعمل ہو۔ اس لیے میں مناسب موقع کی تاک میں رہا۔

پہلے تو بس سٹاپ پر ٹھہرنے لگا تھا۔ لیکن پھر میں اسے گھسیٹ کر اپنے گھر لے گیا۔

نوشاد نے سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔

" یار آج تو یہی دل چاہتا ہے کہ بس باتیں کیے جاؤ آج بہت اچھا موڈ ہو رہا تھا۔ کہو آج کل کون سی فلم دیکھنے کے قابل ہے؟"

میں نے ریڈیو کا بٹن گھمایا۔ ٹھمری ہو رہی تھی۔ گھبرا کے اسے بند کردیا۔ اور بالآخر آرام کرسیوں پر نیم دراز ہو کر دھوئیں کے چھلّے بنانے کا مقابلہ ہوگیا۔

میں نے اچھا موقع تاڑ کر بات شروع کی۔" نوشاد میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔"

چشم زدن میں میرے ذہن میں ایک تجویز آئی اور میں نے ہنس کر آئی بات ٹال دی اور ہم دیر تک ہلسی مذاق کی باتیں اور آپس میں چہل کرتے رہے۔

اس نے گھڑی دیکھ کر دفعتاً ٹوپی اٹھائی اور چلنے کو تیار ہوا۔ میں نے جلدی سے چیک لکھا اور دستخط کر کے اس کے قریب پہنچا۔

وہ کھڑکی کے قریب ہونٹوں میں سگریٹ دابے شیروانی کے بٹن بند کر رہا تھا مجھے دیکھ کر بولا۔" کہو یار! وہ سامنے کی لونڈیا آج کل اسی جگہ ہے یا چل دی کہیں کو......"

میرے ہاتھ میں چیک دیکھ کر وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر اس نے چیک ہاتھ میں لے کر اسے پڑھا۔ ''میرے نام؟..... کیا مطلب؟''

میں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''نوشے میاں! مجھے تم سے بہت سخت شکایت ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ میں حق بجانب ہوں..... تم نے مجھ سے کبھی کچھ نہ کہا یقیناً یہ تمہاری بہت بڑی زیادتی تھی.....''

اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہوگیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے۔ لیکن اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے طاہرہ نے سب کچھ بتادیا ہے..... آخر دوست دوستوں کے کام آتے ہیں۔ مجھے اس بات کی سخت شکایت ہے کہ تم نے مجھ سے اس قدر تکلف برتا.....''

اس نے لرزتے ہوئے ہاتھ سے چیک جیب میں ٹھونس لیا۔ ایک قدم بڑھا۔ اور پھر لڑکھڑا کر کرسی پر گر پڑا۔ اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کی سسکیوں کے علاوہ اور کوئی آواز سنائی نہ دی تھی۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

مداوا

زینت برقع سنبھالتی ہوئی زنانہ انٹر کے ڈبے کے ایک کونے میں کھڑکی کے قریب بیٹھ گئی۔

ستمبر کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ موسم خوش گوار تھا۔ اور پھر صبح کا وقت۔ سورج طلوع ہو رہا تھا۔ برقع کے الٹے ہوئے پردے میں سے زینت کے حسن کی کشش کا حال تو اس کے شوہر کے دل سے پوچھے کوئی۔ جو اس وقت کھڑکی کے عین سامنے پلیٹ فارم پر کھڑا تھا۔ پرے پلیٹ فارم پر ان کا نوکر بچی کو ہوا میں اچھال رہا تھا۔ وہ کلکاریاں مار کر ہنستی تھی۔ زینت نے قدرے سکوت کے بعد کہا۔ ”لایئے بچی مجھے دے دیجئے۔ گاڑی چھوٹنے والی ہے۔“

شوہر نے نوکر کو آواز دی۔ زینت نے بچی گود میں لے لی۔ اور دل فریب انداز سے شوہر کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ جایئے نا! آپ بھی بیٹھ جایئے...... عورتوں کو دیکھ دیکھ کر جی نہیں بھرا کیا؟“

زینت کا شوہر ریاستِ بھوپال میں ملازم تھا۔ شادی کے بعد وہ بیوی کو لے کر بھوپال چلا گیا تھا۔ اور کبھی اسے ایک ہفتہ سے زیادہ جدا نہ کیا۔ لیکن اس مرتبہ ادھر اُدھر شادی غمی کے سلسلہ میں اسے تو چھٹی نہیں مل سکی۔ البتہ زینت چار مہینے اس سے علاحدہ

رہی۔ اب اسے کسی کام سے پنجاب کی طرف جانا پڑا تو اس نے سسرال والوں کو لکھ بھیجا کہ زینت کو اسٹیشن پر پہنچا دیا جائے جب اس کی بیوی گاڑی پر سوار ہوگئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی صحت پہلے کی نسبت بہتر ہوگئی ہے۔ صحت کے ساتھ حسن کی کشش میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ جی بھر کر بات چیت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے لیے وقت ہی نہ ملتا تھا۔ البتہ وہ مختلف حیلوں سے کھڑکی کے آگے کھڑا رہا۔

زینت کی بات سن کر وہ آگے بڑھا اور قریب پہنچ کر شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ’’ آج تم کس قدر خوب صورت دکھائی دے رہی ہو۔ جی چاہتا ہے سب کے سامنے تمہارا منہ چوم لوں۔‘‘

زینت جھینپ گئی۔ ’’ ہٹایئے آپ کو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔‘‘

شوہر نے یوں ہی کھڑکی کی چوکھٹ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ سرک کر پیچھے ہٹ گئی۔ ’’ میں سب کچھ سمجھتی ہوں...... خدا کے لیے آپ چلے جایئے اور لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ حضرت آنکھیں سینکنے کے لیے زنانہ ڈبے کے آگے کھڑے ہوئے ہیں۔‘‘

’’ ارے صاحب! یہاں تو آپ ہی کے جلوے کی تاب نہیں اوروں کا تو خیر ذکر ہی کیا۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ کو حرکت دی ــــ زینت سمٹ گئی۔ دل فریب انداز میں ہنستی ہوئی بولی۔ ’’دیکھیئے کوئی شرارت نہ کیجئے گا۔‘‘

شوہر نے سنجیدہ بن کر کہا۔ ’’ بھئی کچھ چاہیئے تو بتا دو۔ پیاس لگی ہو یا چائے کی ضرورت ہوتو کہہ دو ــــ اگلا اسٹیشن بہت دور ہے۔‘‘

’’جی بس شکریہ۔ کسی شے کی ضرورت نہیں۔ چائے تو گھر ہی سے پی کر چلے تھے......‘‘

بے خبری میں اس نے اس کے کولھے کی چٹکی لے لی وہ اچھل پڑی۔ شوہر چلتا بنا...... وہ سراسیمگی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ چوں کہ وہ بالکل ایک کونے میں بیٹھی تھی۔ اس لیے کسی نے خیال نہیں کیا۔ اس کے شوہر کی شوخی اور بے باکی ہر جگہ کار فرما تھی۔ زینت گاڑی چلنے کا انتظار کر رہی تھی۔ تا کہ وہ برقع اتار کر علاحدہ رکھ دے وہ

برقعے کی عادی نہ تھی۔ بچپن ہی سے آزاد گھومنے کی لت تھی۔ ابا بھی پردے کے پابند نہ تھے۔ امی بھی پردے کی پرستار تو نہ تھی۔ لیکن جوان بیٹیوں کی حفاظت کے خیال سے پردے کی حمایت کرتی تھیں۔ جب وہ جوانی میں قدم رکھ چکی تو بھی اپنے گھر کی چھت پر یا صحن میں بال کھولے یوں ہی چھوٹا موٹا کپڑا پہنے گھوما کرتی تھی۔ ادھر ادھر تاک جھانک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کے باوجود امی دیکھ پاتیں تو دم بخود رہ جاتیں۔ ''اللہ تیری پناہ! آج کل کی لڑکیاں کس قدر بے حیا ہوگئی ہیں۔ ذرّہ برابر خدا کا خوف نہیں کھاتیں۔ اری مردود! میں کب سے کہہ رہی ہوں......''

وہ پھاندنے کی رسی گھماتے ہوئے کہتی۔ ''چھوڑ دامی! یہاں کون ہے؟''

خیر اپنے گھر میں لڑکی کچھ ہی کرے اس وقت ماں باپ یا زیادہ سے زیادہ حقیقی خدا کا خوف ہوتا ہے۔ لیکن اگر سوال مجازی خدا کا ہو تو پھر معاملہ بہت نازک ہو جاتا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس کا شوہر نماز یا روزے کا پابند نہ تھا۔ بس پردے کی پابندی کے قائل تھے۔ شادی کے پہلے چند ماہ تو اسے نسوار کی ڈبیا کی طرح چھپائے پھرتے تھے۔ اب آکر ان کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑی تھی۔ زینت انہی خیالات میں گم مسکرائے جارہی تھی۔ ریل کے ڈبے میں ایک قیامت بپا تھی۔ مردانہ ڈبوں میں مرد تو خیر جو کچھ بھی کرگزریں کم نہ تھا۔ لیکن زنانہ ڈبوں میں عورتیں بھی کچھ کم دادِ شجاعت نہ دیتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں اگر نت نئی گالیاں سیکھنی یا سننی ہوں تو پولس والوں کی خدمات حاصل کرے۔ لیکن اگر پولس والوں کو اپنی معلومات میں مزید اضافہ کرنا ہو تو ریل کے زنانہ ڈبوں میں عورتوں کی نو بہ نو گالیاں سنیں۔ چوں کہ ''مستورات'' گھروں کی چار دیواری کے اندر بے کار بیٹھی رہتی ہیں۔ اس لیے وہ اس صنف میں کمال حاصل کر لیتی ہیں۔

ڈبے میں اس قدر شور تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ عورتیں اوپر تلے گری پڑتی تھیں۔ کچھ عورتیں دروازوں کے قریب کھڑی نئی آنے والیوں کو دور سے گالیاں اور قریب سے دھکے دے رہی تھیں۔ چند مچلی دیہاتی عورتیں باہر سے کپڑوں کی

گٹھڑیاں کھڑکیوں کے رستے اندر پھینک رہی تھیں۔ اندر والیاں چیخ چیخ کر انہیں کوس رہی تھیں۔ عجب ہنگامہ مچا ہوا تھا۔

زینت بے چاری پریشان تھی۔ اس کے ساتھ سٹ کر بیٹھی ہوئی عورت بڑے غلیظ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اور اس کے جسم سے پسینہ کی تیز بو بھی آ رہی تھی۔ زینت چاہتی تھی کہ اسے کسی بہانہ سے اٹھاوے اس نے ادھر اُدھر دیکھا پناہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ سامنے ایک نوجوان سکھ عورت بیٹھی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ شادی ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گذرا۔ کیلے کی کونپل کی طرح نازک تھی۔ زینت جب کبھی سکھ عورتوں کو دیکھتی تو حیران رہ جاتی۔ وہ سوچتی ان کے مرد عموماً اکھڑ اور کچھ خوف ناک سے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کی عورتیں کتنی خوب صورت نازک ہوتی ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ میرے پاس آن بیٹھے تو کیا ہی اچھا ہو۔ اس نے اس غلیظ عورت سے کہا۔ '' بہن آپ ذرا ادھر بیٹھ جایئے۔ اور انہیں ادھر بیٹھنے دیجئے۔ وہ عورت وحشیانہ انداز میں چمک کر بولی۔ '' کیوں؟'' آخر بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر رضا مند کر لیا۔ جب سکھ عورت اس کے پاس آن بیٹھی تو اس نے اس کا شکریہ ادا کیا۔

سکھ عورت نے کتاب بند کر دی اور تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد زینت اپنی بچی کو دودھ پلانے لگی۔ اور وہ اپنی کتاب پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔

آخر کار گاڑی نے حرکت کی سب کی جان میں جان آئی۔ اب وہ عورتیں جو کھڑی تھیں۔ کہیں نہ کہیں پھنس پھنسا کر بیٹھنے لگیں۔ ہلڑ بھی کم ہوگیا۔ امن کی فضا پیدا ہونے لگی۔ چیخ دھاڑ کی بجائے اب نرم لہجوں میں اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ '' بہن جی! ...... اجی وہ ...... بسم اللہ...... خدا نہ کرے...... پشاور...... ریوڑی...... ہائے رام۔''

اب گاڑی پوری رفتار کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس قدر شور وغل اور دھکم دھکے کے بعد سب کے اعصاب کو آرام کی ضرورت تھی۔ گاڑی کے ہچکورے پنگوڑے کا کام

دے رہے تھے۔ بعض عورتوں پر غنودگی طاری تھی۔ زینت کی بچی گود میں سوئی پڑی تھی۔ وہ خود بھی رات اچھی طرح سو نہ سکی تھی۔ اس لیے اسے سر میں گرانی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے پیٹھ کے پیچھے تکیہ رکھ کر سر ڈبے کے تختوں پر ٹیک دیا۔ اس کا سر دائیں بائیں طرف ہچکورے لینے لگا۔

وہ نیند کی ماتی نیم وا آنکھوں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں گاڑی کے سامان اور عورتوں کا جائزہ لیتی ہوئی طویل ڈبے کے سامنے والے سرے کے پرلے کونے میں جا کر رک گئیں۔

دفعتاً اس نے آنکھیں کھولیں۔ پھر یکلخت چونکی ہو بیٹھی۔ اور اس کونے کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔

پرلی طرف کی کھڑکیوں میں سے خوش گوار سفید دھوپ بڑی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اور اس تیز روشنی میں کونے میں دبکی ہوئی ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی...... وہ عورت...... زینت نے بڑے غور سے دیکھا...... اس کے منہ سے مسرت کی ہلکی سی چیخ نکل گئی...... وہ رضیہ تھی...... اس کی چہیتی سہیلی......

اتنے دنوں وہ میکے میں رہی۔ وہ رضیہ سے ملنے کی بہت کوشش کرتی رہی۔ کم بخت کا پتہ ہی نہ چلا۔ اب تو شریر کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اپنی جگری سہیلی سے ملاقات کرنے کی اسے کتنی تمنا تھی۔ مردود! ملی بھی تو کیسے؟

زینت کا دل چاہا کہ دوڑ کر اسے اپنے گلے سے لپٹا لے۔ لیکن رستہ ناگذار تھا۔ ادھر اُدھر فرش پر بے شمار سامان اوپر تلے دھرا تھا۔ اور کچھ بکھرا پڑا تھا۔ عورتیں نہ صرف بنچوں پر بلکہ بکھرے ہوئے صندوقوں اور ٹرنکوں پر خوب سٹ کر بیٹھی ہوئی تھیں یا اونگھ رہی تھیں۔ وہاں تک پہنچنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی آواز دے کر بلانا بھی مناسب نہ تھا۔ اگر مناسب ہو بھی تو وہ اس قدر بلند آواز میں چلا ہی نہ سکتی تھی۔

وہ بڑے اشتیاق سے دور ہی دور سے اسے دیکھنے لگی۔ شاید وہ بھی اس کی طرف دیکھے اور اسے پہچان لے — ہائے وہ بھوپال میں جا کر ایسی پھنسی کہ پھر اس دلدل سے نکل ہی نہ سکی۔ رضیہ کی بابت اس نے آخری خبر یہ سنی تھی کہ اس کے والدین نے ایک مال دار بوڑھے کے ساتھ اس کی شادی کردی تھی۔ جب زینت کو اس بات کی خبر ملی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس کی پیاری رضیہ کی زندگی برباد ہوگئی۔ کس قدر طرح دار اور جوان لڑکی تھی۔ وہ کسی وجیہہ سے وجیہہ جوان کے پہلو میں بھی زیب دے سکتی تھی۔ اسے تعجب تھا کہ آخر رضیہ نے یہ شادی منظور ہی کیوں کی۔ وہ شعلہ رو اور تند خو رضیہ جو اپنے مزاج کے خلاف چھوٹی سے چھوٹی بات بھی برداشت نہ کرسکتی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ یہ بے انصافی کیوں کر قبول کرلی۔ اگر چہ وہ سب سہیلیاں قبول صورت بلکہ حسین تھیں۔ لیکن جو حسن اور شباب رضیہ کے حصے میں آیا تھا۔ وہ اپنی مثال آپ تھا۔ بلند قامت پرغرور، سرکش نازنین جس پر اچھے سے اچھا جوان مرمٹے...... اب کیوں کر اپنے دن گذارتی ہوگی۔

وہ پھر رضیہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اگر چہ اس کے خد و خال بہت صاف نظر نہ آتے تھے۔ لیکن جو کچھ بھی دکھائی دیتا تھا اس سے تو یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خوش و خرم تھی۔ جسم کا رنگ پہلے کی نسبت اور بھی نکھرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ پہلے ہی کی طرح سر بلند اور طرح دار دکھائی دیتی تھی۔ رنگین اور بھڑک دار کپڑے پہنے وہ سورج کی تیز روشنی میں شعلہ سا معلوم ہو رہی تھی۔

اس کا اشتیاق بڑھتا جارہا تھا۔ جب کبھی رضیہ کا رخ اس کی طرف ہوتا تو وہ ہاتھ اٹھا کر اشارے کرتی لیکن ادھر سے کوئی جواب نہ ملتا۔ ایک دو مرتبہ ادھر اُدھر بیٹھی ہوئی عورتوں نے اسے اشارے کرتے دیکھ لیا۔ چناں چہ اس نے اشارے کرنے بند کردیئے۔ وہ اس سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھی۔ دل چاہتا تھا کہ اڑ کر وہاں پہنچ جائے ایک مرتبہ تو اس نے '' جو ہو سو ہو'' کہہ کر بچی کو کندھے سے لگایا۔ اور قدم

اٹھانے ہی کو تھی کہ ایک مرد نہ معلوم کہاں سے اندر آن گھسا وہ فوراً اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔ اور برقع سر پر ڈال لیا۔ وہ شخص دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی بلند اور کراری آواز میں کہنے لگا۔

''میری محترم بہنو! اور ماؤں...... کہا ہے۔

لاکھ کرے انسان اس کے کیے کچھ نہیں ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔''

اس کا یہ شعر سن کر زینت کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ وہ اکہرے بدن کا نحیف، بے ضرر، اور تیزی سے گھومنے والی آنکھوں والا شخص تھا۔ کہنے لگا۔

''بہنو! کبیر جی کہہ گئے ہیں۔

بڑا ہوا تو کیا ہوا جوں لا نبی کھجور
پنچھی کو سایہ نہیں پھل لاگے اتی دور

اور کہا ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل خاک جیا کرتے ہیں''

زینت سوچ رہی تھی کہ دیکھیں اب اس شعر بازی کا نفسِ مضمون سے کیا تعلق پیدا کرتے ہیں۔

''لیکن ماؤں اور بہنو! زندگی جبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ انسان کی صحت ٹھیک ہو اگر صحت اچھی نہیں تو زندہ دلی پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اور کہا ہے۔

جان ہے تو جہان ہے بابا

بہنو! میں کوئی ڈاکٹر، حکیم یا وید نہیں ہوں — ایک مرتبہ ایک بزرگ نورانی صورت میرے حال پر کرم فرما کر مجھے جنگلی جڑی بوٹیوں کا ایک نسخہ دے گئے تھے۔ اور کہہ گئے تھے۔ بیٹا جب تک زندہ رہو یہ دوا راہِ مولیٰ، پرماتما کے نام پر، واہگورو کے نام

پر ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی — یعنی پرماتما کے بندوں میں تقسیم کرو......

صاحبانو...... یعنی میرا مطلب ہے بہنو! یہ ہیں میرے پاس گولیاں ان کا نام ہے گھر کا ڈاکٹر، گھر کا حکیم، گھر کا وید — ان کے ہمراہ ایک کاغذ بھی ہے۔ اس کاغذ پر دوا استعمال کرنے کی ترکیب لکھی ہوئی ہے۔ سر کی چوٹی سے لے کر پاؤں تک کی ایڑی تک یہ دوا ہر مرض میں تیر بہدف کام کرتی ہے قیمت صرف دو آنے۔ بڑی شیشی چار آنے جن بہنو کو ضرورت ہو ہاتھ بڑھا کر لے سکتی ہیں ترکیب استعمال پوچھ سکتی ہیں۔ یاد رکھئے اس میں میرا نفع کچھ بھی نہیں۔ اتنا خرچ تو شیشیوں، لیبلوں وغیرہ پر اٹھ جاتا ہے —

ایک پیسہ کی چار ٹکیاں بطور نمونہ سنگترا، گلاب، کیلا، چنبیلی...... سات قسم کی خوشبو سات قسم کا مزا...... یہ کوئی بازاری چیز نہیں بلکہ دماغ کا نچوڑ ہے...... جی متلاتا ہو، منہ میں بدبو، پیٹ میں اینٹھن، اُٹھتے بیٹھتے آنکھوں کے آگے تارے دکھائی دیتے ہوں...... جی......سات قسم کا مزا...... (دھمکی دیتے ہوئے) اور جب میں بکس جیب میں رکھ لوں گا تو پھر ایک ٹکیہ چار آنے میں بھی نہیں دوں گا...... عورت، بچہ، بوڑھا، جوان سب کھا سکتے ہیں۔ ہاتھ بڑھایئے اور لیجئے...... اس پر کارخانہ کا پتہ لکھا ہوا ہے۔"

کئی عورتوں نے ہاتھ بڑھائے۔ تھوڑی دیر کے لیے پھر ہنگامہ پیدا ہو گیا۔ عورتیں ایک دوسری پر گری پڑتی تھیں۔ رضیہ اپنی جگہ پر بدستور بڑی تمکنت سے بیٹھی رہی۔ اس نے نہ سر پر برقع ڈالا۔ نہ ہاتھ بڑھایا۔ زینت کو رضیہ کی یہ ادائیں پسند تھیں۔ شاید اس لیے کہ وہ خود ڈرپوک اور دبو طبیعت کی عورت تھی۔

بچپن میں جب وہ اکٹھی کھیلتی تھیں تو آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہو جانے پر وہ لڑکوں کی طرح گتھم گتھا ہو جانے سے بھی باز نہ رہتی تھی مردود طاقت ور بھی تو بہت تھی۔ جہاں کہیں اس کا پنجہ اڑ جائے۔ کیا مجال جو بلا گوشت نوچے چھوڑ دے جن دنوں پھوٹتی جوانی تھی۔ ایک مرتبہ ہم دونوں سڑک پر چلی جا رہی تھیں۔ کسی راہ چلتے لڑکے نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر ہائے کہہ دی۔ لیکن رضیہ اسی جگہ رک گئی۔ اور بڑی بے باکی سے پکار کر

بولی۔'' برخوردار ذرا ادھر تو آؤ۔''

مجھے بڑی شرم آئی۔ میں اسے کھینچ کر لے گئی۔ ورنہ وہ جوتا ہاتھ میں لے بیٹھی تھی۔ میں نے کہا۔'' مردود اب تو مردوں کے منہ لگے گی؟''

اس نے چیخ کر کہا۔'' اری! تو ان لوگوں کو مرد کہتی ہے۔ اگر یہ برخوردار ذرا میرے قریب آجائے تو چند پا پروہ جوتے برساؤں.....''

مجھے اس دن سے کان ہوگئے۔ کہ اس بے حیا کے ساتھ باہر کبھی نہ جاؤں گی..... اور جب وہ تالاب پر نہانے کے لیے جایا کرتی تھی۔ تو کم بخت کیسی قلا بازیاں لگایا کرتی تھی۔ اور پھر ہاتھ چلاتی ہوئی یہ جا وہ جا..... رضیہ کے ابا کالج میں پروفیسر تھے۔ لڑکوں کے ہوسٹل میں ان کے لیے ایک شان دار تالاب بنا ہوا تھا۔ باہر سے یہ ایک خوب صورت عمارت دکھائی دیتی تھی۔ سطح زمین بہت بلند بڑی بڑی کھڑکیاں..... اندر ٹائیلوں کا بنا ہوا صاف و شفاف فرش۔ تالاب میں گہرے نیلے رنگ کا پانی اس قدر پاکیزہ ہوتا تھا۔ کہ اوپر کھڑے ہو کر دیکھیں تو نگاہ فرش تک پہنچتی تھی۔ کنارے پر ایک طرف چھلانگ لگانے کے تختے اور ان کے نیچوں پھسل کر پانی میں غوطہ لگانے کے لیے لکڑی کا بنا ہوا پرنالہ سا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں جب لڑکے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ تو چاندنی راتوں میں وہ سب سہیلیاں نہانے کے لیے اس تالاب میں جایا کرتی تھیں۔ رضیہ کا بنگلہ ہوسٹل کے حدود ہی میں تھا۔ ان کے ابا کے ذریعہ ہمیں نہانے کی اجازت مل جاتی..... نما، سورن، بلو بھی تو شامل ہوتی تھیں۔ وہ اندر سے تالاب کا دروازہ بند کرلیتیں۔ بجلی کا بٹن دبا دینے پر ڈے لائٹ روشنی سے تالاب کا پانی جھلمل کرنے لگتا۔

ہائے کیسی شرماتی تھیں۔ سب لڑکیاں۔ ایک کہتی تھی اچھا پہلے تو کپڑے اتار دوسرے کہتی نہیں پہلے تم اتارو۔ اسی بات پر ایک دوسرے پر جھپٹنے لگتیں..... بلو سب سے زیادہ شرمیلی تھی۔ اس کی بلی کی سی آنکھیں تھیں اس لیے سب اسے بلو ہی کہہ کر بلاتی

تھیں۔ سب لڑکیاں کپڑے تار بھی دیتیں تو وہ رضا مند نہ ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کی خوب گت بنی۔ سب نے مل جل کر اس کے کپڑے نوچ کھسوٹ کر پرے پھینک دیئے۔ اور اسے دونوں ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر جھولے کی طرح جھلایا اور بیچ پانی کے پھینک دیا۔ غضب کی تیراک تھی۔ مردود جھٹ لگی مینڈک کی طرح تیرنے۔ لیکن تختے کی طرح اس قدر زور سے پانی میں گرنے کی وجہ سے بے چاری کے گورے گورے جسم کا پچھلا حصہ سرخ ہوگیا۔

ان کاموں میں ان کی لیڈر رضیہ ہی ہوتی تھی۔ وہ سب سے بلند قامت لڑکی تھی۔ اس کے جسم کی بناوٹ اور کس بل دیکھ کر رشک آتا تھا۔ کپڑے اتارنے میں وہی پہل کرتی تھی۔ اور اگر پھر بھی کوئی لڑکی چوں و چراں کرتی تو پکڑ کر کپڑوں سمیت تالاب میں......

رضیہ کا وجود بھی ہمارے لیے مایۂ ناز تھا۔ وہ بے باک ضرور تھی۔ لیکن اس کا چال چلن برا نہ تھا۔ ان دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دوسری کی کوئی بات پوشیدہ نہ تھی۔ یہ تو خیر ناممکن تھا کہ رضیہ کی کسی مرد سے محبت ہو اور وہ اس سے یہ بات چھپا کر رکھے...... وہ تو معمولی لڑکوں کو خاطر ہی میں نہ لاتی تھی۔ وہ بڑے بے باکانہ لہجے میں کہتی۔ ''ہم کیوں دب کر رہیں۔ اگر دنیا میں مردوں کا وجود ضروری ہے۔ تو ہمارا وجود بھی اسی قدر لازی ہے۔ سمجھ بوجھ، ذہانت، تعلیم، تدبر — کس بات میں ہم ان سے کم ہیں۔ اگر ہمیں موقع دیا جائے۔ تو زندگی کے ہر شعبے میں ہم ان کے پہلو بہ پہلو چل سکتی ہیں۔''

اس کی طبیعت سے واقف کوئی لڑکا اسے چھیڑنے کی جرأت نہ کرسکتا تھا۔ وہ تنک کر کہتی۔ ''میں ان لڑکوں سے نفرت کرتی ہوں۔ کیسے لجلجے، چھچھوندر کی طرح۔ کلّوں پر گوشت نہیں۔ چلتے ہیں تو ٹخنے ٹکراتے ہیں ان کے اور پھر یہ منہ لے کر آتے ہیں عشق جتانے یہ لوگ اس قدر بے حیا ہیں کہ ان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سے کم نہیں۔ اور اگر

میرے ہاتھ گئیں.....''

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جس جگہ ان کی سہیلی سورن کی شادی ہوئی۔ وہ گھرانا مالی طور پر اتنا اچھا نہ تھا۔ سورن کے والدین ہی بے چارے غریب تھے تو ان کو اچھا رشتہ کہاں سے مل سکتا تھا۔ لیکن سورن کا خاوند اچھا تھا۔ صورت حسین نہ سہی صحت اچھی تھی۔ اور پھر ہنس مکھ ہر وقت بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ رضیہ نے سورن کے گھر والوں کو صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ بھئی! سورن کا خاوند ہزاروں میں نہیں تو سینکڑوں میں سے ایک ضرور تھا۔ کیسا خوش مزاج اور متناسب الاعضا سورن کی ماں نے ہنس کر کہا۔'' بٹی پرماتما کرے تجھے اس سے بھی زیادہ اچھا پتی ملے۔

اس پر رضیہ نے جھینپ کر منہ دوسری طرف کر لیا۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی— بے چاری کی شادی ہوئی بھی تو ایک بوڑھے کھوسٹ کے ساتھ۔ آخر اس کے ابا کی عقل پر کیا پتھر پڑ گئے۔

گاڑی کا دروازہ کھلا اور زینت اپنے خیالات سے چونکی۔ دو میلے کچیلے غریب سکھ لڑکے اندر داخل ہوئے۔ سب کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ ان کی قمیصیں پھٹی پرانی تھیں۔ گھٹنوں تک میلے جانگئے۔ ننگے پاؤں ٹخنوں اور ایڑیوں پر میل۔ سروں پر ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں۔ کنپٹیوں اور کانوں کے پیچھے سے بال باہر کو نکلے ہوئے۔ رنگ گندمی۔ خط و خال بہت اچھے تھے۔ صرف آنکھیں خراب تھیں۔ سرخ سرخ آنکھوں میں سے پانی رس رہا تھا۔ ناک پر پسینہ کی بوندیں تھیں۔ اندر داخل ہونے کے بعد وہ ایک دوسرے کے ساتھ لگ کر کھڑے ہوگئے۔ ان کے چہرے جذبات سے خالی تھے۔ ہاتھوں میں ٹوٹے ہوئے گھروں کی دو دو ٹھیکریاں پہلے انہوں نے اپنے پسینہ میں تر ہاتھ قمیص سے رگڑ رگڑ کر خشک کیے۔ پھر ایک خاص انداز اور تال کے ساتھ ان ٹھیکریوں کو بجانے لگے۔ ٹک ٹک ٹک ٹک۔ ٹک ٹکا ٹک ٹک۔ اور اس کی تال پر اپنے سروں کو حرکت بھی دیتے جارہے تھے۔ پھر انہوں نے اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑیوں کو درست کیا۔ اور دفعتاً ہی بلند

لے میں بول اٹھے:

پھیر کہیا سری گورو ارجن دیو نے

ٹک ٹکاٹک ٹک۔ ٹک ٹکاٹک ٹک

بڑی بوڑھی سکھ عورتوں کے ہاتھ جڑنے کے انداز میں یکجا ہوگئے۔ اور وہ کچھ وجد اور احترام کے ملے جلے جذبات سے ان لڑکوں کی طرف دیکھنے لگیں...... لڑکوں کی ٹک ٹک ٹکاٹک کی تال سے زینت کے ذہن میں ایک ہم آہنگی سی پیدا ہوگئی۔ اور وہ پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر بہتے ہوئے پتہ کی طرح اپنے خیالات کی رو میں بہنے لگی...... بجی ٹھنکنے لگی۔ اس نے سوچا شاید اب رضیہ کا بھی کوئی بچہ ہو۔ شادی کو ڈیڑھ برس سے اوپر ہو چکا تھا...... لیکن وہ بوڑھا کھوسٹ...... اس کا دانتوں کے بغیر کھوکھلا منہ دیکھ کر رضیہ کو کیسی گھن آتی ہوگی...... دانتوں کی بات سے اسے جلیل کے دانت یاد آگئے۔ کیسی عمدہ تراش تھی ان کی ...... موتیوں کو شرماتے تھے...... جلیل رضیہ کا چچا زاد بھائی تھا۔ رضیہ کو صرف اس نوجوان سے کچھ لگاؤ تھا۔ بظاہر اس نے اس قسم کی کوئی بات نہ کہی تھی۔ لیکن قیاس سے معلوم ہوتا تھا۔ رہتا ہوسٹل میں تھا۔ لیکن رضیہ کے ہاں بھی عموماً آیا کرتا تھا۔ جسم بہت بھرا ہوا نہیں تھا نہ دبلا ہی تھا۔ بس جیسا ہونا چاہئے ویسا ہی تھا۔ خدو خال میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی۔ بلکہ ناک حد سے کچھ بڑھی ہوئی ہی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے تیور مردانہ تھے۔ بڑا بے پروا ہنس مکھ اور نکتہ سنج نوجوان تھا۔ وہ رضیہ کی طبیعت سے خوب واقف تھا۔ رضیہ کو مرمٹنے والے عاشق بالکل پسند نہ تھے۔ اس کے دل پر تو کوئی کھردرے ہاتھوں والا جابر شخص ہی حکومت کرسکتا تھا۔ اسے بکری کی طرح ممیا ممیا کر باتیں کرنے والے نوجوان ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔ وہ صحت ور، بے باک، نڈر، بے پروا اور البیلے لڑکوں کو پسند کرتی تھی۔ اور یہ صفات جلیل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔

جب کبھی وہ ان کے ہاں آتا تو بلند آواز میں ہانک لگا کر کہتا۔'' رجو! کہاں

گھسی پڑی ہو؟''

وہ لڑکیوں پر بڑی کڑی نکتہ چینی کرتا تھا۔ وہ کہتا۔'' نہ معلوم یہ لڑکیاں اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں۔ مشہور فلسفی شو پنہار نے کہا ہے کہ یہ تنگ شانوں والی پست قامت مخلوق مجھے قطعاً پسند نہیں۔ یہ ہے بھی درست۔ کم از کم میں شو پنہار کی حمایت کرتا ہوں۔ لڑکیاں اس قدر خوشامد پسند ہوتی ہیں کہ لڑکے ہزار ان کی خوشامد کریں۔ لیکن سیدھے منہ بات کرنے کی روا دار نہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ لڑکیوں کو ایک سرے ہی سے منہ نہ لگایا جائے۔ لڑکوں کی بلا سے ان کی قدر کرنا ان کے غرور میں بے جا اضافہ کرنا ہے۔''

اس بات پر دونوں میں خوب تو تو میں میں ہوتی۔ چونچیں بھڑتی۔ لیکن وہ دونوں بھی اس جھگڑے کا حل نہ پیش کر سکے۔

وہ رضیہ کی طرف مخاطب ہو کر کہتا۔'' اپنی ہی صورت ملاحظہ فرما لیجئے۔ معلوم ہوتا ہے خدا نے بچی کھچی مٹی تھوپ تھاپ کر آپ کی صورت گھڑ دی بندر دیکھے تو ڈر کر بھاگے۔''

اس پر وہ دونوں سٹپٹا کر رہ جاتیں۔ اس کی یہ دیدہ دلیری ان کی قوت برداشت سے باہر تھی۔ نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ایسی موہنی صورت پر یہ آوازے سراسر اس کی زیادتی تھی۔

وہ شاعر بھی تھا۔ اچھے خاصے شعر کہہ لیتا تھا۔ کالج بھر میں شیطان کی طرح مشہور تھا۔ کالج میں کوئی مشاعرہ اس کی سرشت کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

جب کبھی مشاعرے کے بعد ان کے گھر پر آتا تو رضیہ تو خیر خاموش رہتی البتہ وہ خود کہتی۔''جمیل بھیا! اپنی تازہ غزل تو سناؤ۔ وہی جو تم مشاعرے میں پڑھ کر آئے ہو۔''

وہ ہاتھ گھما کر کہتا۔'' بھئی رضیہ سے کہو میرے پاؤں پکڑیں اور ناک رگڑیں تو پھر سنا ہی دوں دو چار اشعار۔''

اس پر رضیہ آگ بگولہ ہو کر کہتی۔'' میری جوتی بھی تمہارے سامنے ناک نہیں

رگڑتی۔"

وہ منت کرتی۔ بھیا سنا دو۔"

جلیل کہتا۔ "تو رجو کو نکالو۔ نہیں تو سارے اشعار یہی سن لے گی تو پھر تم کیا سنو گی۔"

اس پر رضیہ تان کر کہتی۔ سنوں گی۔ میں کمرے سے باہر کیوں جاؤں؟"

" او ہو تو اس قدر اشتیاق ہے تمہیں....."

اس پر میاں جلیل کو کرسی پر بٹھا دیا جاتا۔ لیکن وہ ایک سیکنڈ کے لیے نچلا نہ بیٹھ سکتا۔ کرسی پر کاک کی طرح پھدکتا تھا۔ شریرا کیسے آنکھیں مٹکاتا تھا۔ کیسے بازو ہلاتا۔ کیا کیا اشارے کرتا تھا۔

وہ شعر پڑھتے وقت دفعتاً رضیہ کی طرف رخ کر کے بڑی میٹھی نظروں سے اسے دیکھنے لگتا۔ اور پھر جوں ہی رضیہ کے نازک لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہوتی وہ ٹھینگا دکھا کر چھت کی طرف دیکھنے لگتا اور شعر پڑھتا۔

ابھی ہونے کو ہے ارشادِ اعلیٰ
تبسم لب پہ آتا جارہا ہے

اس شعر پر رضیہ کی نسائیت جاگ اٹھتی۔ وہ پندار اور خود پسندی خاک میں مل جاتی۔ اور وہ اپنی شکست کا راز افشا ہوجانے کے ڈر سے پہلو بدل لیتی۔ اور وہ شریر پھر پڑتا۔

وہ جتنا بھی تغافل کر رہے ہیں
جلیل اتنا ہی متا جارہا ہے

اگرچہ رضیہ نے کبھی کھل کر بات نہیں کی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ رضیہ کو اگر جلیل سے عشق نہیں تو وہ کم از کم اسے پسند ضرور کرتی ہے۔ ایک مرتبہ جب رضیہ گھر کی چھت پر بیٹھی نہا رہی تھی۔ اوپر سے وہ جا پہنچی۔ اس نے رضیہ کو دیکھ کر کہا۔ " رجو!

موئی تجھ پر تو جوبن پھٹ پڑا ہے.....'' اور پھر اس نے کالج میگزین میں سے جلیل کا فوٹو دکھا دیا۔

اس پر اس نے شرما کر منہ پھیر لیا۔ لیکن پیشانی پر بل نہ ڈالا۔

گاڑی انبالہ کے اسٹیشن پر رکی۔

ایک مرتبہ پھر غل پڑا۔ اس بھگدڑ میں زینت نے رضیہ پر نگاہ رکھی۔ تاکہ وہ کہیں اِدھر اُدھر نہ ہوجائے۔ اتنے میں اس کا شوہر بھی آ گیا۔ اس نے جلدی سے بچی شوہر کی گود میں دیتے ہوئے بتایا کہ میری ایک سہیلی گاڑی سے اتری ہے۔ ذرا اس سے ملوں گی۔

رضیہ بھی اترنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ زینت گاڑی سے اتر کر پلیٹ فارم پر اس کا انتظار کرنے لگی۔ قلی اس کا سامان لیے ہوئے اترے۔ اس نے برقعہ بے پروائی سے سر پر ڈال لیا تھا۔ چہرہ کھلا ہی تھا۔

زینت یک بیک اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ دونوں کی نظریں ملیں اور دوسرے لمحہ میں رضیہ اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ دونوں سسکیاں لینے لگیں..... اف کتنے عرصہ بعد ملی تھیں دونوں سہیلیاں۔

زینت کے شوہر نے دور سے پکار کر کہا۔ '' ویٹنگ روم میں چلے جایئے نا— وہاں اطمینان سے باتیں کیجئے گا۔''

وہ دونوں باتیں کرتی ہوئی جلدی جلدی ویٹنگ روم میں داخل ہوگئیں۔ زینت نے اس سے ملنے کے اشتیاق میں اس کی جستجو کی داستان شروع کردی جب شکوے اور شکایتیں ہوچکیں۔ تو پھر دونوں نے ایک دوسرے کے حالات دریافت کرنے شروع کیے— آہا دونوں اس وقت کس قدر مسرور تھیں۔

تھوڑی دیر بعد زینت کے شوہر نے چائے بھجوا دی۔ وہ دونوں کھڑکی کے قریب

کھڑی تھیں۔ انہوں نے چائے کا ٹرے بھی اسی جگہ رکھ لیا۔ زینت ٹوسٹ پر مکھن لگاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بہن رجو! تیری شادی کی خبر سن کر دل کو بہت رنج ہوا۔ آخر اصل بات کیا تھی۔''

رضیہ نے بڑی تفصیل کے ساتھ بتایا کہ جب اس کے ابا کالج کی نوکری چھوڑ کر کوئٹہ میں بیوپار کرنے لگے تو ناتجربہ کاری کی وجہ سے ان کو سخت گھاٹا اٹھانا پڑا۔ اس کے موجودہ خاوند کی ابا سے راہ و رسم تھی۔ بوڑھے میاں نے اسے کہیں دیکھ پایا۔ بس ریشہ خطمی ہوگئے۔ ابا کی مالی حالت کمزور دیکھ کر اپنی خدمات پیش کیں۔ اور ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسے ان کی بیوی بننا پڑا۔

زینت بڑے غور سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ اس کا دل بڑا دکھی ہو رہا تھا۔ یہی وہ رضیہ تھی جو ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ جو اچھے سے اچھے نوجوان کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جو ہر لڑکے میں کوئی نہ کوئی عیب نکال کر اس کا مذاق اڑاتی تھی۔

لیکن رضیہ کے چہرے سے تفکرات یا خرابیٔ صحت کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ وہ پہلے ہی کی طرح چلبلی اور خوش مزاج تھی......تھوڑی دیر بعد ایک سترہ اٹھارہ برس کا بہت ہی حسین اور طرح دار لڑکا ڈینگ روم میں داخل ہوا گورا چٹا رنگ تھا۔ وہ ایسے شباب کا نمونہ تھا ایک مرتبہ اگر نظر اس پر جا پڑے تو پھر انسان کے لیے دوسری طرف دیکھنا ہی ناممکن تھا۔ اس کے جسم میں غضب کی تازگی تھی۔ مسیں بس بھیگ ہی رہی تھیں۔ وہ سادہ سفید رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ زینت تو اس کا منہ ہی دیکھتی رہ گئی۔ وہ آتے ہی بولا۔ میاں صاحب کار میں بیٹھے انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے سامان رکھوا دیا ہے۔''

''ابھی آتی ہوں۔'' نوجوان نے اپنی سحر انگیز نگاہیں جھکالیں۔ اور واپس چلا گیا۔

زینت نے پوچھا۔ ''یہ لڑکا کون تھا۔''

رضیہ کچھ سراسمہ سی ہوگئی۔ دوسرے لمحے میں وہ سنبھل گئی۔ ''یہ ...... میرا...... ہمارا نوکر ہے۔''

پھر انہوں نے ایک دوسرے کے پتے لکھ لیے جلد از جلد ملنے کے عہد و پیمان ہوئے۔ رخصت ہونے سے پہلے زینت نے رضیہ کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور اس کے چہرے کی طرف تاکنے لگی۔

وہ اس کے چہرے سے کس قدر مانوس تھی۔ جن لوگوں سے انسان کو دلی محبت ہو۔ ان کی صورتیں ہمیشہ ہی پیاری معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر وہ عزیز واقعی حسین ہو تو پھر......اب رضیہ کے چہرے کی رنگت پہلے کی نسبت زیادہ نکھری ہوئی تھی۔ آنکھیں اور بھی بدمست ہوگئی تھیں۔ ہونٹوں سے شراب چھلکتی تھی۔ اس کا جسم اور شخصیت کی کشش کہیں زیادہ ہوگئی تھی۔

رضیہ نے پوچھا۔ ''میری طرف اتنے غور سے کیوں دیکھ رہی ہو؟''

زینت اس سے بغل گیر ہوگئی۔ اس کے جسم کے لمس سے اس پر نشہ طاری ہوگیا ''رضو! تجھے مطمئن دیکھ کر بہت ہی مسرور ہوں۔ میں بہت فکر مند تھی۔ سچ مانو جب میں نے اپنی جان سے عزیز سہیلی کی بے جوڑ شادی کی خبر سنی تو......''

جیسے مال و دولت سے صرف عورت ہی کا حسن و شباب خریدا جاسکتا ہو......

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

ہمارا مکان

میں چھوٹی بہو تھی۔ اس لیے گھر کے باقی لوگ تو کاموں میں مصروف تھے۔ میں گٹھری بنی چار پائی پر بیٹھی تھی۔ کچھ سامان آچکا تھا۔ باقی آرہا تھا۔ ٹھیلے والوں کی ریل پیل تھی۔ آخر گھر کا سامان بھی تو خیر سے کچھ کم نہ تھا۔

میری نند از حد شوخ تھی۔ گھر میں اس کی آواز گونجتی یا میرے سسر جی کی۔ نند کی بات بات میں ٹھٹھول تھا۔ تیکھے نقوش اور پھر خوب صورت اس کی زبان اس قدر شیریں اور عادات اتنی پسندیدہ تھیں کہ اس کا مذاق کرنا دل کو برا نہ لگتا تھا۔ شادی کے موقع پر لڑکیوں کے دل میں پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔ ہمارا سوشل نظام ہی کچھ اس قسم کا ہے کہ قباحتوں کا پیدا ہونا غیر معمولی بات نہیں۔ شادی سے پہلے ہی مجھے اس بات کا علم ہوگیا تھا کہ سسرال والوں کا بہت بڑا کنبہ ہے اور میرے سسر پرانے خیالات کے شخص تھے۔

مجھے کچھ آزادی کی ہوا لگ چکی تھی۔ لیکن زیادہ نہیں۔ میری حالت یہ تھی کہ اگر کوئی مغربی خیالات کا گھرانہ مل جاتا تو اس میں بھی میرا گذارا ہوسکتا تھا۔ اور رجعت پسند گھرانے میں بھی میری نبھ سکتی تھی۔ لیکن مستقبل پر تاریک پردے پڑے ہوئے تھے۔ دل دھک دھک کرتا تھا کہ دیکھیں پردۂ غیب سے کیا چیز ظاہر ہوتی ہے۔ جب پتی دیو کو دیکھا تو وہ معمولی خدو خال کے صحت ور شخص تھے باتونی نہ تھے۔ حالانکہ میں باتونی اور

چنچل طبیعت کی لڑکی ہوں۔ لیکن نو عمر ہونے کے باوجود ان کا مزاج چلبلا نہیں۔ یوں تو ہر وقت ہنستے رہتے ہیں۔ بڑے پیارے لگتے ہیں میں تو انہیں بس دل بہلاوے کا کھلونا مل گئی ہوں۔ ہر دم میری خاطر داری منظور ہے۔ ہر وقت میری چھوٹی سے چھوٹی تکلیف دور کرنے کے خیال میں سدھ بدھ گنوائے رہتے ہیں۔

میرے پتی دیو کی اس ہر وقت کی دیکھ بھال اور حد سے بڑھی ہوئی خاطر داری پر بڑی نند خوب طنز کرتی ہے۔ داہنا ہاتھ سیدھا کر کے اکڑی ہوئی انگلیوں سے ان کی چھاتی میں کچوکے دیتی ہوئی کہتی ہے۔" میرے بھولے بھیا! اپنی پتنی کا بھی کچھ خیال کیا کر...... ہائے رام کیسی چاندی سی بہو ہے...... ہاتھ لگائے سے میلی ہوتی ہے۔ لیکن بھیا تیرے کٹھور دل پر اس کے کنول نینوں کا کچھ اثر ہی نہیں ہوتا۔ اگر کبھی میں تیری جگہ ہوتی تو اپنی روپ وتی پتنی کے پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ سارا سارا دن اس کی خاطر داری میں اسی کے ارد گرد گھوما کرتی۔ گھر کے اور کام تو بھول ہی جاتی......"

میرے پتی دیو واقعی بڑے بھولے بھالے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ بہن یہ باتیں طنز کے طور پر کہہ رہی ہے۔ بلکہ وہ یہی خیال کرتے کہ واقعی میری خاطر داری پورے طور پر نہیں ہو رہی۔ چناں چہ بڑی بہن کے منہ سے یہ الفاظ سن کر وہ شرم سے سر جھکا لیتے۔ اس پر بڑی نند پر معنی نظروں سے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگتی۔ میں اس کا مطلب پا لیتی اور جھینپ کر گھٹنوں میں منہ چھپا لیتی۔ اس پر بڑی نند پھر کہتی۔" ارے بھیا! بس یہ سمجھ لے کہ تیری پتنی تیری نسبت زیادہ سمجھ دار ہے۔"

میرے پتی دیو یہ بات بھی قبول کر لیتے۔ ان کے دماغ میں تمرّد کی بو تک نہ تھی۔

اب ہم نے گھر تبدیل کیا تھا۔ یہ گھر کا مسئلہ بھی بڑا پیچیدہ تھا۔ ہر سال نیا گھر تبدیل کرنا پڑتا تھا۔ پہلے گھر سے سامان ٹھیلوں پر لدا چلا آ رہا تھا۔ سب سے پہلے بڑی نند، چھوٹی نند، وہ اور میں تانگہ پر بیٹھ کر سامان کے ساتھ ساتھ آئے۔ سرِ دست سامان بیٹھک میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک کونے میں چار پائی پر میں چھوٹا سا گھونگٹ نکالے دیوار کی طرف منہ کیے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ میری دونوں نندیں باورچی خانے میں سامان درست کر رہی تھیں۔ تاکہ دوپہر کا کھانا پک سکے۔ چھوٹی نند نے پکار کر کہا۔" بھابی!

سامان کا خیال رکھنا کوئی کچھ اٹھا کے نہ چلتا بنے۔"

وہ بھی دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے۔ بڑی نند نے کہا۔ "بھیا! تم اور کوئی کام مت کرنا۔ دروازے ہی پر کھڑے رہنا کہیں ایسا نہ ہو کوئی شخص دھرم پتنی کو اٹھا کر چل دے۔"

پتی دیو یہ بات سن کر بڑے حیران ہوئے۔ انہوں نے ذرا گھبرا کر بہن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "نہیں نہیں — یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

اس پر بڑی نند ہنس پڑی۔ مجھے بھی ہنسی آ رہی تھی — ہائے کیسا اچھا گھرانا ہے۔ کوئی لمحہ ہنسی مذاق کے بغیر نہیں گذرتا۔ کیسی نیک آتمائیں ہیں۔ ساس نے منع کر دیا تھا کہ چھوٹی بہو سے کوئی کام نہ لیا جائے چناں چہ میرے دبے دبے اصرار کے باوجود بڑی نند نے مجھے کھاٹ سے اٹھنے ہی نہ دیا۔ یہی نہیں بلکہ تھوڑی دیر بعد بڑی نند میرا دل بہلانے کو کام کاج چھوڑ کر ادھر آ نکلتی تھی۔ اور کوئی نہ کوئی ہنسی مذاق کی بات بھی کہہ جاتی۔

کچھ وقفے کے بعد بڑی نند آئی اور ان سے کہنے لگی۔ "بھیا! تمہیں اتنا بھی خیال نہیں کہ بے چاری بے زبان پتنی صبح سے بھوکی پیاسی بیٹھی ہے۔ کچھ کھانے کو لا دونا!"

میں بہت گھبرائی۔ باقی سب کو صبح سے کچھ کھانے کو نہ ملا تھا۔ اس لیے میرا کھانا کس قدر معیوب تھا۔ میں منہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ جھوٹ کچھ لانے پر آمادہ ہوگئے۔ بڑی نند پکار کر بولی۔ "ہاں ہاں جاؤ۔ تھیلے تو خیر آتے ہی رہیں گے۔ فکر بھی کیا ہے ان کاموں کے لیے کچھ کھانے کے لیے لاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ بے چاری......"

پھر نند میری طرف دیکھ کر دل فریب انداز میں ہنس پڑی۔ شرم کے مارے میں سمٹی جا رہی تھی۔ وہ دروازے سے باہر نکل گئے۔ بڑی نند نے پکار کر کہا۔ "اس کونے والے حلوائی سے ایک سیر گرم گرم جلیبیاں اور آدھ سیر دودھ۔"

مجھے وہ کھڑکی کے آگے سے لپک کر جاتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں چیخ کر انہیں روکنا چاہتی تھی۔ لیکن دل مسوس کر رہ گئی۔ جی میں تہیہ کر لیا کہ اب اکیلے بیٹھیں

گے تو میں انہیں سب باتیں اچھی طرح سمجھا دوں گی۔ بڑی نند میرے قریب آ کر بولی.
'' بہو رانی! تیرا تو بس بہانہ تھا۔ در اصل جب ہم ادھر سے آ رہے تھے تو نکڑ پر حلوائی کے ہاں گرم گرم جلیبیاں اتر رہی تھیں۔ کیسی خستہ اور مرمری...... میرے منہ میں پانی بھر آیا......''

تھوڑی دیر بعد دونوں نندوں نے مل جل کر دودھ جلیبیاں مجھے کھلائیں اور کچھ خود کھائیں۔ ''ان'' کو بھی ایک آدھ جلیبی مل گئی۔

تھوڑی دیر بعد ساس جی بھی آ گئیں۔ دبلی پتلی بیماری۔ ایک پلنگ پر ان کے لیے بستر بچھا دیا گیا تھا۔ آتے ہی لیٹ گئیں میں جلدی سے ان کے پلنگ کے قریب پہنچی۔ ان کی ٹانگیں دبانے کے لیے ہاتھ بڑھائے ابھی میری انگلیاں ان کی ٹانگوں سے چھو ہی پائی تھیں کہ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ اور مجھے بیٹھے دیکھ کر انہوں نے ٹانگیں پیچھے ہٹالیں۔ ''اری بہو رانی! تو میری ٹانگیں کیوں دباتی ہے۔ جا رانی آرام کر۔ میری خدمت کو تو ابھی عمر پڑی ہے۔ ابھی سے خدمت شروع کر دی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی۔''

بڑی نند بھی آ گئی۔ ساس جی بولیں '' دیکھی میری بہو رانی کی بات بھلا کوئی دیکھے تو کیا کہے یہی نا آتے ہیں چاندی دلہن سے خدمت لینی شروع کر دی۔ میری بٹی تمہارے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ ابھی تو ہم ہی تمہاری خدمت کروں گی۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کے بار بار اصرار کرنے پر میں واپس اپنی کھاٹ پر آن کر بیٹھ گئی مجھے اس طرح بے کار بیٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن وہاں تو گھر کے سبھی افراد میری خدمت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جو بڑوں کی مرضی تھی۔ سو چھوٹوں کی کسی کی کیا مجال جو دل میں ذرا برابر میل بھی آئے۔ اتنے میں سسر جی بھی آ گئے۔ ان کی آمد کا دور ہی سے پتہ چل جاتا تھا۔ گھر کے تقریباً سبھی افراد دبلے پتلے اور اعصابی کمزوری میں مبتلا تھے۔ ان کے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ انہوں نے لمبی داڑھی چھوڑ رکھی تھی۔ لیکن رنگ سرخ تھا۔ بالکل جوانوں کی طرح تن کر چلتے تھے۔ ہاتھ

میں ایک بڑا سا لٹھ تھامے رکھتے تھے۔ ہر وقت ہنستے رہتے۔ خفا ہونا تو جانتے ہی نہ تھے۔ گھر کے سبھی لوگ ان کا منہ دیکھتے تھے۔ کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر نہ کیا جاتا تھا۔

پہلے سسر جی بڑے مال دار شخص تھے۔ لیکن چند سال ادھر کی بات ہے کہ فلم کمپنی چلانے کے چکر میں پڑ گئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس لائن میں بہت روپیہ کمایا جاسکتا تھا۔ لیکن ناتجربہ کاری اور چند خود غرض لوگوں کی وجہ سے بڑا گھاٹا اٹھانا پڑا۔ ساری پونجی اسی کاروبار میں تباہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ شہر میں آبائی مکان بھی بیچ دینا پڑا۔ اگر کسی اور شخص کو اس عمر میں اس قدر گھاٹا اٹھانا پڑتا تو یقیناً اس کی کمر ہمت ٹوٹ جاتی۔ لیکن سسر جی کی پیشانی پر بل نہ آیا۔ گھر کے باقی لوگ جس قدر جلدی پریشان ہوجاتے تھے۔ ان کے مقابلے میں سسر جی اس قدر بلند ہمت تھے۔ میں نے سنا ہے کہ تاریک دنوں میں بھی انہوں نے سب کی ہمت بندھائے رکھی۔ جنگ کے شروع ہوجانے پر انہوں نے دھوڑ دھوپ کر کے ادھر اُدھر کے ٹھیکوں میں پھر روپیہ پیدا کر لیا۔ اور اب نیا مکان بنوانے کی فکر میں تھے — وہ بڑے خوش مزاج تھے۔ بات بات میں قہقہے لگاتے بڑی بلند آواز میں بولتے گھر کے ہر فرد سے بات چیت کرتے۔ ہر ایک کی شکایت سنتے اور ہر ایک کی تکلیف کا خیال رکھتے۔

اب کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگے۔ ''واہ وا! کس قدر شان دار مکان ہے۔ اسے تو بنگلہ کہنا چاہئے بنگلہ......''

پھر انہوں نے بڑی تفصیل سے اس مکان کے اوصاف گنانے شروع کیے۔

نیا مکان کسی وکیل صاحب کے مکان کا پچھلا حصہ تھا۔ اگلا حصہ ان کے اپنے تصرف میں تھا۔ اور پچھلا انہوں نے کرایہ پر دے ڈالا۔ سسر جی چھوٹی بیٹی سے مخاطب ہو کر بولے۔ '' کہو نرملا مکان پسند آیا۔ بھئی مجھے تو بہت پسند ہے۔ آہا کتنا وسیع صحن ہے۔ طویل برآمدہ۔ کس قدر کشادہ کمرے ہیں۔ اوپر کی بیٹھک بھی خوب ہوا دار ہے۔

یہ بیٹھک چھوٹی بہو کے لیے اچھی رہے گی۔'' باہر گھاس کا خوب صورت لان اور بیڈمنٹن کورٹ۔ گھر کے لوگ مزے میں باہر کرسیاں بچھا کر بیٹھ سکتے ہیں۔ گرمیوں میں سونے کے لیے بھی باہر بہت شان دار جگہ ہے۔ کیا خوب! پہلا مکان بڑا تنگ تھا۔ کمرے چھوٹے۔ صحن نہ ہونے کے برابر اور پھر چھت پر؟ آخ تھو۔ جب بھی اوپر سوتے مارے سڑاند کے دماغ خراب ہوجاتا تھا۔''

میں سمجھتی ہوں کہ پہلے مکان میں سو خوبیوں کی ایک خوبی تو یہی تھی کہ اس کا کسی اور سے کچھ تعلق نہ تھا۔ جو کچھ تھا علاحدہ تھا۔ ہم کسی جگہ بھی گھومیں یا بیٹھیں کسی کو کوئی اعتراض کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ اگر چہ جگہ تنگ ضرور تھی۔ لیکن اس میں اور صفات بھی تو تھیں۔ نئے مکان میں سب سے بڑی مشکل تو یہی تھی کہ یہ مالک کے رہائشی مکان کا ہی ایک حصہ تھا۔ آنے جانے کا پھاٹک بھی مشترکہ تھا جس کی وجہ سے سو طرح کی قباحتیں پیدا ہوسکتی تھیں۔ لیکن مسر جی ہر نئے مکان کے گن گاتے اور جس مکان کو چھوڑنا پڑتا اس کی برائیاں بیان کرتے۔'' پچھلے مکان میں تھے تو اس کی تعریف کے پل باندھا کرتے۔ اور اس سے پہلے والے مکان کی اکثر برائیاں کرتے۔ کہتے۔'' بہو رانی! اگر کہیں تمہیں اس مکان میں رہنا پڑتا تو یقیناً تم پریشان ہوجاتیں۔ گوکل کی شادی پر مجھے یہی فکر مارے ڈالتی تھی۔ میں دن رات یہی سوچتا تھا کہ نئی بہو آئے گی۔ بڑے گھر کی بیٹی آخر وہ اس مکان میں رہے گی کیوں کر۔ بس بیٹی کوئی اچھے کرم کیے تھے ہم نے جو یہ مکان مل گیا۔

پچھلے مکان کے اوصاف کی فہرست بھی کافی طویل تھی۔ لیکن وہاں مالک مکان سے یوں ہی جھگڑا ہوگیا۔ باہر کے دروازے کے قریب سیمنٹ کا بنا ہوا گڑھا تھا۔ گھر کی ساری غلاظت اسی میں جمع رہتی تھی۔ وہ تختہ جس سے یہ گڑھا ڈھکا رہتا تھا۔ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس پر مسر جی نے مالک مکان سے شکایت کی۔ وہ نیا پختہ بنوانے سے کتراتا تھا۔ چناں چہ ایک دن کڑوی کسیلی باتیں ہوئیں اور سسر جی نے تہیہ کر لیا۔ وہ اس مکان میں

نہیں رہیں گے۔ چناں چہ اب یہ نیا مکان ڈھونڈھ نکالا۔ جس دن یہ مکان ملا۔ خوش خوش گھر گئے۔ اور یہ مژدہ خوب چٹخارے لے لے کر سنایا۔ دوسرے ہی دن ہم نے مکان بدل لیا۔ چناں چہ اب نئے مکان میں اٹھتے بیٹھتے سسر جی کی تعریف کے گیت گاتے۔

اسٹور روم کے اوپر والا کمرہ سسر جی نے میرے لیے مخصوص کردیا تھا۔ یہ کمرہ مجھے بھی بہت پسند آیا۔ خصوصاً سردیوں کے لیے تو بہت ہی اچھا تھا۔ ایک بڑا سا دروازہ پانچ کھڑکیاں اور دو روشن دان خوب صاف اور ہوا دار کمرہ تھا۔ اس جگہ لکھنے پڑھنے کی بڑی سہولت تھی۔ کمرے کے آگے چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ سردیوں میں دھوپ کھانے کے لیے انسان اس جگہ سب کی نظروں سے ہٹ کر بیٹھ سکتا تھا۔ فرش سرخ سیمنٹ کا بنا ہوا تھا۔ تاہم اس پر چٹائی اور دری بچھا دی گئی۔ دیواروں پر میں نے اپنی پسند کی تصویریں لٹکا دیں۔ ایک طرف پلنگ ایک کونے میں میز۔ دو کرسیاں بازوؤں والی۔ ایک کپڑے کی آرام کرسی۔ اس کمرے میں سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ دفعتاً کسی کے آجانے کا اندیشہ نہ تھا۔ انسان اپنے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں بے پردہ بھی بیٹھ سکتا تھا۔ صرف ایک دقت تھی وہ یہ کہ اوپر آنے کے لیے بانس کے ڈنڈوں کی سیڑھی تھی۔ خصوصاً اگر کوئی صحن میں بیٹھا ہوا ہو تو اور بھی زیادہ مشکل پیش آتی تھی۔

رفتہ رفتہ ہم اس گھر سے مانوس ہوگئے۔ شروع شروع میں دو تین دقتیں پیش آئیں۔ ایک تو صحن کی دیوار کی دوسری طرف ایک کچی سڑک تھی۔ اس پر ہمیشہ لاریوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ دن رات ان کی گھڑگھڑاہٹ سے اعصاب پر بہت برا اثر پڑتا تھا۔ اور پھر ان کی وجہ سے گرد کے بادلوں کے بادل اڑتے اور گرد سیدھی ہمارے گھر کے اندر چلی آتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ گھر کی ہر شے پر گرد کی تہ سی جمی رہتی تھی۔ ایک اور دقت یہ تھی کہ اندر والے کمرے اگرچہ کشادہ تھے لیکن کوئی روشن دان اور کھڑکی نہ ہونے کی وجہ سے ان میں تاریکی ہی تاریکی تھی۔ یہ مکان کے پچھلے حصے کے کمرے تھے۔ دراصل یہ رہائش کے لیے نہیں بنائے گئے تھے۔ دن کے وقت بھی مشکل تھا۔ ایک

بات اور بھی زیادہ پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی۔ وہ یہ کہ لان کے قریب ایک سائبان بنا ہوا تھا۔ وہاں مالک مکان کی گائے اور اس کا بچھڑا بندھے رہتے تھے۔ خیر ان کا شور مچانا تو برداشت کرنا ہی پڑتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ ان کے گوبر کی صفائی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ مالک کو بس دودھ سے غرض تھی۔ گوبر کے ڈھیروں کے ڈھیر دنوں تک پڑے سڑتے تھے۔ ان کی ساری سڑاند ہمارے حصہ میں آتی تھی۔ اگر لان پر جا بیٹھیں تو مارے بو کے دماغ پھٹ جاتا تھا اور پھر مچھر الگ بھنبھناتے تھے۔ خیر لان پر بیٹھنا تو ہم ترک بھی کرسکتے تھے۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ گھر سے باہر آتے جاتے وقت بو کے بھبکے نتھنوں میں گھستے رہتے تھے — یہ آغاز تھا۔

شاہراہ عام کی طرف ایک ہی پھاٹک کھلتا تھا۔ چناں چہ ہمیں وکیل صاحب کے رہائشی حصے سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ یہ بھی ایک ناگزیر امر تھا۔ وکیل صاحب کچھ بیمار بھی رہتے تھے۔ ہر وقت برآمدے میں ڈٹے رہتے۔ آنے جانے والوں کو ان کا گھناؤنا چہرہ دیکھنا پڑتا تھا۔ اور وہ بھی بیماری کی وجہ سے برا سا منہ بنائے یوں ہی سفید سفید دیدے دکھاتے ہوئے ہر آنے والے کو گھورتے۔ ہمارے گھر میں زیادہ پردے کا رواج نہیں۔ اور خصوصاً میں پردے کی پابند نہیں۔ اور نہ گھر کے لوگ اس کو برا ہی سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پڑھی لکھی اتنی آزادی تو ضرور اختیار کر لے گی۔

میری نئی پریشانی کا باعث وکیل صاحب کا لڑکا تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا، قبیح صورت سا اٹھارہ انیس برس کا نوجوان شخص تھا۔ مکان کے کونے میں اس کا کمرہ تھا۔ اس کا معمول یہ تھا کہ بجائے اندر کے رخ والا دروازہ کھولنے کے وہ باہر والا دروازہ کھلا رکھتا تھا۔ وہ ایک باریک سی دھوتی اور ململ کی قمیص پہنے ہوتا۔ بید کی کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں پھیلا کر سامنے اسٹول پر رکھ دیتا۔ اور پھر بنگالی زبان میں کوئی گیت گایا کرتا تھا۔ اس طرح بیٹھنے سے اس کی دھوتی میں سے اس کی کالی کالی عریاں رانیں بڑی بھدی دکھائی دیتی تھیں۔

مرد کے لیے دھوتی ایسا بے ہودہ لباس ہے کہ بعض اوقات انسان بے خبری میں بڑی بے شرمی کی حد تک عریاں دکھائی دینے لگتا ہے۔ یہی حال اس کا تھا اگرچہ اپنی حرکات و سکنات سے بظاہر وہ کسی کو دکھ نہ پہنچاتا تھا۔ اور نہ وہ بدمعاش ہی تھا۔ لیکن اس کے لجلجے جسم پر اس کا کالا بھجنگ سر اور پھر اس کی وہ پیلی پیلی متجسس آنکھیں جو ہر آنے جانے والے کا جائزہ ضرور لیتی تھیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی نظروں سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ہر شخص کے دل میں گھس کر کوئی چھپا ہوا بھید معلوم کرنا چاہتی ہیں۔ کبھی وہ اچھل ایک دم دروازے کے قریب آن کھڑا ہوتا۔ یوں ہی بہکی بہکی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ اگر ہمارا کوئی ملنے والا آجائے یا اسے کوئی غیر مانوس آواز سنائی دے جائے تو وہ تاک جھانک کرنے سے باز نہ رہتا تھا۔ وہ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتا۔ جیسے وہ سب لوگ چور یا گرہ کٹ ہوں۔ اس کی بے معنی نظریں بڑی نفرت انگیز تھیں۔ اس کے ہونٹ ہمیشہ تر رہتے تھے۔ وہ تکلیف دہ حد تک احمق شخص تھا۔

ایک دن میں نے ساس جی سے اس بات کا ذکر کیا۔ انہوں نے سسر جی سے کہا۔ میں نے بھی سمجھا دیا ہے کہ وہ لڑکا بدمعاش نہیں لیکن اس کا ہر وقت سر راہ بیٹھے رہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور پھر اس کی ہر وقت کی تاک جھانک بھی مناسب نہیں۔ آخر اگر کوئی ہمیں ملنے کے لیے آئے تو اسے ان کی طرف گھور گھور کر دیکھنے کا، نیز کان دھر کر ہماری باتیں سننے کا کیا حق ہے۔ نہ ہم چور ہیں نہ ہمارے آنے والے اچکے۔

سسر جی نے یہ بات وکیل جی کو بہت نرم لہجے میں کہہ دی۔ وہ اپنے برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ یہ سنتے ہی اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے اس کی یہ حرکت دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور ہنسی بھی آئی۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر کہنے لگا۔ "کیوں صاحب کیا میرا لڑکا بدمعاش ہے۔ جناب پندرہ برس سے میں اس مکان میں رہتا ہوں۔ اس لڑکے سے بڑے لڑکے بھی یہیں جوان ہوئے ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے ہماری فیملی پر یہ الزام نہیں دھرا تھا...... ابھی کل آپ میری لڑکی پر اور پرسوں مجھی پر کوئی تہمت لگائیں گے۔"

سسر جی نے سمجھانے کی بہتری کوشش کی۔ کہ وہ لڑکا جیسا آپ کا ویسا ہمارا وہ بڑی خوشی سے ہمارے ہاں آئے بیٹھے، کھیلے، کوئی ہرج نہیں لیکن صاحب ہمارا اعتراض ہی کچھ اور ہے۔ آپ خود سمجھ دار ہیں......"

لیکن وکیل کے سر پر تو بھوت سوار تھا۔ اس نے اسی وقت اپنے لڑکے کو آواز دے کر بلایا۔ " دیکھ مکر جی! اگر تو نے پھر کبھی ادھر کا دروازہ کھولا تو یاد رکھیو مار کر ہڈیاں توڑ دوں گا۔ سمجھا...... واہ جی واہ...... ہمارا گھر اور ہم......"

خیر کسی نہ کسی طرح خلاصی تو ہوئی۔ اب وہ اس دروازے کو بند رکھنے لگے۔ لیکن وکیل جی کے گنجے سر کے نیچے ان کی پیشانی پر پہلے سے بھی زیادہ گہری تیوریاں نظر آنے لگی۔ وہ "بل ڈاک" (کتے) کی طرح کرسی پر ٹانگیں سمیٹے کہنیاں گھٹنوں پر رکھے کچھ اس انداز سے بیٹھے رہتے جیسے ابھی اچھل کر کسی کو کاٹ کھائیں گے۔

سسر جی ان سے گائے کی گوبر کی شکایت بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن ڈر تھا کہ ان کا پارہ پھر اوپر نہ چڑھ جائے۔ بڑی خوش مزاجی سے وہ وکیل صاحب سے گفتگو کرنے کی کوشش کرتے تاکہ اگر کبھی وکیل کے لبوں پر مسکراہٹ کی جھلک نظر آجائے تو اس بات کا ذکر بھی کردیں۔ لیکن حضرت وکیل کے لبوں پر مسکراہٹ آنی تھی نہ آئی۔

بالآخر سسر جی نے دبی زبان میں بات کہہ ہی ڈالی۔ اس پر وکیل نے بڑی تلخ نظروں سے سسر جی کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سسر جی نے بڑی تفصیل سے گوبر کے بو کی داستان سنائی اور پھر آخر میں کہا کہ اگر آپ اجازت دیں تو ہم ہی اس کی صفائی کا انتظام کردیں —— وکیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن دوچار روز بعد وہاں کی صفائی شروع ہوگئی۔ اب ایک روز نیا ہی جھگڑا شروع ہوگیا۔ حالانکہ ہمارا یہ پکا ارادہ تھا کہ اب ہم مالک مکان سے کسی شے کا مطالبہ نہ کریں گے کیوں کہ وہ پہلے ہی ہمارے ہاتھوں تنگ آچکا تھا۔ اسے اور کچھ کہنا بے کار محض تھا۔ اس گھر میں ہم خود بڑی بے آرامی سے دن گذار رہے تھے۔ اندر والے کمرے تاریک تھے اور پھر ہر طرف سے بند۔ دھوپ اور ہوا

کا کبھی گذر تک نہ ہوتا تھا اس لیے ان کمروں میں ایک خاص قسم کا حبس پیدا ہوگیا تھا۔ کمروں میں محض سامان رکھ دیا گیا تھا۔ اور گھر کے لوگ عموماً برآمدے ہی میں بیٹھے رہتے تھے۔ برآمدہ بہت طویل اور عریض تھا۔ آگے صحن بھی کشادہ تھا۔ جب تک گرمیاں تھیں گذارا ہو رہا تھا۔

ایک روز بڑی بہو کسی کام سے چھت پر گئی۔ ہمارے کمروں کی چھت سے وکیل صاحب کی چھت بلند تھی۔ بڑی بہو نے وکیل کے کسی بچے کو اس طرف منہ کر کے پیشاب کرتے دیکھ لیا۔ یہ پیشاب موری میں بہہ کر ہماری چھت پر آن گرتا تھا۔ بڑی بہو نے نیچے آ کر یہ بات سب سے کہہ دی۔ آئندہ ہماری نظر بھی اسی طرف رہنے لگی۔ معلوم ہوا کہ وہ سب کے سب اسی جگہ پیشاب کرتے ہیں۔ اس پر ہم سب کو بہت غصہ آیا۔ بڑی بہو مزاج کی تیز ہے۔ اس نے ایک دن کسی کو پیشاب کرتے دیکھ کر کچھ کہہ دیا۔ اس پر جھگڑا بڑھ گیا۔ وکیل کا بڑا لڑکا ہمارے دروازے پر آن کر باتیں بنانے لگا۔ ادھر بڑی بہو اور ان کے پتی دیو کو بھی تاؤ آ گیا۔ خاصی جھڑپ ہوگئی۔ وکیل بھی اپنے لڑکے کی حمایت کرنے کے لیے آن پہنچا۔ سسر جی اندر بیٹھے تھے۔ شور سن کر باہر نکلے۔ تو وکیل غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا۔ ہم نے کرایہ دار کیا رکھے ہیں گھر میں شیطان کے بچے داخل کر لیے ہیں۔" اس پر ہم سب کو بڑا طیش آیا۔ سب چیخ چیخ کر وکیل کو صلواتیں سنانے لگے۔ اس پر وکیل کا غصہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا۔ یہاں تک کہ وہ شدت غضب میں جھنجھلا کر بے ہوش ہوگیا۔ اسے بلڈ پریشر بھی تھا۔ ہم ڈر گئے کہ کہیں کم بخت مر ہی نہ جائے۔ وکیل کی بیوی اور لڑکیاں اپنی چھت پر آن کھڑی ہوئیں۔ اور شور مچا مچا کر ہمیں کوسنے لگیں۔ وکیل کی بیوی نے ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "ڈائنو اگر میرے پتی کو کچھ ہوگیا تو یاد رکھنا۔"

بڑی مشکل کے بعد یہ ہنگامہ فرو ہوا۔

اب وکیل نے دوسری کارروائی شروع کی۔ اس نے ہر ممکن طریقے سے ہمیں

دق کرنا شروع کیا۔ بجلی کا بٹن ان کے برآمدے میں تھا۔ بس صبح ہوئی اور وہ بٹن دبا دیتا۔ یہاں ہم کو دن میں بجلی کے پنکھے کے علاوہ کمروں میں روشنی کی ضرورت بھی تھی۔ چناں چہ اس بات پر بھی خوب لے دے ہوئی۔ وکیل کہنے لگا۔'' آپ لوگ بجلی بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں۔'' یہ نئی مشکل پیش آئی۔ ہم نے بجلی سمیت گھر کا کرایہ طے کیا تھا۔

اب انہوں نے گوبر اٹھوانا بھی بند کردیا۔ بلکہ گھر کا اور کوڑا بھی اسی جگہ پھینکنے لگے۔ ہمیں بہت زیادہ تکلیف محسوس ہونے لگی۔ لیکن ان کے کان پر جوں تک نہ رینگتی تھی۔ ایک اور کمرے کے بارے میں انہوں نے نیا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ ہمارے حصے میں ایک چھوٹا سا کمرا بھی تھا۔ اس کا دروازہ باہر کی جانب کھلتا تھا۔ اس میں ہم نے ٹوٹا پھوٹا سامان رکھا تھا۔ باہر ایک معمولی تالہ لگا دیا تھا۔ ایک روز صبح ہی صبح وکیل کا لڑکا آیا۔ اس نے تالہ توڑ کر ہمارا سامان باہر رکھ دیا۔ اب از سر نو جھگڑا شروع ہوا وہ کہنے لگے۔ یہ کمرہ مکان کے اس حصے میں شامل نہیں۔ ہمیں اصرار یہ تھا کہ وہ اسی میں شامل ہے۔ نیز اتنے عرصہ تک ہمارا سامان بھی اسی جگہ پڑا رہا تھا۔

لیکن آخر کار ہم نے ہار مان ہی لی۔ اور اپنا سامان اندر لے آئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ ہم گھر چھوڑ دیں۔ ہمیں اور کوئی گھر ملتا ہی نہیں تھا۔

ایک مرتبہ وکیل کا طوطا گم ہوگیا۔ انہوں نے اس میں بھی ہماری ہی شرارت بتائی۔ کہنے لگے تم ہی نے طوطا لیا ہے۔ سیدھے ہاتھ سے نکال کر رکھ دو۔ ہم طوطا کہاں سے لاتے۔ اوّل تو ہم طوطا پالنے کے شوقین ہی نہیں تھے۔ اگر شوق ہوتا تو بازار سے تین چار آنے کا خرید کر لے آتے۔ ہم نے کہا ہماری تلاشی لے لو وکیل کے گھر کی عورتوں نے ادھر اُدھر تشہیر کردی کہ ہم نے طوطا اپنے نوکر کے ہاتھ کہیں بھجوا دیا ہے۔

شام کے وقت چوں کہ گرمی زیادہ ہوتی تھی۔ اس لیے ہم لوگ باہر گھاس پر کرسیاں بچھا کر بیٹھ جاتے تھے۔ سسر جی کہا کرتے تھے۔ بتاؤ یہ آرام پچھلے گھر میں بھی

تھا؟ آہا کیسی کھلی ہوا ہے۔ گھاس کی کیا سوندھی سوندھی بو ہے۔ جی چاہتا ہے اس گھاس پر لیٹے رہیں — جب آپس میں جھگڑا شروع ہوا تو انہوں نے یہ اعتراض کیا کہ یہ لان صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ آپ کے مرد اس جگہ کیوں بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مکان کے آگے کھلی جگہ موجود تھی۔ انہیں اس جگہ آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن انہیں تو ہم سے ضد تھی۔ آخر ہم نے ہار مان لی ہمارے مردوں نے اس طرف آنا بند کر دیا۔ لیکن سسر جی اصرار کرتے تھے کہ ہم عورتیں اس گھاس پر ضرور بیٹھا کریں تا کہ ایسا نہ ہو کہ وہ خود ہی اس کے مالک بن بیٹھیں اور مکمل قبضہ جمالیں۔ چناں چہ جب شام کے وقت ہم وہاں بیٹھتے تو وکیل کے گھر کی عورتیں بھی چارپائیاں ڈال کر ہم سے کچھ پرے بیٹھ رہتیں۔

ان کے ہاں ایک بہت ہی بدتمیز عورت آیا کرتی تھی۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگی بھی تھی۔ رنگ کچھ صاف تھا۔ لیکن وہ اپنے آپ کو بہت خوب صورت سمجھتی تھی۔ ایک دن جب ہم لان پر بیٹھی تھیں۔ پرلے سرے پر وکیل کی عورتیں بھی ہمیں گھور رہی تھیں۔ وہ بھینگی بھی آئی ہوئی تھی۔ اتنے میں بڑی بہو کے پتی کسی کام سے آئے ایک آدھ بات پوچھ کر چلے گئے۔ لیکن وہ عورتیں بڑے طیش میں آکر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ اور اپنے مکان میں پہنچ کر زور زور سے بولنے لگیں۔ خیر ہم نے کچھ جواب نہ دیا۔

ہم تو یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ بڑی بہو کے پتی جی کے آنے پر وہ خفا ہوگئی تھیں۔ لیکن بعد میں پتہ چلا کہ بھینگی کہتی تھی کہ بڑی بہو کے پتی جی نے اسے آنکھ ماری۔ اس کی یہ بے حیائی کی بات سن کر ہم نے کانوں پر ہاتھ دھرے۔

جب وہ ہمیں دق کرنے سے باز نہ آئے تو سسر جی نے پولس میں رپورٹ کر دی کہ مالک مکان ہمیں نکالنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ پولس آئی گواہ پیش ہوئے۔ وکیل کی کوئی چال کامیاب نہ ہوئی۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ وہ ہمیں مکان

سے نکال نہیں سکتا۔ تو وہ ایک مرتبہ پھر ہمارے مکان کے دروازے کے آگے آیا اور سر پیٹ کر بے ہوش ہوگیا۔

ساس جی روز روز کے جھگڑے سے اس قدر پریشان ہوگئیں کہ انہوں نے سسر جی کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے کہ یہاں سے کسی نہ کسی طرح نکلو۔

آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مکان ملا۔ فوراً سامان اس طرف منتقل کر دیا گیا۔ تین چار ماہ کے اندر اندر ہم ایک نئے مکان میں پہنچ گئے۔

یہ مکان ایسی جگہ پر واقع تھا۔ جہاں پہنچ کر گلی ختم ہوجاتی تھی۔ آگے دیوار تھی۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک پروفیسر صاحب کا مکان تھا۔ گھر میں داخل ہوتے وقت داہنے ہاتھ کو ایک بڑی سی بیٹھک تھی۔ جس میں دہرے تختوں والی کھڑکیاں لگی ہوئی تھیں۔ بائیں جانب نسبتاً چھوٹا سا کمرہ تھا۔ صحن ایک بڑا سا سٹور روم، باورچی خانہ، تین کمرے اور تھے۔

وہاں پہنچ کر ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ اور پرماتما کا ہزار ہزار شکر ادا کیا کہ ان بھتنوں سے جان بچ گئی۔

مجھے معلوم ہوا کہ سسر جی کہتے ہیں کہ یہاں چھوٹی بہو رانی کو تکلیف محسوس ہوتی ہوگی۔ اس لیے مالک مکان کو کہہ کر چھت پر علاحدہ کمرہ بنوا دیا جائے۔

میں نے یہ بات سنی تو دل دھک دھک کرنے لگا کہ کہیں اب کوئی نیا گل نہ کھلے۔ میں فوراً چائے کا گلاس لے کر سسر جی کے پاس پہنچی اور باتوں باتوں میں جتا دیا کہ میں سب کے ساتھ رہ کر خوش ہوں۔ لہٰذا علاحدہ کمرے کے لیے کوشش نہ کریں۔

سسر جی نے کہا۔ ’’معمولی بات ہے۔ کمرہ بنوا دیا جائے گا۔ تمہیں آرام ہو جائے گا۔ ‘‘لیکن میں بہت ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اصرار کیا کہ اکیلے پڑے پڑے میرا جی نہیں لگتا۔ اور پھر یہاں کافی کمرے ہیں۔ اس لیے علاحدہ بنوانے کی ضرورت بھی نہیں۔

سسر جی تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ "اچھا بٹی! جو تمہاری مرضی— چھوٹی بہو! مجھے یہ مکان بہت پسند ہے۔ ایک تو یہاں یہ گلی ختم ہوجاتی ہے۔ کوئی شور وغل نہیں۔ نہ لاریوں کی گھڑگھڑاہٹ، نہ گرد نہ غبار بچے اپنا مزے میں گلی میں کھیلتے پھریں کوئی ڈر نہیں۔ پھر شریف پڑوسی پچھلے مکان میں تو دور دور تک کوئی گھر ہی نظر نہیں آتا تھا کہ انسان کسی سے دو دو باتیں ہی کہہ کے دل ہی بہلا لے۔ اور پھر یہ گھر کیا ہے قلعہ ہے۔ چاروں طرف سے بند ہے۔ اور بالکل محفوظ پچھلے گھر میں کوئی چور کسی طرف سے بھی گھر میں گھس سکتا تھا۔ لیکن یہاں کسی کی کیا مجال جو کوئی قدم بھی رکھ سکے۔ اگر کسی موقع پر مرد گھر پر موجود نہ بھی ہوں تو عورتوں کو ڈر ہی کس بات؟......"

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

لمس

آدھی رات کے بعد گیدڑوں نے جو "ہواہو" کا شور مچانا شروع کیا تو کیا مجال رات بھر ایک لحہ کو بھی زینب کی آنکھ لگی ہو۔ اسے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں پہلے کی طرح ان کی کوئی مرغی نہ چوری ہوجائے۔ وہ انگریزی مرغی کھو کر اس کے دل کو کس قدر افسوس ہوا تھا۔ مرغیاں باہر ڈربے میں بند رہتی تھیں اندر جگہ نہیں تھی...... تاریک اور خاموش رات میں مرغی کی ذرا سی آواز بھی سنائی دیتی تو وہ کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈربے کی طرف چل دیتی۔

رات بھر جاگنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ صبح جب وہ بستر سے اٹھی تو اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس کا گھر چھوٹے سے قصبے کے ایک سرے پر تھا۔ کرایہ کا مکان بھی نہ تھا کہ بدل لیا جاتا۔ اپنا مکان بنوایا گیا تھا۔ ہر چند مکان میں جگہ بہت تنگ تھی۔ اور کنبہ مکان کی مناسبت سے بڑا ہی تھا۔ لیکن اس میں گذارا کرنا لازمی تھا۔

اس کا خیال تھا کہ آج وہ دن بھر کے کام دھندوں سے وقت نکال کر جی بھر کر سوئے گی۔ اس کا شوہر بڑی نہر پر ٹھیکے داری کا کام کرتا تھا۔ گھر سے دو روز بلکہ اس سے بھی زیادہ غائب رہتا اور جب کبھی گھر آتا بھی تو ہوا کے گھوڑے پر سوار۔ ادھر آیا، اُدھر گھر کے سامان کو اوپر تلے کیا، کبھی بچوں سے پیار اور کبھی اس سے...... پھر سائیکل

اٹھائی اور غائب۔

سورج نکل آیا تھا۔ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنی سوجی ہوئی آنکھوں کو ملنے لگی۔ اور تو اور آج اس کا چھ سالہ حنیف بھی اس سے پہلے جاگ اٹھا تھا۔ شاید وہ رویا ہو اس نے اسے جگانے کی کوشش بھی کی ہو۔ لیکن اس کی سیانی بیٹی روشنک اگرچہ ابھی گیارہ سال کی بچی ہی تھی۔ لیکن ان معاملات میں بہت سمجھ دار تھی۔ اس نے بھیا کا دل پرچائے رکھا ہوگا۔ تبھی تو بے چارا معصوم بچہ فرش ہی پر پھسکڑا مارے بیٹھا بسکٹ کے خالی ڈبے میں گتے کے پہیے لگا کر گاڑی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور روشنک اپنے بھیا کے قریب ہی بچھی ہوئی چٹائی پر پیٹ کے بل لیٹی کروشیے سے میز پوش کی جھالر بن رہی تھی۔ جب سے اس کا ایک لڑکا فوت ہوا تھا اسے اپنے بچوں سے اور بھی زیادہ محبت ہوگئی تھی۔

یوں بھی اس کی آنکھیں خراب ہی تھیں۔ گرمیوں میں تو تھوڑی بہت سرخی اس کی آنکھوں میں ضرور دکھائی دیتی تھی۔ بعض اوقات دکھنے بھی لگتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ صبح اٹھ کر پہلے وہ دوپٹے کے آنچل سے آنکھوں کے میل کو صاف کرتی تھی۔ اور آج وہ اپنی آنکھوں کو اچھی طرح صاف بھی نہ کرپائی تھی کہ ماں کا محبت بھرا دل امڈ آیا۔ ''اللہ خیر......میں واری جاؤں'' کہتی ہوئی وہ چارپائی سے اٹھ بیٹھی اور اپنے بچوں کو باری باری اس نے خوب سا پیار کیا۔ آج اسے اپنے بچے بہت ہی پیارے دکھائی دے رہے تھے۔ سب سے پہلے اسے دہی بلونا تھا۔ سگھڑ عورتیں دہی بلونے کا کام تو تاروں کی چھاؤں میں کرلیتی تھیں۔ وہ خود بھی اسی طرح کیا کرتی تھی۔ لیکن آج اسے دیر ہوگئی تھی۔ چناں چہ جب دہی کی مٹکی کے قریب پیڑھی پر بیٹھی تو دل کو وہ اطمینان حاصل نہ تھا۔ اور پھر اب حنیف بھی اس کے گلے کا ہار ہو رہا تھا۔ بچے کو نہار منہ باسی روٹی پر مکھن رکھ کر کھانے کی عادت تھی۔ آج اتنی دیر ہوگئی تھی کہ بے چارے سے بھوک برداشت نہیں ہوتی تھی۔ اسے پیار کر کے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ بس ٹھنکے جاتا تھا...... وہ عجب مصیبت میں گرفتار تھی...... ابھی کل تک اس کے گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے۔ نہ معلوم کہاں کے رشتے دار آن ٹپکتے۔ اگر کسی کے گھر میں قیام کرنا ہو تو

یوں ہی دور کی رشتہ داریاں قائم کر کے انتہائی ڈھٹائی سے پاؤں جما دیتے ہیں۔ اپنے دکھ سکھ میں ان کی صورت تک دکھائی نہیں دیتی۔ یوں بھی چلے آئیں تو خیر لیکن وہ اپنے بیمار عزیزوں کو بھی اٹھا لاتے ہیں۔ ایک دن پہلے جو مہمان رخصت ہوئے تھے۔ وہ بھی اپنی ایک چھوٹی سی بیمار بچی کو علاج کی غرض سے لے آئے تھے۔ اور پھر ان کا ہر قسم کا خرچ یہاں تک کہ ڈاکٹر کی فیس اور دواؤں کی قیمت بھی انہیں کے سر پر پڑی اور اس پر قیامت یہ کہ ڈاکٹر نے جواب بھی دے دیا کہ لڑکی کا جاں بر ہونا محال ہے۔ لیکن وہ لوگ اس وقت تک ان کے گھر سے نہیں ٹلے۔ جب تک کہ ان کی بچی مر نہیں گئی۔ اندر والے جس کمرے میں بچی مری تھی۔ وہ اس کے فرش کو دھو ڈالنا چاہتی تھی۔ بلکہ اس پلنگ کی نواڑ کو بھی دھلوا لینا چاہتی تھی۔ جس پر بیمار لڑکی پڑی رہتی تھی۔ ان سب باتوں کو سوچ کر اسے عجب کراہت سی محسوس ہونے لگی...... اللہ ہی سب کا مالک ہے...... لیکن اوروں کے گھروں میں جا جا کر مرنا ناسمجھی ہی کی بات تو ہے...... ان سب کاموں کے لیے بہت زیادہ وقت درکار تھا۔ ادھر حنیف تھا کہ بس روئے جا رہا تھا...... پہلے تو چمکارتی پچکارتی۔ آخر زچ ہوگئی اور اس نے زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ بہن اسے اٹھا کر پرے لے گئی۔ پھر وہ دودھ بلونے لگی۔ اور بچے کی چیخوں کی آواز سن کر دوپٹے کے آنچل سے اپنے ہی آنسو پونچھنے لگی۔

خدا خدا کر کے دودھ بلویا...... مکھن نکال کر کے لکڑی کے چوڑے دہانے والے برتن میں رکھا۔ اور پھر خود آپ ہی آپ اس کی نظر اوپر اٹھ گئی۔ اس جگہ کوے بھی بہت زیادہ تھے۔ ہر وقت ان کی جھپٹوں کا ڈر لگا رہتا تھا۔ چناں چہ اس نے چھت پر صحن کے آر پار بان کی رسّیاں باندھ رکھی تھیں...... لیکن جب اس نے دیکھا کہ بچوں نے رسّیاں کاٹ ڈالی تھیں۔ اس طرح کام میں سے کام نکل آتا تھا، اور ہر ادھورے کام کو دیکھ کر اس کا دل پریشان سا ہونے لگتا تھا۔ وہ یہ سوچ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی کہ ساتھ والے مکان سے بوڑھی جلا ہی کے چیخنے کی آواز سنائی دی اوپر پہنچی تو معلوم ہوا کہ منڈیر پر رکھا ہوا اُپلا پچھواڑے رہنے والے جلا ہوں کے گھروں میں جا پڑا تھا۔ سڑیل مزاج دادی کے

جا رہی تھی اور بے چاری روشنک دم بخود کھڑی تھی۔

اتفاق کی بات حنیف کا ہاتھ لگنے سے ایک ہلکا پھلکا اپلا ان کے صحن میں جا گرا تو کون سا قہر آ گیا۔ کوئی اینٹ پتھر تو نہیں کہ کسی کا سر پھٹ جاتا...... لیکن بڑھیا مفت میں کس قدر تڑخ گئی تھی۔ اس پر اسے بھی غصہ آ گیا اور اس نے بھی کھری کھری سنا ڈالیں۔ ادھر سے بڑھیا کی بہو بھی ساس کی حمایت میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگی۔ اس پر اسے اور طیش آیا پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر اس قدر چیخی اور چلائی کہ گلا بیٹھ گیا۔ بڑی مشکل سے جا کر کہیں امن قائم ہوا...... اور وہ رسّیاں باندھ کر نیچے آئی۔

روشنک کے اسکول جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ حنیف کی عادت تھی کہ وہ بھی بہن کے ساتھ ضرور جاتا تھا۔ عام طور پر بچے اسکول جانے سے کتراتے ہیں۔ حنیف پڑھائی کے قابل تو نہ تھا۔ لیکن وہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ اس نے جلدی سے توا چولھے پر رکھا تاکہ بچوں کو کھلا پلا کر اسکول بھیج دے اور بعد میں وہ باقی کاموں سے بھی نپٹ لے پراٹھے پکے اور کھانا کھاتے وقت بھی حنیف تھوڑی بہت چھین جھپٹ کرتا رہا۔ بہنیں بے چاری نیک ہی ہوتی ہیں۔ بھائیوں کی زیادتیاں چپ چاپ برداشت کر لیتی ہیں۔ ادھر وہ خود بھی چپ تھی۔ حالانکہ حنیف کی چیخوں سے کانوں کے پردے پھٹے جاتے تھے لیکن وہ اس خیال سے دل پر جبر کیے رہی کہ اب اگر اس نے بچے پر ہاتھ اٹھایا تو مفت میں گھنٹہ بھر پڑا روئے گا کھانا کھا کر اسکول تو چلا ہی جائے گا۔

ابھی بچے تیار ہوئے ہی تھے کہ نیتو کمہارن چھم چھم کرتی آن ٹپکی۔

نیتو کمہارن قریب کے گاؤں میں رہتی تھی۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ اپنے خاوند کے ساتھ گدھوں پر برتن لاد کر منڈی چک دین جاتی اور جب لوٹتی تو اس کا چاند تو گدھے ہانکتا ہوا پون میل پرے گاؤں کو چلا جاتا۔ لیکن وہ ان کے ہاں ضرور رک جاتی۔ وہ نئی نویلی دلہن تھی ابھی لال جوڑا بھی نہ اُترا تھا۔ شادی سے پہلے اگرچہ ہاتھ پاؤں کی مضبوط

تھی لیکن اس کا جسم کمزور تھا۔ مگر شادی ہوتے ہی نہ معلوم اس پر کیا جادو ہوگیا کہ روز بروز اس کے جوبن میں چار چاند لگتے جا رہے تھے۔ کلے پھول رہے تھے۔ ان پر سرخی جھلک مارتی تھی۔ سارا جسم بھر گیا تھا۔ سانولا سلونا رنگ ایسا نکھرا کہ اب نیا ہی روپ نکل آیا۔ اور ادھر وہ خود تھی کہ شادی سے پہلے تو وہ اچھی خاصی موٹی ہو رہی تھی۔ کیسے بھرے بھرے بازو اور کیا کاٹھ تھی اس کی لیکن شادی کے بعد وہ روز بروز گھلنے لگی۔ کوئی ایسی فکر بھی نہ تھی۔ کھانے پہننے کو خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ لیکن گال تھے کہ پچکے جا رہے تھے۔ آنکھوں کے نیچے گڑھے تھے کہ گہرے ہوتے جا رہے تھے، جسم تھا کہ اس میں بھرتی نام کو نہ رہی تھی۔

جب نینو چھم سے ان کے صحن میں داخل ہوئی تو سونی سونی فضا میں رونق دکھائی دینے لگی اور حنیف کا ایک پاؤں تو پاجامے کے پائنچے میں تھا اور ایک باہر کہ وہ اسے دیکھتے ہی جیسے رسی تڑا کر بھاگا اور دوسرے لمحہ میں نینو کی گود میں تھا۔

نینو کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ کیا بچہ اور کیا بوڑھا جس نے ایک مرتبہ اس سے بات کر لی بس اسی کا ہو رہا۔ ہنسی تھی کہ پھوٹی پڑتی تھی۔ باتیں تھیں کہ پھول جھڑتے تھے۔ صورت تھی کہ دل میں کھبی جاتی تھی...... انسان اس کی موہنی صورت بس دیکھا کرے۔ خدو خال تو خیر معمولی ہی تھے لیکن چہرے کی رنگ اور صحت ایسی کہ بس جی ہی نہیں بھرتا تھا۔

اگر کبھی وہ مصروف ہوتی اور ایسے میں کوئی ملنے کے لیے آجاتا تو دل میں برا مان جاتی تھی۔ ہزار کوشش کرنے کے باوجود سیدھے منہ بات نہ کر پاتی تھی۔ لیکن نینو کی آنکھوں میں نہ معلوم کیا جادو تھا کہ وہ جب بھی پہنچ جائے اسے اس کی آمد پر ہمیشہ ہی دلی مسرت ہوتی تھی۔ نینو نہ صرف صورت اور سیرت ہی کی اچھی تھی بلکہ وہ تھی بھی چلبلی اور کام کرنے والی جب آتی کاموں میں ہاتھ بٹاتی۔ ذرہ برابر بھی تکلف نہ کرتی۔ اس لیے اس کا آنا مبارک ہی ہوتا تھا۔

روشنک اسکول کو چل دی۔ حنیف ہٹ کر بیٹھا۔ نینو آئی ہوئی تھی اسے نینو سے بہت محبت تھی بھلا وہ نینو کو چھوڑ کر اسکول کیوں جانے لگا۔ چناں چہ وہ نینو کی گود میں بیٹھا رہا...... نینو کی شادی ہوچکی تھی لیکن اس کا لڑکپن نہ گیا تھا۔ اسے اس قسم کے کئی چھوٹے موٹے طریقے یاد تھے۔ جن سے وہ حنیف کو ہنسا کر خوش کرسکتی تھی...... زینب نے سوچا چلو اگر نینو گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ نہ بھی بٹائے اور محض حنیف کا دل بہلائے رکھے تو بھی اسے کام کرنے میں آسانی ہوجائے گی...... لیکن نینو کی باتوں سے معلوم ہوگیا کہ آج وہ زیادہ دیر تک نہ رُکے گی۔ اس کا خاوند قصبے میں کسی دوست سے ملنے کے لیے گیا تھا۔ اس لیے وہ ادھر چلی آئی۔

اور واقعی تھوڑی دیر بعد نینو کے خاوند کی آواز سنائی دی اور نینو اس بات پر اظہار تاسف کرتی ہوئی رخصت ہوگئی کہ آج زیادہ بیٹھنے کا موقع نہ ملا۔ حنیف نینو کے گلے سے لپٹا ہوا باہر تک گیا اور پھر گدھے کی سواری کرنے کے بعد بڑی مشکل سے کہیں واپس آیا...... اور واپس آتے ہی لگا ماں کا آنچل تھام کر ٹھنٹھنانے...... ماں جس طرف جاتی وہ روتا ہوا اس کے ساتھ ہو لیتا—اس مرتبہ نینو کی آمد سے وہ گھاٹے میں رہی۔ اگر وہ نہ آتی تو کم از کم حنیف اسکول کو سدھارتا اور وہ مزے سے سارے کاموں سے نپٹ لیتی......

باہر گونی میراثن کی بلند آواز سنائی دے رہی تھی۔ گونی بھی عجب باتونی عورت تھی۔ ادھر صبح ہوئی۔ اُدھر وہ آنچل سنبھالتی ہوئی گھر سے نکلی۔ اور لٹو کی طرح سارے قصبے میں گھوم گئی۔ وہ عورت کیا تھی۔ چلتا پھرتا اخبار...... تھی۔ اسے دیکھ کر عورتیں آٹے یا گوبر میں سنے ہوئے ہاتھ پھیلائے اپنے گھر سے باہر آن کھڑی ہوتی اور پھر گونی ناک پر انگلی رکھ کر اور بھنوں کو جنبش دے کر جو کوئی داستان چھیڑ دیتی تو بس اللہ دے اور بندہ لے، سننے والے کے کان پک جائیں لیکن خدا کی بندی کی زبان کو لگام کون دے...... اس کی آواز سنتے ہی زینب نے سوچا کہ کیوں نہ حنیف کو اس کے ہمراہ اسکول بھیج دے

لیکن گونی کو اندر بلانا ایک نئی مصیبت کو دعوت دینا تھا...... اور وہی بات ہوئی گونی اندر آئی اور اس نے ابھی قصبے کی اسٹاپ پریس خبریں ہی سنائی تھیں کہ زینب کے سر میں درد ہونے لگا۔ یک نہ شد دو شد...... کسی نہ کسی طرح اس نے حنیف کو گونی کے ساتھ روانہ کر کے آئی بلا ٹالی۔ لیکن گونی کے چلے جانے کے بعد وہ اس قدر تھک گئی کہ دم لینے کے لیے پیڑھی پر بیٹھ گئی۔

اس کا دل اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ دماغ پر غنودگی طاری تھی جسم ٹوٹ رہا تھا۔ گونی نے آج ایک خبر کو بڑی اہمیت دی تھی۔ ان کے مکان سے تقریباً پچاس قدم پرے ایک بہت بڑی حویلی تھی جس کی اوپر والی منزل پر ایک چوڑی والا اپنے کنبے سمیت رہتا تھا۔ چوڑی والے کی بیوی بہت طرح دار اور بانکی تھی۔ پہلے پہل اس نے اسے پڑوس والوں کے ہاں کسی شادی کے موقع پر دیکھا تھا۔ بیگاں اس کا نام تھا۔ کیا موہنی صورت پائی تھی اس نے۔ ادھر اس کا خاوند تھا۔ کچھ عجیب سی صورت تھی اس شخص کی، بدصورت نہ سہی لیکن اس کی شخصیت میں ذرہ برابر بھی کشش نہ تھی۔ لیکن عورت ہزاروں میں ایک تھی۔ اس رات شادی کے موقع پر عورتوں نے مل جل کر سوانگ رچایا۔ بیگاں نے مرد کا سوانگ بھرا۔ کیسی بے ڈول سی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں موٹا سا سونٹا لیے وہ اینٹھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی مصنوعی مونچھیں دوات کی روشنائی سے لکیریں کھینچ کر بنائی گئی تھی عجب مضحکہ خیز نظر آرہی تھیں۔ اور پھر اس کی چھاتیوں کا ابھار۔ مرد کا سوانگ اور بھی زیادہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ بھلا گونی میراثن سے چپ کہاں رہا جائے۔ ہانک لگائی۔ ''حضور والا! پہلے انہیں تو سنبھالیے۔'' عورتوں کی اس بے تکلف مجلس میں اس بات پر وہ قہقہے بلند ہوئے کہ وہ دہری ہوگئیں۔

ان دنوں وہ لوگ قصبے میں نئے نئے آئے تھے۔ بیگاں کی بے تکلفی کو اس کے الھڑ پن پر محمول کیا گیا۔ لیکن رفتہ رفتہ کئی قسم کی افواہیں اڑنے لگیں۔ چھوٹے سے قصبے میں اس قسم کی چٹپٹی باتیں چھپی ڈھکی رہ ہی نہ سکتی تھیں۔

خود اس نے دو تین مرتبہ غیر مردوں کو ان کے گھر میں گھستے ہوئے دیکھا تھا
زینب اللہ کے عذاب سے ڈرنے والی عورت تھی۔ وہ ان باتوں پر یقین ہی نہ کرسکتی
تھی۔ کیوں کہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ جو غیر مرد وہاں آتے ہوں وہ اس کے خاوند کے
دوست ہوں۔ لیکن ایک روز گرمیوں کی دوپہر کو تو اسے اس بات کا یقین کرنا ہی پڑا......
اس دن گھر پر کوئی نہ تھا۔ گرمیوں کے موسم میں وہ عموماً پچھلے کمرے میں گھسی رہتی تھی
کیوں کہ یہ کمرہ نسبتاً سرد تھا۔ اور وہاں سورج کی کرنیں بھی سیدھی نہ پڑتی تھیں۔ وہ کسی
کام سے اٹھ کر باہر والے کمرے میں آئی کہ اتفاق سے اس کی نظر اٹھی اور بیگاںؔ کے
مکان پر جم گئی۔ بیگاںؔ کا خاوند دن بھر چوڑیاں بیچا کرتا تھا اور وہ خود گھر پر تنہا ہوتی تھی۔
ایسے وقت میں کسی مرد کا آنا شک سے خالی نہ ہوسکتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا
کہ اس دن بیگاں نے بال دھو کر بکھیر رکھے تھے۔ چست قمیص پہن رکھی تھی...... اور پھر
کھڑکی میں سے کسی مرد کا جھپٹ کر بڑھتا ہوا ہاتھ دکھائی دیا۔ بیگاںؔ قلانچ بھر کر ہنستی
ہوئی پرے چلی گئی اور اس کی رنگین چندریا مرد کے ہاتھ میں رہ گئی۔ اس وقت بیگاں کے
لمبے اور گھنے بال کیسے لہرائے تھے...... اور پھر بیگاںؔ نے اپنے گھر کی کھلی کھڑکی بند کر
دی...... اور آج گونی نے نئی خبر سنائی تھی کہ کل رات بیگاںؔ نئے تھانے دار یار خاںؔ کے
ہاں پہنچی ہوئی تھی۔ گونی نے کیسے گال پر انگلی گڑو کر کس قدر پر اسرار انداز میں یہ واقعہ
بیان کیا۔ نیا تھانے دار دو ایک مرتبہ ان کے گھر آگے سے گذرا تھا۔ وہ ہٹا کٹا لمبا چوڑا
طرّے باز شخص تھا...... کیا ان عورتوں کو خدا کا بھی کچھ خوف نہیں۔ اور دوزخ میں حرام
کار عورتوں کو جو عبرت ناک سزائیں دی جائیں گی...... پھر وہ اپنے ذہن پر زور دے کر
سوچنے لگی کہ فاحشہ عورتوں کو مرنے کے بعد کون کون سی اذیتیں دی جائیں گی۔
اب تو ایک بجنے کو تھا۔ وہ یوں ہی بے کار وقت گنوا رہی تھیں۔ اس نے گھٹنوں
پر ہاتھ رکھے اور ان پر زور دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندر والے کمرے میں گئی اور پھیلے
ہوئے سامان پر نگاہ ڈالی۔ چار پائیاں الٹی سیدھی کھڑی یا بچھی تھیں۔ بڑے پلنگ کے

پایوں کے نیچے رکھی ہوئی اینٹیں ادھر اُدھر کھسک گئی تھیں۔ کھونٹی پر لٹکا ہوا بڑا ترازو ایک طرف کو لٹک گیا تھا۔ اور اس کے اوپر تلے رکھے ہوئے پلڑوں پر پڑے ہوئے لوہے کے باٹ کھسک کر نیچے گرنے ہی کو تھے۔ وہ رضائیاں اور گدے جو جگہ کی کمی کی وجہ سے چھت پر لگے ہوئے کنڈوں میں اڑا دیئے گئے تھے ان پر دو دو انگلی گرد جمی ہوئی تھی۔ مکڑیوں کے لمبے چوڑے جالے ادھر اُدھر کونوں میں لہلہا رہے تھے۔ اس کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ گیا۔ یہ سب کام کرنا تھا۔ اس نے بے دلی سے بانس کے سرے پر جھاڑو باندھی اور جالے صاف کرنے کے لیے اسے اٹھایا۔ ادھر اتفاق سے اس نے پلنگ کا سہارا لیا تو اس کے پایوں تلے سے اینٹیں کھسک گئیں۔ اور پلنگ دھم سے زمین پر آن رہا۔ اوپر سے روشنک کے کھلونوں کا ٹرنک کھسک کر گر پڑا اور کھلونے ادھر اُدھر بکھر گئے۔ اسی گڑ بڑ میں بانس ترازو کو چھو گیا اور باٹ فرش پر لڑھک گئے۔ اسی افراتفری میں اس نے زور سے بانس پیچھے ہٹایا تو وہ چھت پر لٹکی ہوئی رزائیوں سے جا ٹکرایا وہ بھی جیسے اشارے کی منتظر تھیں۔ دھمادھم اس کے سر پر گرنے لگیں...... ایک مرتبہ تو یوں معلوم ہوا جیسے کمرے میں زلزلہ آ گیا ہو۔ اور جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو کمرے کی حالت اور بھی ابتر دکھائی دینے لگی۔ اب کام اور بھی بڑھ گیا تھا۔ اس نے چڑ چڑے پن سے بانس پرے پھینک دیا اور خود زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی باہر والے کمرے میں چلی آئی۔

صبح ہی سے اس کی طبیعت مضمحل سی تھی۔ آج بسم اللہ ہی لڑائی سے ہوئی تھی اس نے دو پٹہ اتار پسینہ پونچھا۔ دو پٹے کو رسی پر اچھا دیا۔ اور پھر گردن سے قمیص اٹھا کر وہ دستی پنکھے سے ہوا کرنے لگی۔

کھڑکی میں سے سامنے کے مکان کا ختم ہوتا ہوا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ صابن اور میل والا پانی بہہ کر کچی سڑک کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ نیچے کی منزل والے غریب لوگوں کی کھٹمل بھری چارپائیاں دھوپ میں پڑی تھیں اور ان کے غلیظ کپڑے ہوا میں لہرا رہے تھے...... اوپر کی منزل پر کھڑکی میں سے بیگاں سر نکالے کھڑی تھی۔ وہ ادھر

اُدھر نظریں دوڑا رہی تھی۔ تیز چمکتی ہوئی دھوپ میں اس کا چہرہ کس قدر حسین دکھائی دے رہا تھا۔ موئی حرام کار روز بروز موٹی ہوتی جارہی تھی اور گالوں کی سرخی بڑھتی جارہی تھی۔ کیسی صاف شفاف سرگیں آنکھیں تھیں اس کی...... ہونٹ کیسے ترشے ہوئے تھے...... اس کی بالوں کی ایک لٹ بار بار اس کے چہرے پر آن گرتی تھی جسے وہ ہر مرتبہ پیچھے ہٹا دیتی تھی...... اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسرت انگیز اطمینان کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

زینت نے کھڑکی بند کر دی اور دوسری کھڑکی کھلی رہنے دی جہاں سے اُسے دور تک پھیلے ہوئے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ اس طرف کوئی مکان نہ تھا۔ ویران زمین کا بہت بڑا ٹکڑا حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا۔ زمین بنجر تھی۔ اس پر کبھی کوئی فصل نہ اگ سکتی تھی۔ اکا دکا روکھا سوکھا درخت کھڑا دکھائی دے جاتا تھا۔ یا ہندوؤں کا مرگھٹ تھا جس کے چاروں طرف پکی اینٹوں کی ایک پست سی دیوار کھینچ دی گئی تھی۔ چار دیواری کے اندر ایک کونے میں چرکھڑی والا ایک کنواں تھا۔ دن کو تیز دھوپ کی وجہ سے ہوا میں بھنگے سے اڑتے دکھائی دیا کرتے تھے یا رات کو مرگھٹ میں پڑے ہوئے لکڑی کے کندھے چٹختے اور چنگاریوں کی ایک پھلجڑی آسمان کی طرف اڑ جاتی......

اس کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ اور پھر جیسے مکان کے باہر کی طرف دیوار کے ساتھ سائیکل رکھنے کی آواز آئی۔ کبھی کبھار اس کا خاوند اس طرف سے گذرتا ہوا چند گھڑیوں کے لیے ادھر بھی آن نکلتا تھا۔ ہوا کے گھوڑے پر سوار ...... چوکھٹ کے اندر جیسے دھم سے پاؤں رکھنے کی آواز آئی...... اس کی ادھ کھلی سی آنکھیں دیوار میں سے کھڑی ہوئی لکڑی کی سیدھی موٹی کھونٹی پر جم گئیں۔ جس کے نیچے تھیلا لٹکا ہوا تھا۔ کیسا بے کیف سا منظر تھا۔ اس نے جیسے آنکھیں پھیر لینے کے خیال سے سر ایک طرف کو ڈال دیا۔ اور اس طرح بغیر کسی خاص کوشش کے اس کی نظریں چلچلاتی ہوئی دھوپ میں پھیلی ہوئی بنجر زمین پر دوڑنے لگیں...... حسب معمول گرد اور سوکھے پتوں کا ایک بگولہ اٹھا اور

ایک بڑے بھاری ستون کی طرح دھرتی کی چھاتی پر گھومنے لگا۔ اس قدر تیز گردش...... جیسے دھرتی کے سینے کو پھاڑ کر نہ معلوم کس طرف کو نکل جائے گا...... لیکن دھرتی خاموش اور بے حس تھی۔ وہ لاش کی طرح چپ چاپ لیٹی تھی بگولا بڑی تندی کے ساتھ گھومتا ہوا پرے چلا جاتا۔ کبھی نزدیک دکھائی دینے لگتا۔ اور کبھی یوں معلوم ہوتا جیسے زمین کے اندر ہی کہیں غائب ہو گیا ہو اور کبھی پھر جھوم کر اٹھ کھڑا ہوتا...... وہی ستون کا ستون...... اس قسم کے بگولے ہمیشہ اٹھا کرتے تھے۔ اسی طرح تیزی اور تندی دکھا کر ختم ہو جاتے تھے۔ لیکن زمین ویسی کی ویسی رہ جاتی۔ اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہوتی تھی۔ یہ منظر کس قدر خشک، بے مزہ اور بے رنگ سا تھا...... آہستہ آہستہ پاؤں کی چاپ رخصت ہوتی ہوئی معلوم ہوئی...... غالباً اس کا خاوند چلا گیا تھا۔ اس نے کھڑکی سے منہ پھیر کر کروٹ بدلی...... اس کے جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ہڈیاں جیسے پس کر رہ گئی تھیں۔ چھاتیاں جل رہی تھیں۔ ہوا گرم اور بوجھل تھی۔ دوپہر کے وقت کوئی کتا تک بھونکتا سنائی نہ دیتا تھا۔ صرف کہیں بہت دور کوئی شخص گنڈاسے سے چارا کاٹ رہا تھا۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

کٹھن ڈگریا

رکھی چند دکان سے واپس آ رہا تھا۔ صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت کوئی مزے دار بات سوچ رہا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی...... چلتے چلتے جب اُسے سگریٹ سلگانے کی خواہش محسوس ہوئی تو اُسے خیال آیا کہ ماچس تو دکان پر ہی رہ گئی ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ اب وہ گھر کے قریب پہنچ چکا ہے...... وہ اپنی دھن میں اس قدر مگن تھا کہ اُسے سگریٹ منہ سے نکالنے کا خیال تک نہ آیا۔ کسی رہ گیر کی نظر اس کے ڈھیلے ڈھالے ہونٹوں میں پھنسے ہوئے سگریٹ پر جا پڑتی تو وہ بے اختیار مسکرا دیتا...... اس پر طرہ یہ کہ وہ خود بخود مسکرائے جا رہا تھا۔ کبھی سر کو حرکت دینے لگتا۔ کبھی زیرِ لب کچھ کہنے لگتا — وہ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔ چونتیس پینتیس برس کے قریب عمر۔ صورت بھی بری نہیں تھی۔ صحت بھی کافی اچھی تھی۔ تین بچوں کا باپ تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر ریڈیو کی ایک دکان چلا رہا تھا۔ بڑے ضابطے سے کام کرنے والا شخص تھا۔ گیارہ بجے دکان پر جاتا۔ اس کا معاون پہلے ہی سے موجود ہوتا تھا۔ ایک سے دو بجے تک لنچ کے لیے دکان بند کر دی جاتی۔ شام کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر چلا آتا...... البتہ دکان سات بجے تک کھلی رہتی۔ آج کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص کو ملنے کے لیے اسے دہلی جانا تھا۔ اس نے اپنی بیوی شانتا کو سامان تیار کرنے کے لیے بھی کہہ

دیا تھا لیکن اچانک دکان پر اسے تار ملا کہ کل وہ شخص خود لاہور پہنچ رہا ہے۔ چلو سفر کی مصیبت سے جان چھوٹی۔ لیکن آج شام کا پروگرام کیا ہو؟ یہ سوال فوراً اس کے ذہن پر ابھر آیا اور وہ چند لمحوں تک بلا سبب اس فکر میں غلطاں رہا اور پھر دل کی پکار خود بہ خود ہی واضح ہوگئی کہ یہ شام اپنے دوست بیج ناتھ کے ہاں گزاری جائے بلکہ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جائے۔

کچھ روز سے بیج ناتھ کی بیوی کامنی اس کے لیے خاص کشش کا باعث بنی ہوئی تھی۔ یہ بات اخلاق سے گری ہوئی ضرور تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ حد سے زیادہ شرمیلا بنا رہا۔ زندگی کا سنہرا زمانہ کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائے بغیر گزر گیا۔ جب شادی ہوئی تو چند سال تک وہ بیوی کا دیوانہ سا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ بیوی میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ جب کبھی بیوی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تو بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی۔ وہاں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اپنی بیوی بے رس معلوم ہونے لگی۔ تب اس نے بازار کا رخ کیا۔ وہاں دلاّل یہی کہتا کہ بس صاحب ہفتے بھر ہی سے بازار میں بیٹھنے لگی ہے۔ پہلے پہل تو یہ خیال ہی کچھ کم رومان انگیز نہیں تھا لیکن جب دلاّلوں کے ہتھکنڈوں کا علم ہوا تو طبیعت بجھ گئی۔ دنیا کا دھندہ تو چلتا رہا لیکن محبت کی پیاس کے مارے اندر ہی اندر کانٹا سا کھٹکنے لگا۔

گذشتہ دنوں اتوار کے روز وہ اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس نے بیج ناتھ کو کامنی کے ہمراہ اپنے مکان کی طرف آتے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہونے پر بیج ناتھ نے کہا۔ ''ہم اجنبی ہیں۔ مکان کی تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکیں گے؟''

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے مکان دلوا دیا۔ اگرچہ ان کے مکانوں کے درمیان تین چار میل سے کم فاصلہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا دکھ سکھ میں شرکت کرنا کبھی کبھار تفریح کی غرض سے شہر سے باہر چلے جانا ان کے معمول میں داخل ہوگیا تھا۔

ایسے موقعوں پر کامنی اس کی طرف نگاہِ غلط انداز سے دیکھ لیتی۔ پہلی مرتبہ تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا اس کی نگاہوں نے دھوکا کھایا ہے لیکن جب دبی دبی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا تو پہلے محسوس ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت بھی کر سکیں گے۔ کبھی کبھی اس کا دل طعن طعن بھی کرتا لیکن پھر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دے لیتا کہ کامنی ہی کی طرف سے تو آغاز ہوا ہے۔ کبھی سوچتا معمولی دل لگی ہی تو ہے۔ ذرا کی ذرا چہل ہو جاتی ہے۔ دل بہلا رہتا ہے۔ اس میں قباحت کی تو کوئی بات ہی نہیں۔ لیکن یہ سب ظاہر داریاں تھیں کیوں کہ دل کی گہرائیوں میں وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا کہ اُسے کامنی سے محبت ہو گئی ہے۔

راستہ چلتے چلتے وہ کامنی کی بابت سوچتا رہا۔ ابھی تک اُس نے چھوا تک نہیں تھا۔ شاید آج کوئی اہم واقعہ پیش آئے۔ ممکن ہے کہ وہ اس پہلی محبوبہ کے بہت قریب پہنچ جائے۔

اب وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ جیا پنواڑی کی دکان اس کے مکان کے قریب ہی تھی...... دکان کے قریب سے ہو کر گذرتے وقت سلگتی ہوئی رسی دیکھ کر اُسے سگریٹ سلگانے کا خیال آیا۔ اگر کوئی دوست اسے ملنے کے لیے آتا تو گھر والوں کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جیا ضرور اس بات کا خیال رکھتا تھا۔ چناں چہ سگریٹ سلگا کر اس نے جیا سے پوچھا۔ کیوں بے جیئے! مجھے کوئی شخص ملنے کے لیے تو نہیں آیا تھا؟ اس وقت جیا نسوار سونگھ رہا تھا۔ چھینک آنے کو ہی تھی۔ اس لیے منہ سے جواب نہ دے سکا۔ کبھی اثبات میں سر ہلاتا کبھی نفی میں۔ آخر معلوم ہوا کہ کوئی شخص نہیں آیا تھا۔

رگھی نے سگریٹ کا کش کھینچا اور گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جو تین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی دو اینٹیں اکھڑ گئی تھیں۔ ہر دم اُن پر سے پھسلنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اسے کئی مرتبہ خیال آیا کہ ان کی مرمت کروا دی جائے لیکن لاپروائی میں یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

گھر کے اندر داخل ہوا۔ تو دیکھا کہ شانتا بڑے آئینے کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ابھی نہا کر آئی ہے۔ اس وقت خاصی پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دوست کہا کرتے ۔'' یار تمہاری عورت تو بہت حسین ہے پھر بازاروں میں ادھر اُدھر دھکے کیوں کھاتے پھرتے ہو؟''

شانتا نے بالوں کو ایک ہاتھ سے گھما کر آگے لاتے اور ان پر کنگھی کرتے ہوئے کہا۔''جی میں نے آپ کا سامان تیار کردیا ہے۔

'' بھئی آج تو میں نہیں جاؤں گا۔''

'' کیوں۔'' شانتا نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

'' جس شخص سے ملنا تھا وہ خود کل یہاں آرہا ہے...... نل بند تو نہیں ہوا؟ ذرا نہالوں......''

وہ غسل خانے میں چلا گیا۔ اور وہاں کا کروں تو سے الفت ہوگئی...... ہوگئی گاتا رہا۔

جب کپڑے پہن چکا تو بیوی نے پوچھا۔'' اب کھانا کھا کر ہی جایئے گا باہر؟''

'' نہیں بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ایک شخص سے ملنا ہے۔ کھانا باہر ہی کھاؤں گا انتظار میں مت بیٹھی رہنا۔''

حالانکہ اس کی بیوی کو اس پر کسی قسم کا شک نہیں تھا لیکن اس نے بیج ناتھ کے گھر کا نام جان بوجھ کر نہ لیا۔ آخر کیا فائدہ؟ عورتیں وہمی تو ہوتی ہی ہیں۔

آئینے کے سامنے کھڑے کھڑے اس نے اپنی صورت کا جائزہ لیا اور اس نے خود ہی فیصلہ کیا کہ اس کی صورت بیج ناتھ سے کہیں بہتر ہے اور اگر کانتی اسے اپنے شوہر پر ترجیح دیتی ہے۔تو اسے اس کی خوش ذوقی کا ثبوت سمجھنا چاہئے۔

خوب بن ٹھن کر اس نے اپنے آپ پر آخری نگاہ ڈالی۔ کوٹ کی اوپر والی جیب میں رنگین رومال ٹھکانے سے رکھا۔ رخساروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی ہمواری کا جائزہ لیا۔ ٹائی کی گرہ درست کی۔ پتلون کی کریز پہلو بدل بدل کر دیکھی۔ ہیٹ پر جمی ہوئی گرد کی

باریک تہہ کو چٹکی بجا بجا کر صاف کیا۔ چاندی کا سگریٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے اُس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا۔ آج وہ واقعی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں لڑکے نانا کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیوی کو پیار کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن وہ جلدی میں تھا۔ اس لیے چھڑی گھماتا ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک لمحہ کے لیے اسے خیال آیا کہ اگر وہ سگریٹ کیس میں'' عبداللہ'' کے سگریٹ رکھ لیتا تو بہتر ہوتا۔ وہ'' عبداللہ'' سگریٹوں کا بڑا مداح تھا اور اُنہیں خصوصاً اس وقت پیتا تھا جب وہ خوش ہو...... اب سگریٹ لینے کے لیے واپس جانے میں اس نے بدشگونی سمجھی۔ اس لیے کوئے یار کی طرف ہی بڑھتا چلا گیا۔

اس کا دل مسرور تھا۔ قدم بڑے بانکپن سے اٹھ رہے تھے۔ ارد گرد کی چیزیں اُجلی اور نئی نئی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے ہر چیز نے نیا جنم لیا ہو۔ اس میں چمک تھی اور حرکات سے چلبلا پن عیاں تھا۔ اپنی بیوی اور گھر سے دور وہ اپنے آپ کو آزاد پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کالج کے چھوکرے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ جو گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہو۔ اور اب والدین کے روپے سے عشق لڑا رہا ہو۔ محض عورت کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ تو محبت کا بھوکا تھا۔ دردِ عشق کا خواہاں تھا۔ اصلی چیز تو وہ جذبۂ یگانگی تھی۔ جو وہ'' کمو'' کے لیے محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کامنی کو پیار سے کمو کہا کرتا تھا۔ اس کی یہی ایک تمنا تھی کہ اگر ان کی محبت پروان چڑھے اور دونوں کے دھڑکتے ہوئے سینے کسی روز مل جائیں تو وہ اسے'' پیاری کمو'' کہہ کر بلائے ، کبھی کبھی جب وہ تصورات کے طلسم میں سے نکلتا تو سوچتا کیا معلوم اس کے نصیب میں حسین کامنی کی محض مسکراہٹ ہی لکھی ہو۔

آخر کار شام کے دھندلکے میں جب بیج ناتھ کا بلا پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا مکان نظر آنے لگا تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ یہاں تک تو وہ ایک مبہم لیکن مسحور کن جذبے کے ماتحت چلا آیا تھا...... لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اسے ان کے گھر میں کس انداز سے

داخل ہونا چاہئے۔ اس مسئلہ کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ ان معاملات پر زیادہ تجویزیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہر حرکت بے تکلفانہ ہونی چاہئے۔ چناں چہ وہ بڑی بے تکلفی سے ان کے گھر کے اندر داخل ہوگیا۔

بڑے کمرے سے میاں بیوی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رکھی دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بج ناتھ پاؤں پھیلائے کرسی کے بازو پر بیٹھا تھا۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شاید وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کامنی اس کی قمیص میں بٹن...... ٹانک رہی تھی اور وہ گا رہا تھا۔ بیوی بگڑ رہی تھی۔ ''اب ذرا گانا بند کر دیجئے نا۔ سوئی چھاتی میں اتر جائے گی۔ تو پھر نہ کہئے گا۔''

شوہر مسخرے پن سے بولا۔ ''تم سے نہیں کہیں گے تو اور کس سے کہیں گے مائی ڈرالنگ اور ہمارا کون ہے۔'' اور پھر وہ نہایت بھونڈے انداز میں نتھنے پھلا پھلا کر شکستہ بانس کی سی آواز میں ایک فرسودہ سا فلمی گانا گانے لگا۔

''تیرا کون ہے
کسے کرتا تو پیار پیار پیار
''تیرا کون ہے......کون ہے...... ہاں تیرا کون ہے۔''

ادھر میاں بیوی میں یہ چہلیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر چھ ماہ کا بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ بج ناتھ اس وقت بڑے خوش گوار سوڈ میں تھا۔ جوں جوں بیوی اس کی حرکات سے چڑتی توں توں وہ اسے اور زیادہ پریشان کیے جاتا۔ وہ جھنجلا کر کہتی۔

''اب ملکنا بند کیجئے...... مُنا رو رہا ہے......''

رکھی رام دو قدم آگے بڑھا۔ اور اُس نے کھانس کر اُنہیں اپنی آمد سے مطلع کر دیا۔

بج ناتھ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پہلے تو حیران رہ گیا۔ پھر چلّایا۔ ہلو ہلو! یار میرا خیال تھا۔ اب تک تم گاڑی میں بیٹھے ہو گے۔''

رکھی نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''نہیں بھئی دہلی

جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے..... کرپا رام سے ملنا تھا۔ اس کا تار آیا ہے کہ کل وہ خود لاہور پہنچ رہا ہے.....''

اتنے میں کامنی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کر دی۔

''جی نمستے۔'' اس نے بڑی معصومیت اور اخلاق سے جواب دیا۔

منّا رو رہا تھا۔ کامنی اسے پیار سے پالنے میں سے اٹھا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے لگی۔ ''منّا کیوں رو رہا ہے..... ہمارا منّا کیوں رو رہا ہے..... نا..... نا..... کیوں جی آپ کی منّی بھی رو رہی تھی۔''

''جی نہیں'' رکھی نے جواب دیا۔'' ہماری منّی تو سوئی پڑی تھی۔ آج کل ہمارے گھر میں بچوں کا شور بہت کم ہوتا ہے۔ گوشی اور جیو دونوں نانا کے ہاں گئے ہوئے ہیں۔ بچے ہیں نا۔ نئی جگہ پر ان کا دل بھی بہلا ہوا ہے۔ گھر میں منّی بے چاری ہے سو چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔''

''نا جی نا ہمارا منا بھی تو نہیں روتا۔'' کامنی نے بچے کو پچکارتے ہوئے کہا.....

''آج تو اس کے بابو جی نے اسے رلا رلا کر ہلکان کر دیا ہے..... میں ان کے بٹن ٹانک رہی تھی۔ اور یہ ہل ہل کر گاتے جاتے تھے۔ منا جاگ اٹھا اور رونے لگا.....

جب وہ باتیں کر رہی تھی تو رکھی اس کے چکیلے جسم اور تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت سج دھج کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن معمولی گھریلو کپڑوں میں بھی وہ کس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی۔ اور پھر دفعتاً جو اسے کچھ خیال آیا تو بیج ناتھ سے مخاطب ہو کر بولا۔'' یار معلوم ہوتا ہے کہ تم باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے..... میں تو یوں ہی ادھر چلا آیا۔ اگر تم کسی کام سے جا رہے ہو۔ تو چلو۔'' نہیں یار بیٹھو..... باتیں کریں۔''

''نہیں بھئی، مجھ سے یہ نہ ہوگا۔''

کامنی نے بچے کو گود میں جھلاتے ہوئے کہا۔'' آج ان کی دعوت ہے کہیں۔''

واقعی ؟ ...... بھئی واہ...... اب تو میں تمہارا راستہ نہیں روکنا چاہتا ضرور جاؤ تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے......''

نہیں ...... اب میں نہ جاؤں گا۔ تم اتنی دور سے آئے ہو اب تو مل کر باتیں کریں گے...... اور ہاں جیلانی کے ہاں برج کھیلنے کے لیے کیوں نہ چلیں؟''

لیکن رکھی کو اپنی حرکت بہت نامناسب معلوم ہو رہی تھی۔ ''بج بھائی اپنا پروگرام خراب مت کرو۔ میں تو یوں ہی چلا آیا تھا۔ بس اب سیر کرتے ہوئے گھر چلا جاؤں گا...... یہ ذرا بدتمیزی کی بات ہے کہ میری وجہ سے تمہارا سیزبان پریشان ہو۔ اور پھر ہم دونوں میں تکلف بھی تو نہیں ہونا چاہئے۔''

بج ناتھ چند لمحوں تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ ''اتنی دور سے آئے ہو۔ ہم دونوں کا وقت خوب کٹ سکتا تھا — ہاں یار ایک اور بات سوجھی ہے مجھے۔ تم یہیں بیٹھو اور میں ذرا کھانا کھا کر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آجاؤں گا میری واپسی تک تم کھانا بھی یہیں کھا لوگے۔ اور پھر ہم جیلانی کے ہاں چلیں گے۔ بڑا مزے کا شخص ہے۔ گپ بھی اڑے گی۔ اور برج بھی کھیلی جائے گی۔''

رکھی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آرہا۔ ایک گھنٹہ کے لیے وہ اور کامنی تنہا رہ جائیں گے۔ گودی کا منا تو سو ہی جائے گا۔ اس سے بڑا چار سالہ لڑکا بھی سلایا جاسکے گا...... اس نے تیزی سے اچٹتی ہوئی نگاہ کامنی پر ڈالی۔ گوناگوں جذبات کے ہجوم میں وہ کچھ نہ بول سکا۔''

بج ناتھ کہتا چلا گیا۔ ''کہو یار کیسی رہی — بھئی کہیں جانا نہیں۔ تمہیں میرے سر کی قسم! — میں بہت دور نہیں جارہا ہوں۔ یہی اپنے ڈاکٹر شرما ہی کے ہاں تو دعوت ہے۔ تم شاید نہیں جانتے انہیں۔ تمہارے راستے ہی میں تو مکان پڑتا ہے۔ اچھا تو وعدہ کرو تم نہیں جاؤگے۔ یہ نہ ہو کہ میں بھاگم بھاگ واپس پہنچوں اور تم غائب ہوجاؤ...... بس آج شان دار پروگرام رہے گا۔''

رکھی چپ چاپ کھڑا رہا بھلا وہ کہاں جاسکتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اُس کی تقدیر بھی اس قدر اچھی ہوسکتی ہے۔ وہ ایک موہوم سی اُمید پر یہاں آیا تھا۔ ادھر بھگوان نے بھگت کی پرارتھنا قبول کر کے خود اپنے ہاتھ سے اس کے راستے کا کانٹا صاف کردیا۔

''لو یہ رہے سگریٹ...... اور یہ رہا ویلکی...... کموا انہیں روٹی کھلا دینا...... ذرا خیال رکھنا۔ جاگ نہ جائیں کہیں...... میں چٹکی بجاتے میں آیا......''

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پتلون کے بٹن لگانے لگا۔ برش سے بالوں کو ہموار کیا ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اگلے پلّو کو نیچے اور کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر والے دروازے کی طرف بڑھا۔ کامنی پکار کر بولی۔ ''ہائے کیسے بھاگے جارہے ہیں۔ گھر سے باہر جانا ہوتو پاؤں زمین پر ہی نہیں لگتے۔ اب جلدی لوٹ آیئے گا۔''

ہاں بھئی لوٹ آؤں گا۔ لوگ ہمارا ایندھن اٹھا اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ اس کی فکر کیا کرو۔ ڈیوڑھی کا دروازہ بند کرلو...... اچھا یار میں چلا......''

ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے! کامنی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر شوہر سے آنکھیں چار ہوئیں۔ شوہر نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ہلا دیا۔

وہ وہاں چپ چاپ کھڑی گلی کی نکڑ پر سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس اثنا میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے لگ کر اس کے قریب کھڑا ہوگیا تھا۔ کچھ دیر تک کامنی سنسان گلی کی جانب دیکھتی رہی۔ اور پھر اس کا ہاتھ اوپر اٹھ کر بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا اور دوسرے لمحے میں بجلی کا بلب بجھ گیا۔ اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی پھیل گئی۔

رکھی نے بازو بڑھایا جو کامنی کے پیٹ پر سے ہوتا ہوا اس کے گوشت سے بھرپور کولھے پر جاکر ٹک گیا۔ کامنی کی کمر ہلکی سی لرزش کے بعد ساکن ہوگئی...... وہ اور قریب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔ ان دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں۔ لیکن کامنی

کی کمر نے ایک لرزش کے بعد سکون اختیار کر کے گویا اس کے سوال کا جواب اثبات میں دے دیا تھا۔

وہ خاموش کھڑے تھے۔ دو ایک مرتبہ رکھی کے لبوں سے نکلتی ہوئی درد محبت میں ڈوبی ہوئی نہایت مدھم سی آواز سنائی دی......'' کمو! کمو!!''

'' بی بی جی...... بی۔ بی۔ جی!!'' بڑے لڑکے کی پکار سنائی دی۔

وہ بلند آواز میں بولی۔'' آئی بیٹا...... آئی...... بیٹھے رہو وہیں پر۔''

رکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ اور وہ ذرا پرے سرک گئی۔

'' سنو...... کمو...... سنو۔'' اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی۔

کامنی دو قدم پرے دیوار سے پیٹھ لگائے دونوں ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائے سر نیہوڑائے کھڑی تھی۔ کمرے کی فضا خواب ناک تھی۔ ہر طرف سرمئی غبار سا چھایا ہوا تھا۔ کامنی کی مدھم شبیہ حسین مجسمے کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی چھاتیوں کے زیر و بم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے جان مورت نہیں ہے۔

'' کمو! سنو...... میں تم سے محبت کرتا ہوں۔''

میں تم سے محبت کرتا ہوں — کیسے فرسودہ الفاظ تھے جنہیں اُس نے بیسیوں مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا۔ فلم کے پردے پر سنا تھا۔ لیکن آج وہ اس فقرے کو اس طرح ادا کر رہا تھا۔ جیسے یہ اُسی کی اختراع ہو۔

جواب میں کامنی نے پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اور ایک مرتبہ بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور پھر خود سپردگی کے انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔

وہ بجلی کے کوندے کی طرح آگے بڑھا اس کی کمر کو بازوؤں میں لے کر اُسے اپنی طرف کھینچا۔ تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے پھولوں کی نازک ڈالی کو پکڑ جھنجھنا دیا ہو۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے نرم اور لچکیلے جسم کے لمس سے محظوظ ہونے لگا۔ ایک شدید اور فوری جذبے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اُسے بھینچا،

چوما...... اور پھر لڑکے کی پکار کی آوازیں۔ ہتھوڑوں کی دھمکوں کی طرح سنائی دینے لگیں۔
اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خوشبو کی طرح اُس کی آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔

وہ کمرے میں تن تنہا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکیوں میں داخل ہونے والی چاند کی روشنی میں کرسیاں، تپائیاں، تصویریں پردے، اور کتابیں۔ غرض ہر شے خواب ناک اور ساکن دکھائی دے رہی تھی۔ صرف اس کی ٹانگیں اور بازو لرزاں تھے۔ سانس تیزی سے چل رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر اس کے لبوں سے چند غیر مبہم سی آوازیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک وہ خلا میں گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ ایک مرتبہ احساسِ گناہ کی شدت سے کانپ بھی اٹھا — لیکن صرف ایک لمحہ کے لیے پھر اس نے رومال سے منہ اور پیشانی صاف کی۔ کپڑوں کی سلوٹیں اور کوٹ کی جھول کھائی ہوئی آستینوں کو کھینچ کر ہموار کیا پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں...... باورچی خانے کی جانب بڑھا کامنی چولھے کے قریب بیٹھی دیگچی میں چمچ چلا رہی تھی۔ اس کا بڑا لڑکا اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا اونگھ رہا تھا۔ چولھے میں لپلپاتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں کامنی کے دہکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ باہمی کش مکش میں کامنی کے بال پریشان ہوگئے تھے۔ گال سرخ ہو رہے تھے۔ قمیض دو تین مقامات سے مسک گئی تھی...... یہ سب اسی کی دست درازیوں کے نتائج ہی تھے۔ اس خیال سے وہ ایک نئی لذت کے احساس میں گم ہوگیا۔

بظاہر کامنی اس کی آمد سے بے خبر دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ بچے کو اونگھتا دیکھ کر اس نے کہا۔ ''چلو تمہیں سلادوں۔'' — اور وہ اسے سلانے کے لیے اندر چلی گئی تھی۔

رکھی چولھے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حالات کا جائزہ لینے لگا —

کامنی پھر چولھے کے قریب آ بیٹھی۔ اُس کی حرکات سے کسی غیر معمولی واقعے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دیگچی کو چولھے سے اتار کر اس نے توا رکھ دیا۔ اور آٹا توڑ کر پیڑا

بنانے لگی۔ اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولی۔" آپ کو سردی لگ رہی ہوگی — چولھے کے قریب آجائیے نا۔"

واقعی سردی بہت سخت پڑ رہی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اسٹول کھسکایا اور چولھے کے قریب آگیا۔

رکھی کی نظریں اُس کے رخساروں، آنکھوں، تیزی سے جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں اور ہاتھوں کی حرکات پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دل میں اس بے چین تشنگی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ جو پیاسے ہونٹوں سے شربت کا گلاس پرے ہٹ جانے سے محسوس ہونے لگتی ہے۔

کامنی نے روٹی اُلٹتے ہوئے کہا۔" آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔"

اس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیئے۔" نہیں کمو! مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔" یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

کامنی نے اپنے آپ کو اس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کہا۔" مجھے روٹی تو پکا لینے دیجئے۔

" نہیں جان سے پیاری کمو!"

روٹیاں پھر پکا لینا...... یہ کہہ کر اُس نے ہاتھ مار کر توا چولھے سے گرا دیا۔

...... وہ خوش تھا اور سرتا پا نشے میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب وہ بیٹھک میں دری پر لیٹا ہوا تھا۔ ٹانگیں اٹھا کر قریب بچھی ہوئی کرسی پر پاؤں لٹکا رکھے تھے اور بجلی کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں ویکلی کا پرچہ پیٹ پر دھرے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

ایک مرتبہ پھر کامنی چولھے کے آگے بیٹھی اس کے لیے پراٹھے پکا رہی تھی۔ اس روز سے پہلے زندگی کے جو دن گذر چکے تھے۔ وہ بالکل بے کیف نظر آنے لگے۔ یہ مسرت یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ دل مطمئن تھا جسم ہلکا پھلکا اور

چست ہو رہا تھا۔ روح پر ناقابلِ بیان کیف طاری تھا۔ آج کامنی اور وہ ایک ہو گئے تھے۔ کھانا تیار ہوگیا۔ تو انہوں نے ایک ساتھ مل کر کھایا۔ ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملا کر نوالے چھینتے رہے۔ ہنسی مذاق اور چہل میں وقت گذر گیا...... اور آخر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔

کامنی نے دروازہ کھولا۔ بیج ناتھ کا معصوم چہرہ دیکھ کر رکھی کے دل میں فتور پیدا ہوگیا لیکن کامنی آڑے آئی۔" آپ کے دوست تو اٹھ اُٹھ کر بھاگ رہے تھے۔ بڑی مشکل سے بٹھائے رکھا میں نے......"

بیج ناتھ نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔" یار کمال کرتے ہو۔ آخر گھبرانے کی کیا بات تھی۔

دوست کی سادگی اور اخلاص دیکھ کر رکھی کو شرم سی محسوس ہونے لگی۔ اور وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

" کہو کھانا کھا لیا۔"

" ہاں۔"

" آؤ تو چلو جیلانی کے ہاں۔"

راستے میں بیج ناتھ دعوت کی باتیں کرتا رہا۔ کہنے لگا۔ ڈاکٹر شرما میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ بڑے پریم سے کھانا کھلایا۔ واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ ہزار حیلوں سے جان چھڑا کر آیا ہوں۔"

جب وہ جیلانی کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی فوجی رشتہ دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ برج نہ کھیل سکیں گے۔

ان کا پروگرام درہم برہم ہوگیا۔ خیر وہ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر ٹہلتے رہے۔ پھر بیج ناتھ نے کہا۔" آؤ گھر پر بیٹھیں سردی بہت زیادہ ہے۔"

" بھئی اب اجازت دو۔ اب میں گھر واپس جاتا ہوں۔ پھر ملاقات ہوگی۔"

چناں چہ مصافحہ کر کے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

آج کے مسرت انگیز واقعہ سے اس کا دل اگرچہ مسرور تھا لیکن دوست سے اس پاجی پن کے باعث ضمیر ملامت بھی کرتا تھا اور جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اپنی نیک اور معصوم بیوی کے تصور سے اس کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ بے چاری سردی میں ٹھٹھری ہوئی آگ کے قریب بیٹھی اُس کا انتظار کر رہی ہوگی......

جب وہ جیا کی دکان کے قریب پہنچا تو حسب معمول اس سے پوچھا۔ ''کیوں بے جئے کوئی آیا تو نہیں تھا۔ ہمیں ملنے کے لیے.....''

جیا نے سر اوپر اٹھایا۔ ''اجی بابو بیج ناتھ آئے تھے۔ سیدھے بھیتر چلے گئے مجھ سے تو کچھ بولے نہیں۔ جب آپ نہیں آئے تو بے چارے انتجار کر کے چلے گئے۔''

''بیج ناتھ!'' اس کے حلق میں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔

''ہاں جی...... بیج ناتھ بابو۔''

دکان سے مکان تک چند قدم کا فاصلہ اُس نے بہت آہستہ آہستہ طے کیا۔ جب وہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا۔ تو اس نے دیکھا کہ اکھڑی ہوئی دو اینٹیں پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔ اس نے احتیاط سے اُنہیں لگا کر رکھ دیا...... اور پھر ایک لمحہ بھر کے سکوت کے بعد اُس کے منہ سے مدھم سی ہنسی نکل گئی — اور جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہاں پر ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ ماحول پر سکون اور آرام دہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی بیوی اندر والے دروازے میں کھڑی دکھائی دی۔ وہ اس وقت نو شگفتہ پھول کی مانند تر و تازہ اور اجلی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پھول جس کا منہ شبنم نے بڑی احتیاط سے دھو ڈالا ہو۔ جس پر جمی ہوئی گرد کی نا معلوم تہہ کو کسی نے چوم چوم لیا ہو۔

وہ بڑے کوچ پر بیٹھ گیا۔

شانتا شاخ گل کی طرح لچکتی ہوئی نزدیک آئی اور اُس کے قریب کوچ میں دھنس گئی۔

اس نے سر سے پاؤں تک بیوی کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولا۔ "شنو! آج تو تم بہت خوش دکھائی دیتی ہو۔"

اپنے مخصوص انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ لجا کر مسکرا دی۔ اس کے تر و تازہ ہونٹوں میں سے سپید سپید دانت کسی حد تک نمایاں ہوئے اور اس نے بلا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھے پر رخسار لگا دیا۔

شنو کی نیند کی ماتی پلکیں بوجھل ہو کر جھکنے لگیں۔

وہ چند لمحوں تک شنو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اُس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر بولا۔ " میں بھی بہت خوش ہوں شنو! ـــــ ذرا اِدھر لاؤ تو عبداللہ سگریٹوں کا ڈبہ۔"

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

رقیب

جب ابا کا تبادلہ چوہڑکانے سے لاہور ہوگیا تو ہمارے گھر کے سب لوگوں نے مسرت کا اظہار کیا۔

چوہڑکانہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ وہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ ابا چوں کہ مقامی سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر انچارج تھے۔ اس لیے گھر کے سب لوگ بھی ان کے ساتھ بندھے تھے۔ میں تو پہلے ہی لاہور میں پڑھتا تھا۔ موج اڑاتا تھا۔ صرف کھانے کی تکلیف تھی۔ میرے بھائی اور بہنیں میری خوش بختی پر رشک کرتی تھیں کہ مجھے لاہور جیسے شہر کا ماحول نصیب ہے۔ لاہور مجھے بھی پسند تھا لیکن خراب کھانا ملنے کے باعث میرے کمزور معدے میں ہمیشہ گڑ بڑ رہتی — اور ابا کے لاہور میں تبادلے پر تو گویا سبھی کی امیدیں بر آئیں۔

کوئینز روڈ پر ہمیں ایک شان دار کوٹھی کا نصف حصہ مل گیا۔ نصف میں مالک مکان رہتے تھے۔ باقی نصف میں ہم کہنے کو تو ہمارے حصے میں نصف کوٹھی ہی آتی تھی لیکن ہمارے جیسے دو کنبے اس میں بخوبی رہ سکتے تھے۔ کوٹھی کے ارد گرد کھلے لان، سرسبز باڑ خوش وضع کیاریاں، درختوں اور گلاب کے پودوں کے جھنڈ کھڑے عجب بہار دکھاتے تھے۔

جب شروع کی مشکلات حل ہوگئیں۔ اور ہمارے پاؤں جم گئے۔ تو میں نے آتے جاتے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانی شروع کردی اور دو تین روز ہی کے بعد سامنے کی کوٹھی میں رہنے والی لڑکی سے آنکھیں لڑ گئیں، پہلے تو نگاہ غلط انداز تک ہی اس نئی محبت کو محدود رکھا گیا۔ لیکن جب رفتہ رفتہ بے تکلفی بڑھنے لگی تو ایک روز بڑی آپا سے کھل کر یہ کہنا پڑا۔ " آپا! آپ چپ چاپ گھر میں پڑی رہتی ہیں۔ اِدھر اُدھر کسی سے دوستی گانٹھئے، کسی کو سہیلی بنایئے۔"

مگر آپا ضرورت سے زیادہ سمجھ دار واقع ہوئی تھیں۔ خیر یہاں تک تو مجھے بھی کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُن کی صاف گوئی مجھے قطعاً پسند نہیں تھی بولیں۔

" کیوں کسی سے آنکھ لڑ گئی ہے تمہاری کیا؟"

" لیجئے اور سنئے — میں کیا کہہ رہا ہوں۔ اور آپ کیا نتیجہ نکال رہی ہیں نہ معلوم آپ مجھے کیا سمجھے بیٹھی ہیں۔ آپ ہی کے بھلے کی بات کہہ دی تو آپ لگیں —"

" سچ سچ میرے بھیا۔" وہ مجھے پچکارنے لگیں۔ " ناں بھئی ہم نے غلطی ہوئی۔ ہاں تو تو وہ کیا بات تھی۔ جو تم میرے بھلے کے لیے کہہ رہے تھے۔"

ان کی باتوں سے شرارت صاف ظاہر تھی لیکن میں ایسا شرمانے والا نہیں تھا کہ منہ میں آئی بات نہ کہوں بولا۔ " میں تو کہہ رہا تھا کہ آپ اکیلی گھر پر پڑی رہتی ہیں۔ ہمارا کیا ہے، ہم سارا دن کالج میں رہتے ہیں۔ شام کو سیر کرتے ہیں۔ ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہیں۔ جہاں جی چاہے جائیں۔ صرف آپ کی حالت دیکھ کر رحم آتا ہے اور اسی لیے یہ تجویز پیش کردی تھی کہ آپ کوئی نہ کوئی سہیلی بنا ڈالیے۔"

" کہاں بھیا اس اجاڑ میں تو کسی کی صورت تک دکھائی نہیں دیتی۔ سہیلی کسے بنائیں۔" آپا نے بن کر جواب دیا۔

" آپا غلطی آپ ہی کی ہے۔ اگر کبھی کوٹھی سے باہر نکلیے تو دیکھئے کیسی کیسی لڑکیاں موجود ہیں یہاں پر۔"

" یہ کیسی کیسی سے کیا مراد ہے تمہاری؟"

''یہی کہ کیسی سمجھ دار پڑھی لکھی' لائق' مہذب''

''بھئی ہمیں تو آج تک ایسی کوئی لڑکی دکھائی ہی نہیں دی۔''

میں نے بھانپ لیا کہ آپا مجھے گھیر گھار کر میری زبان سے میری پسند کی لڑکی کا نام سننا چاہتی ہیں۔ جب اُنہیں بتا دیا تو انہوں نے خوب الو بنایا — لیکن آخر بڑی بہن تھی۔ میری خاطر تسنیم سے بہناپا گانٹھا اور تسنیم تو گویا ایک اشارے کی منتظر بیٹھی تھی۔ دن میں کئی پھیرے کرنے لگی — میرا کمرہ بھی علاحدہ اور باہر کی جانب تھا۔ ہر آنے جانے والے کو میری کھڑکی کے قریب سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ تسنیم بھی جتنی مرتبہ آتی ہیں اس کی زیارت کرتا، اشاروں اور کنایوں کے بعد بات چیت اور بات چیت کے بعد نوبت چھیڑ چھاڑ تک جا پہنچی!

تسنیم بڑی چلبلی اور بے باک لڑکی تھی — اور یوں تو ہر شخص کو اپنی صورت کی بابت کچھ نہ کچھ غلط فہمی ہوتی ہی ہے اور ممکن ہے مجھے بھی ہو۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں اس زمانے میں خاصہ حسین سمجھا جاتا تھا اور اس لیے لڑکیوں سے تعلقات پیدا کرنے میں مجھے بہت کم ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اور مجھے اپنے آپ پر بڑا بھروسہ تھا!

ہم دونوں کی محبت نے بہت جلد ابتدائی منازل طے کرلیں۔ اور بالآخر ہم انتہائی منزل تک جا پہنچے...... آپا میری راز داں ضرور تھیں۔ لیکن انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ ہم ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ تسنیم کی کوٹھی کے گیراج میں بھی ملتے ہیں۔ اس چوری پر بعض اوقات میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ لیکن کون سنتا ہے ان باتوں کو میں نے بہت جلد اس پر قابو پالیا اور چین سے گذرنے لگی۔

ان ہی دونوں ذاکر سے ملاقات ہوئی، ذاکر ہمارے مالک مکان کا لڑکا تھا۔ میں بی اے آنرز کی تیاری کر رہا تھا۔ اور وہ نفسیات میں ایم اے کرنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ نفسیات کا شوقین تھا اور اس مضمون کا بہت اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ نہ معلوم اس قسم

کے مضامین سے دلچسپی رکھنے والوں کی صورتیں ہی ایسی ہوتی ہیں۔ یا وہ یوں ہی وحشت زدہ سے رہتے ہیں۔ اس کے چہرے سے نحوست ٹپکتی تھی۔ سر بہت بڑا تھا۔ لیکن اس پر اُگے ہوئے بال بہت کم اور بہت باریک تھے۔ اس کے بال تھے کہ انہیں کسی طرح بھی نہیں سمیٹا جاسکتا تھا۔ کچھ بال کھڑے ہیں۔ کچھ پڑے ہیں کچھ ایک پہلو کو جھکے ہوئے ہیں۔ کچھ پیشانی پر گرے ہوئے ہیں تقریباً بے بال کی بھنوؤں تلے اس کی زرد زرد آنکھیں مقابل کو ایسی سرد نظروں سے دیکھتی تھیں۔ کہ دل بیٹھ جائے، ناک بلند اور منہ کا دہانہ چوڑا۔ جو ربڑ کی طرح کھینچ کر گوشوں سے نیچے کی جانب جھک گیا تھا۔ اس کے کپڑے نہ صرف اچھی طرح دھلے نہیں ہوتے تھے بلکہ اسے انہیں پہننے تک کا سلیقہ نہیں تھا۔ بڑے بوڑھوں کی طرح اس کے ہاتھ میں بڑی نہ سہی چھوٹی سی چھڑی ضرور ہوتی تھی جسے وہ ہر دم ہاتھ میں یا بغل میں دبائے رکھتا۔ یوں تو اس وقت میرا بدن بھی اکہرا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ دبلا پتلا تھا۔ قد میری طرح لمبا بلکہ مجھ سے بھی کچھ نکلتا ہوا۔ جب وہ بے ڈھنگے پن سے قدم اٹھاتا ہوا چلتا تو دیکھنے والے کو یہی خدشہ ہوتا تھا کہ بس گرا کہ گرا۔ چناں چہ پہلے روز جب میں نے اسے پھاٹک میں داخل ہوتے اور اپنے کمرے کی جانب اس انداز سے آتے دیکھا جیسے ہوا کے جھونکے اسے اڑائے لا رہے ہوں تو تعجب ہوا۔ الٰہی یہ کون ہے۔ شاید ابا کا کوئی دوست ہے — مگر جب وہ میرے کمرے کے سامنے پہنچ کر رُک گیا تو میری حیرت اور بھی بڑھی۔ اور جب اُسے اِدھر اُدھر بے معنی نظروں سے دیکھتے پایا تو پوچھا "فرمایئے آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔ پھر عینک تھام کر مزید غور سے مجھے ملاحظہ فرمایا۔ اور بالآخر مسکرانے لگا یعنی بے حس چہرے پر زندگی کے آثار پیدا ہوگئے۔ "میں آپ ہی سے ملنے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چپ ہوگیا۔ میں منتظر تھا کہ وہ کچھ اور کہے لیکن اُس نے گویا پہیلی سنا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ کہہ ڈالا تھا۔ "اب بوجھو تو جانیں۔"

تنگ آ کر میں نے کہا۔ "اندر تشریف لے آیئے نا۔"

وہ کچھ کہے بغیر میرے کمرے میں چلا آیا کرسی پر بیٹھتے ہی بولا۔ ''عین ممکن ہے کہ میں کچھ دیر تک اسی جگہ بیٹھا رہوں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ پہلے میں یہاں آنے کا مقصد بتاؤں۔''

یہ کہہ کر پھر چپ۔ واللہ! کون کہتا ہے کہ فلسفی نصف پاگل ہوتے ہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا۔ ''نہیں قبلہ ابھی مدعا ظاہر کرنے کی جلدی بھی کیا ہے۔''

اس کی نظریں چاروں طرف گھوم گھوم کر ہر شے کی طرف سست اور پر اسرار انداز سے دیکھتی رہیں۔ آخر کہنے لگا۔ ''آپ کل شام میرے غریب خانے پر آیئے گا۔ یہ میری درخواست ہے حکم نہیں۔ امید ہے کہ آپ کو یہ تجویز پسند آئے گی۔ حالانکہ پسندیدگی کی کوئی وجہ ہے ہی نہیں۔ تاہم بظاہر آپ کو اس پر اعتراض بھی کیا ہوسکتا ہے لیکن اس بات سے میرا مطلب یہ نہیں کہ میں آپ کی آزاد رائے میں دخل دوں۔ ممکن ہے اس بات پر آپ کو روسو کا وہ مقولہ یاد آجائے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن پا بہ زنجیر نظر آتا ہے حالانکہ میں اس مقولے کا قائل نہیں ہوں۔ خدارا اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں فاشسٹ ہوں البتہ اس کی بابت اتنا—''

میں نے بڑی لجاجت سے جواب دیا۔ ''قبلہ مجھے منظور ہے۔''

''کیا منظور ہے آپ کو؟''

''وہ جو آپ چاء کے لیے فرما رہے تھے۔''

''کون سی چاء۔''

''آپ نے مجھے چائے کی دعوت دی ہے نا گھر پر۔''

''اوہ ...... یس یس خوب یاد آیا...... ہاں تو چائے...... جی ہاں تو چائے پینے کے لیے آیئے گا نا؟''

''ضرور!''

اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور چند لمحوں تک مسکراتا رہا۔ غالباً کوئی اور بات

سوچنے لگا ہوگا۔ پھر بولا۔" میں نفسیات میں ایم اے کا امتحان دے رہا ہوں۔"

"خوب" گو میں یہ بھی کہنے کو تھا" قبلہ یہ جتانے کی ضرورت ہی کیا ہے یہ تو—"

" غالبًا آپ بھی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔"

" جی۔"

" آپ کو فلاسفی یا نفسیات سے بھی کچھ دلچسپی ہے۔"

" جی نہیں۔ اگر مجھے فلسفے سے دلچسپی ہوتی تو میں اس قدر جلد آپ کی دعوت منظور نہ کر لیتا بلکہ کم از کم آپ سے پوچھتا کہ آپ کون ہیں کہاں سے تشریف لائے ہیں۔ مجھے کس سلسلے میں چائے پلا رہے ہیں اور جناب کا دولت خانہ کہاں ہے۔

اس بات پر اُس رونی صورت پر بھی سچ مچ ہنسی آ گئی۔" ہم لوگ پڑوسی ہیں آپ ہمارے مکان میں رہتے ہیں۔ اسی لیے وجہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی اور پھر شیخ سعدؔی نے فرمایا ہے......"

میں نے گھبرا کر کہا۔"معاف کیجئے۔ مجھے ذرا اندر بلا رہے ہیں وہ آپا اشارے کر رہی ہیں آپ دس پندرہ منٹ انتظار کیجئے۔ میں ابھی واپس آتا ہوں اگر پندرہ منٹ کی بجائے آدھ گھنٹہ یا بڑی بات ہے ایک گھنٹہ ہی لگ جائے تو آپ برا نہ مانئے گا۔ آخر ہم پڑوسی ہی ہیں اور یہ گھر ہے بھی آپ ہی کا۔" یہ فلسفیانہ گفتگو اس کی سمجھ میں آ گئی بولا۔" نہیں میں اب جاتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ کل آپ تشریف ضرور لائیں گے۔"

ضرور لیکن کہیں آپ یہ نہ بھول جائے گا کہ آپ نے ایک شریف آدمی کو چائے پر بلا رکھا ہے۔"

" اوہ۔ لو— میں اپنی امی سے جاتے ہی کہہ دوں گا۔ وہ کل خود ہی یاد کرا دیں گی...... اچھا گڈ ایوننگ۔"

دوسرے روز میں ان کے ہاں چائے پینے کے لیے گیا۔ گھر کے سب لوگ بڑے اخلاص سے ملے۔ اس روز سے نہ صرف ہمارے گھرانوں کا میل جوڑ بڑھ گیا۔

بلکہ ہم دونوں کے تعلقات بھی گہرے ہوگئے۔ ذاکر کی بہنیں تو تھیں لیکن بھائی کوئی نہیں تھا اس لیے گھر میں اس کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ اس کا ذہن چوں کہ فلسفے کی طرف راغب تھا۔ اس لیے اس پر سے کئی پابندیاں اٹھا دی گئیں تھیں۔ سوئے ہیں تو بس سوئے پڑے ہیں۔ کوئی جگانے والا نہیں اگر ٹہلنے پر آئے تو ٹہلتے چلے گئے۔ خاموشی پر اترے۔ تو پھر کسی بات کا کوئی جواب ہی نہیں۔ بکنے کو جی چاہا تو نوکروں ہی سے بحث شروع کردی خواہ گھر کے رکے کام رکے پڑے رہیں۔

پہلے پہل مجھے کچھ الجھن سی محسوس ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ میں ذاکر سے مانوس ہوگیا۔ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ ذاکر میری دوستی کا خواہش مند تھا۔ میری بے اعتنائی کی کبھی شکایت ہی نہیں کرتا تھا۔ اور اگر کبھی میں اس کے فلسفے کا مذاق بھی اڑاتا تو وہ برا نہ مانتا تھا۔ مجھے فلسفے سے دلچسپی ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہر شخص کی طرح مجھ پر اس کا رعب طاری تھا۔ جب میں نے ہر پہلو سے غور کرلیا تو یہ نتیجہ نکالا کہ ذاکر کی ہستی واقعی قابل قدر ہے۔ چناں چہ میں نے ان جانے ہی...... اسے اپنا دوست قبول کرلیا۔

دوستوں میں ایک دوسرے سے برابر ہی کا سلوک کیا جاتا ہے۔ لیکن ذاکر کی مجھ پر کچھ خاص ہی نوازشیں تھیں۔ ہوٹلوں میں کھانا کھلاتا' چائے پلاتا' سنیما کے دام بڑے اصرار سے اپنے پلے سے خرچ کرتا اور پھر میری طرح تھا وہ بھی پکارند۔ اگر کوئی تکلیف دہ بات تھی تو وہ اس کا فلسفیانہ موڈ تھا جو اس پر تقریباً ہر وقت طاری رہتا — ہاں مگر مجھے کبھی کبھی خیال آتا کہ آخر اس کی مجھ پر اتنی عنایات کیوں ہیں۔ ہزار سر پھوڑنے پر بھی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ مجھے اپنا بہت ہی عزیز دوست سمجھتا ہے۔ اور دوستوں میں کھلانا، پکانا کا روباری انداز میں تو ہونا ہی نہیں چاہئے۔ خصوصاً ذاکر کو تو اس بات سے بہت چڑ تھی!

اس کے فلسفیانہ انداز زندگی کے پیش نظر میں نے مناسب سمجھا کہ اسے کھیل کود کی طرف راغب کر کے نفسیات کا بھتنا اُس کے ذہن سے دور کیا جائے اور جب میں

نے باتوں ہی باتوں میں اس سے اس بات کا ذکر کیا تو توقع کے خلاف اُس نے بڑی گرم جوشی سے حامی بھری۔ ہمارے ہاں کافی جگہ موجود تھی۔ ہم نے بیڈمنٹن کورٹ تیار کرنے کی تجویز سوچی اپنے ہاتھوں سے زمین کا ٹکرانا پا۔ گھاس کھود کھود کر چونے سے لکیریں لگائیں۔ دونوں طرف بانس گاڑے اور اسی شام ذاکر بھی آستینیں چڑھائے اپنی دبلی پتلی بانسی بانہوں کا مظاہرہ کرتا پھرا۔

جب ہم نے باقاعدگی سے کھیلنا شروع کیا تو بڑی آپا کا جی بھی چاہنے لگا۔ سب آپس ہی کی لڑکیاں تو تھیں۔ میری بہنیں تھیں یا پھر ذاکر کی۔ بعد میں پھر تسنیم کو بھی کھیلنے پر آمادہ کیا گیا۔ شروع شروع میں لڑکیاں الگ کھیلتیں اور پھر لڑکیاں اور ہم ایک ہی ساتھ کھیلنے لگے۔

ایک شام کھیل ختم ہونے کے بعد اور تو سب چلے گئے۔ مگر آپا اور ان کی سہیلی ممتاز لان میں بیٹھی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ آپا اب بہت چست نظر آنے لگی تھیں۔ میرے دل میں آئی کہ انہوں مبارک باد دوں۔ کہوں کہ آپا، دیکھانا، کھیل کود کا صحت پر کتنا اچھا اثر ہوتا ہے۔ اگر آپ پردے کی قائل ہیں تو بڑی خوشی سے پردہ کیجئے۔ لیکن پردے میں کھیلنا کودنا بھی تو جاری رکھئے — دیکھئے تو پھر صحت کیسی شان دار ہوجاتی ہے — مگر آپا کہہ رہی تھیں۔ صحت بنانے کا بھوت سوار ہے قاسم کے سر اور ادھر اُدھر کی کوئی خبر نہیں اُسے —"

میرے دل میں آئی کہ کھڑکی میں سے چلاؤں، تو کیا جھوٹ تھوڑے ہی کہتا تھا میں۔ آپ ہی کہئے، اب آپ کو کچھ فرق محسوس نہیں ہوتا پہلے تو آپ کا یہ بدن دکھتا تھا — اب فرمایئے نا" — مگر وہ تو تسنیم کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں میں چونکا۔

"اری یہی تسنیم کی بابت کہتی ہوں۔"

"کیوں کچھ گڑ بڑ ہے کیا؟ ممتاز نے پوچھا۔

"گڑبڑ سی گڑبڑ۔ اب تو تسنیم کے نئے عاشق پیدا ہو رہے ہیں۔"

میرا دل دھڑکنے لگا — آپا قسمیں اٹھا اٹھا کر ممتاز کو یقین دلا رہی تھیں۔ ''نہیں اللہ قسم سچ کہہ رہی ہوں۔'' میں نے چاہا کہ پوچھوں کیا بکتی ہو آپا — مگر ممتاز آپا کی منت کر رہی تھی۔ ''اب نام بھی بتا دو نا اچھی'' — آپا نے قدرے توقف کیا، پھر ابرو کا اشارہ کر کے بولیں۔ ''یہی ہمارے فلاسفر — جناب ذاکر''

دل میں آئی آپا کی اس دریافت پر قہقہہ لگا دوں — تسنیم اور ذاکر!

''تمہیں وہم ہوگیا ہے'' ممتاز نے آپا سے کہا۔ ''کہاں بے چارہ فلسفی اور کہاں عشق کے یہ جھنجٹ دونوں میں کوئی جوڑ بھی ہے؟''

آپا بولیں۔ ''تو فلسفیوں کے پہلو میں دل نہیں ہوتا کیا۔ سر سے پاؤں تک دماغ ہی دماغ ہوتا ہے!''

میرے دل پر جیسے ایکا ایکی بجلی سی گر پڑی ہو — اتنی ہمت نہ رہی کہ آپا سے پوچھوں تیرے پاس ثبوت کیا ہے تسنیم پر یہ الزام لگانے کا — ذاکر کے بے ڈھنگے قدم ساری رات میرے دماغ کو لتاڑتے رہے رات بھر یہی سوچتا رہا کہ دیکھنے میں کیسا سنجیدہ، شریف — بدھو دکھائی دیتا تھا۔ لیکن بڑا دل پھینک ثابت ہوا۔

جی میں آئی کسی بہانے شہر سے باہر لے جا کر قتل کردوں اسے۔ کسی کو کانوں کان خبر تک بھی نہ ہوگی۔ میں نے قتل کرنے کی تفصیلات پر غور کیا۔ میری انگلیوں کی گرفت میں آئی ہوئی اس کی پتلی گردن — وہ بے چارہ عالم نزع میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے گا۔ بالآخر وہ بالکل ٹھنڈا پڑ جائے گا۔ میں اسے کسی گڑھے میں پھینک کر اس کے اوپر پتیاں بکھیر دوں گا — جوش میں اسی طرح کی کئی اور بے کار باتیں سوچتا رہا۔ لیکن جلد ہی مجھے اس بات کا احساس ہوگیا۔ یہ سب کچھ بے معنی ہے۔ اب مجھے اس سے بات صاف صاف کرنی چاہئے۔

چھٹیوں کے دن تو تھے ہی۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے اسے بلوا بھیجا۔ کچھ دیر بعد دیکھا کہ دور ہی سے اپنے مخصوص انداز میں لہراتا چلا آرہا ہے۔ سچ مچ

اس کے چہرے سے نحوست ٹپکتی تھی۔ ہاں پچھلے دنوں میں مجھے وہ اچھا معلوم ہونے لگا تھا۔ مگر اس حرام زادے کے دل میں کثافت جو بھری تھی۔ آخر اسے ظاہر ہونا ہی تھا۔ اور وہ اس کی حرکات سے عیاں ہوگئی۔

وہ حسب معمول رونی صورت بنائے بڑی بے تکلفی سے آرام کرسی میں دھنس گیا۔ اور پھر موٹا سا سگار سلگا کر بولا۔" کہو بھئی کچھ خاص کام ہے یا یوں ہی بلایا ہے۔" یہ کہہ کر اس نے تیز بو کا بھبو کا اڑایا۔ مجھے سگار سے نفرت ہے لیکن سگریٹ سلگانے میں کوئی ہرج نہیں جانتا۔ میں نے زبان پر لگے ہوئے تمباکو کے ذروں کو زور سے باہر کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔" ہاں خاص کام سے بلایا ہے۔"

اس نے ٹانگیں اٹھا کر پاؤں سامنے کی کرسی پر جما دیئے۔ ہوں — تو پھر کہو۔

میں نے اس پر بہت سخت حملہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی — " ذاکر میں بہت صاف گو شخص ہوں۔ تمہاری طرح لاگ لپٹ کرنا نہیں جانتا۔ تمہیں شاید یہ یاد ہو۔ دوستی میں بھی تم ہی نے پہل کی تھی۔ جب میں نے تمہیں خاص دوست کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ تو تم نے دوستی کے پردے میں نہایت حرام زدگی کا ثبوت دیا۔ تم فلسفی بنتے ہو۔ دنیا بھر کے مسائل پر عالمانہ تقریریں جھاڑتے ہو۔ لیکن عملی طور پر تم پست درجہ کے انسان ہو۔ تمہیں معلوم تھا کہ میں تسنیم سے محبت کرتا ہوں اور اب تم نے اس پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے ہیں کیا تمہیں اپنی اس ذلیل حرکت پر شرم محسوس نہیں ہوتی۔"

میں چپ ہوا تو وہ قدرے سکوت کے بعد بولا۔" تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے یا سب گالیاں دے چکے؟"

میں نے منہ سے کف اڑاتے ہوئے کہا۔" کیا میں جان سکتا ہوں کہ تم تسنیم کو محبت کی نظروں سے کیوں دیکھتے ہو۔"

" ہاں تم جان سکتے ہو" یہ کہہ کر اس نے گھما کر کرسی کا رخ میری جانب کر لیا۔ اور پھر ٹانگیں پھیلا کر سگار کے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ دھواں چھوڑتے وقت جب وہ

ہونٹ بڑھا کر اپنے لمبوترے منہ کو اور بھی لمبوترا بناتا تھا۔ تو اس کے رخساروں کی ہڈیاں اور بھی نمایاں ہو جاتیں۔ ان کے نیچے کی لکیریں اور گہری ہو جاتیں۔ دو چار مرتبہ کش لگانے کے بعد اس نے اطمینان سے میری نظروں سے نظریں ملائیں اور کہا۔ "اب میں تم سے چند سوالات پوچھوں گا۔ اگر تمہیں دوستی کا دعویٰ ہے تو سیدھے سادھے جواب دیتے چلے جاؤ۔"

پھر اس نے سگار کا گل جھاڑا اور بولا۔ "کیا محبت کرنے کا حق محض تم ہی کو حاصل ہے۔"

میں اس کے جواب میں ایک طویل تقریر کرنے لگا تھا۔ لیکن اس نے اشارے سے روک دیا۔ "دیکھو تم پہلے ہی اعتراف کر چکے ہو کہ تمہیں جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے۔ میں مختصر جواب چاہتا ہوں میرا سوال ہے کیا محبت کرنے کا حق تم ہی کو حاصل ہے؟"

"نہیں۔"

"لڑکیوں سے محبت کرنے کا کوئی لائسنس ہے جو تمہارے پاس ہے اور میرے پاس نہیں۔ کیا تم ہی ایک شخص ہو جسے یہ جذبہ وراثت میں ملا ہے؟"

"کیا تسنیم سے تمہاری محبت وقتی نہیں۔ کیا تم اس سے شادی کرو گے۔ کیا اپنے والدین کی طرف سے تمہیں اس بات کی اجازت مل گئی ہے۔"

"نہیں لیکن" —

"نہیں لیکن کیا؟"

پہلے میں نے اس سے محبت شروع کی تھی تمہارا فرض تھا کہ تم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے؟

"تمہیں یہاں آئے تو بہ مشکل جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں اور بندہ سالہا سال سے تسنیم کی محبت میں گرفتار ہے۔ اور پھر تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تمہارے آنے سے پہلے مجھے اس سے محبت نہیں تھی کیا تم یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ پڑوس میں

رہنے والی ایسی حسین لڑکی کو میں نے کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا۔"

"ممکن ہے فلسفے کی دھن میں......"

"چلو تمہیں یہ غلط فہمی ہوئی کہ فلسفے کی دھن میں مجھے اس کا خیال نہ آیا ہوگا لیکن اب میں تمہیں صاف صاف بتا رہا ہوں کہ مجھے اس سے کئی برس سے محبت ہے۔ اگر تم واقعی اس بات کے قائل ہو کہ جو محبت کرنا پہلے شروع کرے صرف اسی کو محبت جاری رکھنے کا حق حاصل ہے تو پھر تمہیں اس محبت سے کنارہ کش ہونا پڑے گا۔"

تسنیم کی محبت سے دست کش ہونے کے خیال سے میرا دل بوجھل ہوگیا۔ تاہم میں نے نسبتاً کم جوشیلی آواز میں کہا۔ "تو پھر تم نے مجھے پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔"

"لیکن دوست میں ایسا کیوں کرتا۔ مجھے تم سے کوئی حسد نہیں ہے۔ میں تمہاری راہ کا کانٹا نہیں بننا چاہتا تھا......"

"اب کانٹا ہی تو بن رہے ہو۔"

"احمق ہو تم۔ بھئی اتنا تو غور کرو میں اس قدر گہری محبت کو دل سے نوچ کر پرے کیوں کر پھینک سکتا ہوں...... یار افسوس کی بات ہے کہ عاشق بنے پھرتے ہو لیکن عشق کی الف بے سے بھی واقف نہیں ہو۔"

"لیکن ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔"

"اونہہ! یہ فرسودہ مقولہ کہاں سے نکال لائے۔ کون کہتا ہے کہ ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ میں کہتا ہوں کہ ایک میان میں ایک چھوڑ چار تلواریں سما سکتی ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"میان کو ذرا کشادہ کر لیا جائے۔ یعنی ہم دونوں اپنی نظروں میں وسعت پیدا کر لیں۔ دیکھو میں نے تمہاری محبت کا آغاز اور پھر اسے پروان چڑھتے دیکھا۔ لیکن میرے دل میں کوئی میل نہ تھا اور چاہتا تو اس محبت کو شروع ہی میں رکوا دیتا — اسے

دھمکی مت سمجھنا ــــ مجھے تمہارا وہ گیرج والا راز بھی معلوم ہے۔ لیکن میں نے تمہاری یا تسنیم کی آبرو پر حرف نہیں آنے دیا۔ اگر غور سے دیکھو تو میری محبت تمہاری نسبت زیادہ مضبوط اور ارفع ہے۔"

اب میں اس کے منحوس چہرے کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا اور وہ اطمینان سے سگار پی رہا تھا۔ "لیکن ذاکر! اسے تم سے ذرہ برابر بھی محبت نہیں۔ پھر ان باتوں سے کیا حاصل؟"

"اسے مجھ سے محبت نہیں۔ تو مجھے تو ہے نا اس سے سچی محبت، اور وہ میرے دل کی جلن کو نہیں سمجھتی۔ لیکن تم تو سمجھتے ہو تمہیں نہ میری دوستی پر شبہ ہے نہ میرے عشق پر اس لیے تم پر جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے اس کا خیال رکھو۔"

میں نے ہکلا کر کہا۔ "میں...... میں...... میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"گیراج کی تاریکی میں تم مجھے اندر بھیج سکتے ہو۔ اس قدر اندھیرے میں اسے کیا پتہ چلے گا کہ کون ہے...... دیکھو بھائی میں تمہارا سچا دوست ہوں اور اس دعوئی پر تو تمہیں بھی کوئی شک نہیں ــــ تم نے میری محبوبہ پر میرے دیکھتے دیکھتے ڈورے ڈالے۔ مگر میں نے اف تک نہیں کی...... اب آگے تم خود سمجھ دار ہو میں تو ہمیشہ حقائق سامنے رکھ کر قدم اٹھاتا ہوں۔"

میں چپ رہا۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے مجھے خاموش دیکھ کر پر معنی لہجہ میں کہا۔ "آج گیراج والا پروگرام ہے نا تمہارا؟"

میرے دماغ میں غبار سا چھایا ہوا تھا۔ نہ کچھ سوچ سکتا تھا نہ بول سکتا تھا۔

ذاکر نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ درخواست ہے حکم نہیں امید ہے کہ تمہیں یہ تجویز پسند آئے گی۔ حالانکہ پسندیدگی کی کوئی خاص بات بھی نہیں۔ تاہم بظاہر تمہیں اعتراض بھی کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں تمہاری آزاد رائے میں ناجائز حد تک دخل دینا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے اس سے تمہیں روسو کا وہ مقولہ

یاد آجائے کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے لیکن پابہ زنجیر نظر آتا ہے حالانکہ میں اس مقولے کا قائل نہیں ہوں۔ خدا را اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ میں فاشسٹ ہوں۔ البتہ اس مقولے کی بابت اتنا......

——————— اس رات ہم گیراج سے کچھ دور کھڑے تھے تسنیم گیراج میں گھسی تو ذاکر نے میرے ہاتھ میں سگریٹوں کا ڈبہ تھماتے ہوئے کہا۔'' تھینک یو'' لو یہ فائیو فائیو فائیو کا ڈبہ ہے تمہارے لیے ...... اس میں سے میں نے صرف دو سگریٹ پئے ہیں۔''

یہ کہہ کر اس نے بچے ہوئے سگریٹ کا ٹکڑا منہ سے نکال کر پھینک دیا اور اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے جس نے اسے برسوں سے منہ نہ لگایا تھا بے ڈھنگے قدم ناپتا ہوا آگے بڑھا اور پھر چپکے سے گیراج کے اندر داخل ہوگیا۔ جب کچھ عرصے تک کوئی آواز......شور سنائی نہ دیا تو میں نے سمجھ لیا کہ سارا معاملہ او کے ہے۔ پھر میں نے فائیو فائیو فائیو کا ایک سگریٹ نکالا اور اسے زبان سے تر کرنے لگا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ عرصے تک سلگتا رہ سکے!''

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

پیپرویٹ

وہ کتنا خوش تھا۔ آخر چھبیس برس کی عمر بھی کیا ہوتی ہے۔ اسے ترقی دے کر اب بنک کا منیجر بنا دیا گیا تھا۔ آہا! اس کی مسرت کا بھلا کیا ٹھکانہ تھا۔ وہ دفتر سے گھر اڑ کر پہنچا جب وہ مدن منیشنز کے صحن میں داخل ہوا تو دفعتاً اس کے لبوں کی مسرت معدوم ہوگئی۔ اس کی بیوی آج پھر ڈرائینگ روم کی کھڑکی کھولے عین اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھی تھی......

اس نے فرحت کو بارہا منع کیا تھا کہ اس طرح کھڑکی کھول کر نہ بیٹھا کرے۔ سامنے کے فلیٹ پر غالباً کالج کے چند طلبا رہتے تھے جو اکثر تاک جھانک کرتے رہتے تھے۔ فرحت کی عمر بہ مشکل بیس برس ہوگی۔ کاشمیری ماں کی بیٹی تھی۔ کون تھا جو اسے بے پردہ اپنے سامنے پائے اور پھر دل مسوس کر نہ رہ جائے۔ اور طلبا بظاہر بڑے شریف بنتے تھے۔ کبھی کوئی بدتمیزی نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ ضرور تاک جھانک کرتے ہیں۔ اگر وہ صحن میں گوالے سے بھی باتیں کرتے تو اُسے یہی شبہ ہوتا کہ فرحت کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر فرحت کو سمجھاتا تو وہ کہتی۔ دیکھ لیں گے تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ کیا میں اندر دم گھونٹ کر مرجاؤں اور جب بہت خفا ہوتا تو کہتی اچھا آئندہ نہیں بیٹھوں گی...... لیکن وعدوں کے باوجود آج پھر وہاں بیٹھی تھی۔

وہ بھاری قدموں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا راستے میں وہ سوچتا جارہا تھا کہ آخر اس کا کیا علاج ہو۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے دستک دی۔ اندر سے شہد میں ڈوبی ہوئی آواز آئی۔ ''چلے آیئے۔ دروازہ کھلا ہے۔''

اس کے کانوں میں بیوی کی شیریں آواز گونج رہی تھی۔ وہ اس مٹھاس سے زبردستی لطف اندوز ہوگیا۔ چناں چہ جب اس نے اندر قدم رکھا تو بیوی پر ایک دم برس پڑنے کا خیال بھی کمزور پڑ گیا...... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ بیوی کی اس حرکت کو اور زیادہ عرصے تک برداشت کرنے پر رضا مند تھا۔ آج دوٹوک فیصلہ کردینا چاہتا تھا۔

اس نے ہیٹ اتارا۔ اور بے پروائی سے گھما کر کرسی پر پھینک دیا۔ پھر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے خشمگیں نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا لیکن وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے کاٹنے میں مشغول تھی۔ اس وقت فضا ایسی تھی کہ اگر وہ پینترا بدل کر ہنسنے کھیلنے لگتا تو بھی کچھ ہرج نہ تھا۔ آج خوشی کا موقع بھی تھا۔ لیکن وہ اس بات پر تلا ہوا تھا۔ اب اس معاملے میں زیادہ ڈھیل نہ دے گا۔

وہ منہ پھیر کر دوسری کھڑکی کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ اور پتلون کے دونوں سروں کو پکڑ کر اوپر کی طرف کھینچا۔ اس کی کمر پتلی تھی اور چوتڑوں کا ابھار بھی برائے نام ہی تھا۔ نیچے کو ڈھلک ڈھلک جاتی تھی۔ پھر وہ الٹ پلٹ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ بھی چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے سے تھے۔ انگلیاں پتلی اور نازک۔ ایک تو اس میں یہ بڑی کمی تھی کہ اس کے تیور مردانہ نہیں تھے۔ نہ اس کی آواز بھاری اور بارعب تھی چناں چہ خواہ وہ کس قدر بھی غضب کی حالت میں ہو۔ دیکھنے والے پر خاک رعب نہ پڑتا تھا۔

کھڑکی کے سامنے کھڑا کھڑا وہ انگلیاں چٹخاتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے ابرو پر بل ڈال کر بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ بچوں کے سے انہاک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ یہ بھی ایک بڑی بھاری دقت تھی۔ آخر وہ بچہ ہی تو تھی۔ اسے اشاروں اور کنایوں سے کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ وہ بے وقوف نہ تھی بس اس کے مزاج میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ اگر کوئی بات کہو تو نہایت بھول پن سے کوئی سوال پوچھتی۔ اس کا جواب دو تو پھر کوئی اور سیدھا سادا سوال پوچھ بیٹھتی۔ اب وہ محض لڑکی نہ تھی۔ شادی ہوئے لگ

بھگ ایک سال ہو چکا تھا۔ لیکن اسے اس بات کی بھی کچھ خبر نہ تھی کہ مرد کن بھوکی نظروں سے خوب صورت عورتوں کو دیکھتے ہیں۔ اسے اگر یہ بات سمجھائیے تو بس ایک ہی جواب دیتی...... دیکھتے ہیں تو دیکھنے دیجئے......"

اس نے جب دیکھا کہ فرحت کا دھیان اس کی طرف نہیں ہے تو اس نے منہ پھیر لیا اور سوچنے لگا کہ اب گفتگو کا آغاز کیوں کر کرے اگر وہ اس کی طرف دیکھ لیتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ خفا ہے۔ اب وہ سمجھ رہی ہے کہ شوہر کپڑے بدل رہا ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا۔ توں توں خفا ہونے کا امکان کم ہوتا جا رہا تھا۔ در اصل جھگڑا فوراً شروع ہو جانا چاہئے تھا۔ اس طرح سوچ سوچ کر خفا ہونے میں کوئی اثر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ چناں چہ اس نے مزید تاخیر کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے بیوی کی طرف پیٹھ پھیر لی اور کہا۔" فرحت!......"

" پھر وہ اپنی آواز کی نوعیت پر غور کرنے لگا کہ واقعی اس سے اس کی دلی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے یا نہیں — لیکن وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

" جی" — فرحت کی آواز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا ہے۔

اب اس نے فیصلہ کیا کہ اسے نہایت ڈرامیٹک انداز میں گھوم کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینی چاہئیں۔ اور اسے دیر ہرگز نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن جلدی کے یہ معنی بھی نہیں کہ اس کے چہرے سے غیظ و غضب کے آثار ہی مفقود ہوں۔ اس سوچ بچار میں کچھ دیر بھی ہوگئی۔ وہ گھوما تو چہرے سے جذبات کا اظہار تو بالکل صحیح طور پر ہو رہا تھا۔ لیکن افراتفری میں اس سے وہ جوشیلے الفاظ بھول گئے جو اسے اس موقع پر کہنے چاہئیں تھے۔ وہ چار لمحوں تک تو وہ چپ چاپ بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ملائے رہا۔ لیکن الفاظ نہ ملنے کے سبب وہ چہرے کے جذبات کی شدت کو قائم نہ رکھ سکا۔ وہ جانتا تھا کہ اب اُسے کچھ نہ کچھ کہنا چاہئے۔" فرحت! آج تم پھر کھڑکی میں بیٹھی ہو؟"

یہ سن کر فرحت نے بڑے طفلانہ انداز سے دانتوں تلے زبان کو دبایا۔ اور کھڑکی سے ذرا ہٹ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھی۔ وہ سوچنے لگا کہ فرحت کہیں موٹی تو نہیں ہو رہی۔ اسے پتلی عورت پسند نہیں تھی۔ وہ ذرا گدرائے ہوئے جسم والی عورت کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس وقت فرحت کا جسم آئیڈیل جسم تھا۔ لیکن اب اُسے اور زیادہ موٹا ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج اس کے ہاتھ اور پاؤں مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ صبح اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔ اس کے جسم کی رنگت پر مہندی کا رنگ خوب کھلتا تھا......

خاوند کو چپ چاپ گھورتے دیکھ کر فرحت نے کہا۔ ''اب تو میں کھڑکی سے ہٹ گئی ہوں۔''

اسے دفعتاً یاد آیا کہ اسے خفا ہونا چاہئے اور اس جھگڑے کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دینا چاہئے۔ لیکن کس قدر مشکل آن پڑی تھی۔ فرحت کو غلطی کا احساس تک نہیں تو پھر اسے اس حرکت سے باز کیوں کر رکھا جائے۔ آج کل کی لڑکیاں ساتوں آسمانوں کی خبر رکھتی ہیں۔ ایک فرحت تھی کہ بس لڑکپن کیا بچپن چھوڑتی ہی نہ تھی۔ صورت دیکھو، باتیں سنو، حرکات سکنات کا مطالعہ کرو کیا مجال جو گہرے سوچ بچار کی ہوا تک لگی ہو۔ ابھی تک جیلی اور کریم کھانے کی شوقین ہے۔ بندر بندریا کا تماشہ دیکھتی ہے۔ اگر کہیں کوئی بدھو شوہر مل گیا ہوتا تو اسے آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

پھر اس نے سوچا یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ مجھے اپنی بیوی کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تبھی اسے سیدھے رستے پر لایا جاسکتا ہے۔ چناں چہ ایک گہری بحث کے لیے مستعد ہو کر اس نے کہنا شروع کر دیا۔ دیکھو فرحت! اب میرے کہنے سے تم ہٹ گئی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم وہاں بیٹھتی ہی کیوں ہو؟''

فرحت نے اپنے ناخنوں کی سرخی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'' میں تو یوں ہی بیٹھ جاتی ہوں۔ اندر روشنی کم ہوتی ہے۔ ادھر روشنی بھی خوب ہے کھڑکی کھول دینے سے ہوا بھی آتی رہتی ہے......''

"تم ہوا کا بہانہ گھڑتی ہو ہمیشہ ......" پھر اس نے سوچا کہ یہ لفظ بہانہ" درست نہیں یہاں پر اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ مجھے فرحت کے چال چلن پر شبہ ہے۔ حالانکہ خواہ کچھ بھی ہو۔ فرحت کے کیریکٹر پر شک نہیں کیا جاسکتا...... میرا مطلب یہ ہے کہ بار بار اس بات کو دہراتی ہو۔ میں کہتا ہوں کہ غیروں کو دیکھنے کا بہانہ مل جاتا ہے اور وہ تمہیں دیکھتے رہتے ہیں۔" ...... پھر اس نے سوچا کہ فرحت کہے گی کہ اگر دیکھتے ہیں تو میرا کیا بگاڑ لیں گے...... دیکھو نا! دنیا کی زبان نہیں پکڑی جاسکتی...... اب یہ ناخنوں کا دیکھنا بند کرو...... جو میں کہتا ہوں وہ بھی تو سن لیا کرو غور سے......"

"میں سن تو چکی اتنی بار......"

اس پر اسے بڑا طیش آیا۔ "اگر سنا ہوتا تو عمل نہ کرتیں......"

"میں تو ہمیشہ غور سے سنتی ہوں۔"

"تو کیا کہہ رہا تھا میں؟"

فرحت نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے لاڈ سے منہ پھلا پھلا کر کہا۔" آپ کہہ رہے تھے کہ دنیا کی زبان پکڑی نہیں جاسکتی۔"

"ہاں تو میں......"

فرحت اٹھ کر اس کے قریب آگئی اور انگلیاں بڑھا کر بولی۔" لایئے میں آپ کی زبان پکڑلوں......"

"خدا کی قسم میں مار بیٹھوں گا...... اتنا بھی تو سمجھو کہ جب تم کھڑکی کھول کر سامنے جابیٹھتی ہو۔ تو دوسرے کیا سمجھیں گے؟

"تو اب وہاں کون بیٹھا ہے......"

"گڑ کھلا پڑا ہو تو کیا مکھیوں کو آتے دیر لگتی ہے؟"

"آتی ہیں مکھیاں تو آیا کریں۔ ہمیں ڈر ہے کسی کا؟"

"ہاں تم تو یہی کہو گی...... لوگ اس طرح بات کو نہیں ٹالتے۔

"تو وہ کیا کہتے ہیں؟......"

"کہتے کیا ہیں۔ یہی کہ عورت کی اپنی خواہش ہے کہ لوگ اسے دیکھیں۔ ورنہ خواہ مخواہ کھڑکی میں کیوں آن کر بیٹھے......"

"تو گویا آپ کا مطلب ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے دیکھا کریں......"

"توبہ میری...... بھئی میں نہیں کہتا لوگ کہتے ہیں......"

"آپ نے کسی کو کہتے سنا؟......"

"پھر وہی بات...... بھئی مجھے کہنے کی کسی کی مجال بھی ہے لیکن میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ آخر شریف عورت......"

وہ چپ ہوگیا۔ فرحت ایک پھول بالوں میں اڑس کر کھڑکی کے شیشے میں اچک اچک کر دیکھ رہی تھی کہ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے منہ پھیر کر اس سے مخاطب ہو کر بولی۔

"آپ چائے نہیں پئیں گے۔ آج سلائیس نمکین انڈوں میں تلے جائیں گے......"

"اور میں جو بات کر رہا تھا تم نے بیچ ہی میں کاٹ دی......"

"میں نے کب کاٹی بات آپ خود ہی چپ ہوگئے میں سمجھی بات ختم ہوگئی۔"

وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ انگلیوں سے کنپٹیاں دبانے لگا۔

"کیا سر میں درد ہے؟" فرحت نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔"

"تو چائے منگواؤں"

"نہیں میں چائے نہیں پیوں گا۔"

"واہ کیسے نہیں پئیں گے۔" یہ کہہ کر دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے کیے وہ مٹک مٹک کر آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

اب بڑا نازک وقت آرہا تھا۔ عنقریب فرحت اس کو گد گدائے گی۔ گلے میں باہیں ڈال کر لٹک جائے گی۔ لیکن وہ اپنی سنجیدگی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس انداز سے جیسے اس نے اس کی طرف دیکھا ہی نہ ہو۔ رکھائی سے بولا
"اچھا جلدی سے منگوالو۔ مجھے بہت ضروری کام سے باہر جانا ہے۔"

نوکر چائے لے آیا۔ چائے پیتے وقت اس نے سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دل ہی دل میں وہ سوچتا رہا کہ فرحت کو کیوں کر سمجھائے۔ چائے کے خاتمے پر اس نے تولیے سے منہ پونچھتے ہوئے فرحت کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ "فرحت! حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی حرکتوں سے مجھے بہت دکھ پہنچاتی ہو۔ میں نے تمہیں پیار سے سمجھایا خفا ہوا۔ لعنت ملامت بھی کی۔ لیکن نہ معلوم تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو......"

اتنے میں نوکر نے اطلاع دی کہ رشیدہ کی باجی ملنے آئی ہیں...... یہ سن کر فرحت کے چہرے پر مسرت کی لہری دوڑ گئی۔ اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ دل میں خدا کی از حد شکر گذار تھی...... اس سے پیچھا چھڑا کر وہ زنانے میں چلی گئی۔

فرحت کا اس انداز سے رخصت ہونا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ وہ فلسفیانہ انداز میں غور کرنے لگا کہ شادی شدہ انسان کی مسرت کا دار و مدار زیادہ تر اس کی بیوی پر ہوتا تھا۔ وہ بھی کیسے سنہرے دن تھے۔ جب وہ کنوارا تھا۔ اسی فلیٹ میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ یار دوست جمع ہوتے تھے۔ فرصت کا ہر لمحہ عیش و نشاط میں گذرتا تھا۔ رنج و فکر کو قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ اس وقت خوش رہنا قطعاً اپنے بس میں تھا۔ اب بیوی سے پالا پڑا تھا۔ وہ البیلے دوست بھی رخصت ہوئے اور بیوی گھر کی رانی بن بیٹھیں۔ رات گھر آنے میں ذرا دیر ہو جائے تو جواب طلب کرتیں۔ روٹھ جاتیں۔ بلکہ ٹھٹکنے لگتیں...... اب اس کا خوش رہنا بیوی کے ہاتھ میں تھا۔ اور بیوی کو اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ وہ بیوی سے مار پیٹ بھی نہیں کر سکتے تھا۔ جب کبھی انتہائی غیظ کی حالت میں اُسے مارنے پر تل بھی جاتا۔ تو پھر سوچنے لگتا کہ بیوی کے جسم کے کس حصے پر چپت مارے...... اور وہ کوئی فیصلہ

نہ کر پاتا......

اس کی کتنی خواہش تھی کہ فرحت سے اس کے تعلق اچھے رہیں۔ لیکن اس نے تو گویا اسے نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی۔ اف کس بے اعتنائی سے اٹھ کر چلی گئی حرام زادی — رشیدہ کی آپا جی کو ملنے کے لیے۔

اسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ وہ کس قدر بے بس تھا۔ آج کی شام بے کار جانے پر اس کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ منیجر بن جانے کی خوشی میں فرحت کو جیکب والوں کے ہاں کی جیلی اور کریم کھلاؤں اور وہ کس قدر خوش ہوگی۔ اور چٹوری بلی کی طرح انگلیاں تک چاٹنے سے باز نہ رہے گی...... لیکن کم بخت نے خود ہی کام بگاڑ دیا۔ آپس میں محبت اور اشتراک سے رہنے کا جس قدر شدید جذبہ اس کے اپنے دل میں تھا۔ اگر فرحت کے دل میں اس جذبے کی شدت اس کی نسبت دسواں حصہ بھی ہو تو بھی آپس میں تعلقات بہت مضبوط ہو سکتے ہیں...... لیکن وہ یوں سمجھنے والی نہیں! اگر کل کو وہ مر جائے تو کم بخت کو اس کی قدر معلوم ہو۔

اپنے مرنے کے خیال سے اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ وہ قصور میں فرحت کے خوب صورت چہرے پر پھیلے ہوئے بالوں اس کی سرخ ناک اور دل دوز چیخوں کے تصور سے اس کے دل کی ڈھارس بندھی...... اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... وہ میز پر ٹائم پیس کے قریب کھڑے ہوئے تانبے کے بارہ سنگھے کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھنے لگا......

فرحت رشیدہ کی آپا سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اپنے شوہر کی دلی کیفیت سے بے خبر کیسے مزے مزے سے گپ اڑانے میں مصروف تھی...... پھر دفعتا ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی چمک کی طرح کوند گیا...... وہ گھر سے چلا جائے گا۔ نامعلوم جگہ کو — پھر واپس نہیں آئے گا...... موت کی نسبت یہ خیال اچھا تھا۔ مرنا مشکل تھا اور یہ آسان بھی تھا اور نتائج تقریباً موت کے برابر ہی حاصل ہو سکتے تھے۔ اس نے سوچا کہ کل صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے...... بلکہ ساڑھے چار بجے والی گاڑی پر وہ سوار

ہو جائے گا۔ اور کبھی واپس نہیں آئے گا۔ صبح کے وقت جب وہ جاگے گی تو ادھر اُدھر بھاگی بھاگی پھرے گی نوکر سے پوچھے گی۔ تار دلوائے گی۔ پاگلوں کی مانند حرکتیں کرے گی۔ اس وقت وہ خود نہ معلوم کس جگہ پہنچا ہوگا۔

یہ خیال صحیح تھا۔ رشیدہ کی آپا بھی رات کے ساڑھے نو بجے تک بیٹھی رہی۔ بلکہ فرحت نے جان بوجھ کر بٹھائے رکھا ہوگا...... یہ سوچ کر اسے اور بھی غصہ آیا اس کے چلے جانے کے بعد فرحت نے کھانے کے لیے کہلوا بھیجا۔ اس نے انکار کر دیا۔ پھر معلوم ہوا کہ اس نے اکیلے ہی کھانا کھا لیا ہے۔ اس پر اسے غصہ تو بہت آیا۔ لیکن خیر کوئی ہرج نہیں۔ اب وہ اس سے سب باتوں کا انتقام لے گا۔ پھر نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ فرحت سونے کی تیاری کر رہی ہے اور اسے کہلوا بھیجا ہے۔ اس نے کہہ دیا کہ کام کر رہا ہوں۔

اب اس نے سوچا کہ جانے کی تیاری ابھی سے کر لینی چاہیے۔ اس نے نوکر بھیج کر اندر سے اپنا سوٹ کیس منگوایا...... نوکر سوٹ کیس لے آیا۔ تو اس نے پوچھا کہ بی بی نے کچھ کہا تو نہیں۔ نوکر بولا کچھ نہیں کہا۔

اُس نے سوٹ کیس تیار کر لیا۔ بستر باندھ دیا۔ اور نوکر کو ہدایت کر دی کہ صبح جلدی ہی اٹھنا ہوگا اور تانگہ لانا ہوگا۔

اس کے بعد اس نے تین بجے کا الارم لگا دیا۔

نوکر چلا گیا۔ سب طرف سکون ہو گیا۔ چھوٹے فریم میں اس کی بیوی کی تصویر رکھی تھی۔ وہ اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے الوداعی چٹھی لکھنے کی ٹھانی کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔

''جان سے پیاری فرحت......'' یہ ٹھیک نہیں صرف ''ڈیر فرحت'' کافی ہوگا۔ بلکہ محض فرحت لکھ دیا جائے تو اور اچھا ہوگا۔

پھر اس نے ایک دردناک سا مضمون بنایا۔ میں تم سے تنگ آ کر جا رہا ہوں اور

ہمیشہ کے لیے جارہا ہوں۔ مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ اب میں نہیں مل سکتا دیکھو شوہر کو خوش نہ رکھنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے...... وغیرہ۔

چٹھی لکھ کر اس نے میز پر اس انداز سے رکھ دی کہ اس پر فوراً نظر پڑ سکے۔ رات اسی طرح صوفے پر سوتے جاگتے کاٹی۔ گھڑی کا الارم بجتے ہی اس نے نوکر کو جگایا۔ خود منہ دھو کر کپڑے پہننے لگا۔ نوکر سے کہا کہ تانگہ لے آؤ اور سامان رکھ دو۔

پھر اُس نے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی...... چند لمحوں تک ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر سونے کے کمرے کے قریب سے گذرا تو اس نے دروازے کو یوں ہی تھوڑا سا دھکا دیا کہ دیکھیں دروازہ کھلا ہے یا نہیں۔ دروازہ کھلا تھا اس کے معنی ہیں کہ اس کی بیوی اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔

اس نے اندر کی طرف جھانکا۔ بڑی کھڑکی کے قریب اس کی بیوی سوئی پڑی تھی۔ اس نے سوچا کہ آخری بار بیوی کو دیکھ لیا جائے۔

اس کی بیوی بس بچہ ہی تھی سوتے میں رضائی اِدھر اُدھر کھسک جاتی لیکن اس کی نیند ایسی گہری تھی کہ اسے کچھ خبر تک نہ ہوتی۔ چناں چہ اب پھر رضائی کھسک گئی تھی۔

وہ قریب پہنچا تو کھڑکی کے شیشوں میں سے آنے والی چاندنی میں اس کی بیوی بہت حسین نظر آرہی تھی۔ شاعروں کے قول کے مطابق اس کے ہونٹ کھلے تھے۔ ان میں سے دانت موتیوں کی لڑی کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ بند آنکھیں جیسے دو سیپیوں سے ڈھکی ہوئی ہوں۔ گریبان کے بٹن بھی کھلے تھے۔ اور قمیض بھی ادھر اُدھر کھنچ گئی تھی اور......

اس نے رضائی کے دونوں کونے پکڑ کر اوپر کو کھینچے۔ ہر رات اُسے اس طرح کرنا پڑتا تھا...... ایسا نہ ہو بے چاری صبح سردی سے اکڑ جائے۔ رضائی اوپر کھینچ کر اس نے اس کے سرے فرحت کے پہلوؤں میں دبائے تاکہ جسم ہر طرف سے ڈھکا رہے...... پھر وہ جانے کے لیے مڑا...... میں جارہا ہوں پیاری فرحت میری جان سے عزیز...... اس

، سوچا کہ جانے سے پہلے اس کی پیشانی کا ہلکا سا بوسہ لے لے۔ اسے اس بات کی ۔تک نہ ہوگی......

...... اور وہ اوورکوٹ کو سمیٹ کر آہستہ سے نیچے کو جھکا...... فرحت کی نیند کی ماتی ۔نکھیں نیم وا ہوئیں۔ اس نے خاوند کو دیکھا تو ہونٹوں پر موہوم سا تبسم کھل اٹھا۔ شوہر ٹھٹکا۔ فرحت نے نیند ہی میں انگڑائی کے لیے بازو اٹھائے اور ملائمت سے لپٹ کر لطافت سے اپنی طرف کھینچا...... اور وہ باوجود انکار کے کھنچ گیا...... فرحت نے اسے جوتوں سمیت رضائی میں چھپا لیا۔

نوکر کی آواز آئی'' جی سامان تانگے میں رکھ دیا ہے......''

فرحت نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہہ دیا۔'' سامان اتار کر اوپر لے آؤ...... اور وہ کچھ نہیں بولا۔

یہ افسانہ افسانوی مجموعہ 'سنہرا دیس' میں شامل ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ و اساتذہ کے لئے خصوصی رعایت، تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا

کلّیات راجندر سنگھ بیدی (جلد اوّل)

مرتب : وارث علوی

صفحات : 1040

قیمت : -/525 روپئے

کلّیات راجندر سنگھ بیدی (جلد دوم)

مرتب : وارث علوی

صفحات : 655

قیمت : -/380 روپئے

بنات النعش

مصنف : ڈپٹی نذیر احمد

صفحات : 151

قیمت : -/78 روپئے

مراۃ العروس

مصنف : ڈپٹی نذیر احمد

صفحات : 138

قیمت : -/72 روپئے

ابن الوقت

مصنف : ڈپٹی نذیر احمد

صفحات : 225

قیمت : -/91 روپئے

توبۃ النصوح

مصنف : ڈپٹی نذیر احمد

صفحات : 175

قیمت : -/75 روپئے

ISBN: 978-81-7587-279-0

क़ौमी काउंसिल बराए फ़रोग़े–उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-1, R.K. Puram, New Delhi-110066